اُمراؤ جان ادا

مرزا رسوا

اُمراؤ جان ادا

مرزا رسوا

(سستا ایڈیشن)

مکتبہ شاہراہ اردو بازار دہلی

سستا ایڈیشن، مجلّد معہ گردپوش :-	تین روپے
اعلیٰ ایڈیشن، " " بہترین کتابت وطباعت، کاغذ سفید گلیزڈ۔ برائے لائبریریز :-	۴/۸/۰ چار روپے آٹھ آنے

تعداد :- ۵۰۰
فروری :- ۱۹۶۰ء
قیمت :- ۳/۰

(پیام وطن پریس دہلی)

ہم کو بھی کیا کیا مزے کی داستانیں یاد تھیں
لیکن، اب تمہید ذکر درد ماتم ہو گئیں

ناظرین! شانِ نزول اس قصّہ کی یہ ہے کہ دس بارہ برس کا ذکر ہے کہ میرے ایک دوست منشی احمد حسین صاحب اطراف دہلی کے رہنے والے بطریق سیر و سیاحت لکھنؤ تشریف لائے تھے۔ انھوں نے چوک میں سید حسین کے پھاٹک کے پاس ایک کمرہ کرایہ کو لیا تھا۔ یہاں اکثر احباب سرِشام آ بیٹھتے تھے۔ بہت ہی لطف کی صحبت ہوتی تھی۔ منشی صاحب کا مذاق شعر فہمی اعلیٰ درجہ کا تھا خود بھی کبھی کبھی کچھ کہہ لیتے تھے اور اچھا کہتے تھے لیکن زیادہ تر ان کو سننے کا شوق تھا اس لئے اکثر شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا۔ اسی کمرے کے برابر ایک اور کمرہ تھا۔ اس میں ایک طوائف رہتی تھی۔ بود و باش کا طریقہ اور رنڈیوں سے بالکل علیحدہ تھا۔ نہ کبھی کسی نے کمرے پر سرِ راہ بیٹھتے دیکھا، نہ وہاں کسی کی آمد و رفت تھی۔ دروازوں میں دن رات پردے پڑے رہتے تھے۔ چوک کی طرف نکاس کا راستہ بالکل بند رہتا تھا۔ گلی کی جانب ایک اور دروازہ تھا اسی سے نوکر چاکر آتے جاتے تھے۔ اگر کبھی کبھی رات کو گانے کی آواز نہ آیا کرتی تو یہ بھی نہ معلوم ہوتا کہ اس کمرے میں کوئی رہتا بھی ہے یا نہیں جس کمرے میں ہم لوگوں کی نشست تھی اس میں ایک چھوٹی سی کھڑکی لگی تھی۔ مگر اس میں کپڑا پڑا ہوا تھا۔

ایک دن حسبِ معمول احباب کا جلسہ تھا۔ کوئی غزل پڑھ رہا تھا۔ احباب داد دے رہے تھے، اتنے میں میں نے ایک شعر پڑھا۔ اس کھڑکی کی طرف سے واہ واہ کی آواز آئی۔ میں چپ ہو گیا اور احباب بھی اسی طرف متوجہ ہو گئے۔ منشی احمد حسین نے پکار کے کہا غائبانہ تعریف ٹھیک نہیں۔ اگر شوقِ شعر و سخن ہے تو جلسہ میں تشریف لائیے۔ اس کا کوئی جواب نہ ملا۔ میں پھر غزل پڑھنے لگا۔ بات رفت گزشت ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک مہری آئی اس نے پہلے سب کو سلام کیا پھر یہ کہا "مرزا رسوا کون صاحب ہیں؟" احباب نے مجھے بتا دیا۔ مہری نے کہا "بیوی نے ذرا آپ کو بلایا ہے۔" میں نے کہا "کون بیوی؟" مہری نے کہا۔

"بیوی نے کہہ دیا ہے نام نہ بتانا۔ آگے آپ کا جو حکم ہو۔" مجھے مہری کے ساتھ جانے میں تامل ہوا۔ احباب مجھ سے مذاق کرنے لگے "ہاں صاحب کیوں نہیں کبھی کی صاحب سلامت ہے جب تو اس طرح بلا بھیجا۔" میں دل میں غور کر رہا تھا کہ کون صاحب ایسے بے تکلف ہیں۔ اتنے میں ادھر مہری نے کہا کہ "حضور! بیوی آپ کو اچھی طرح جانتی ہیں جب تو بلا بھیجا ہے۔" آخر جانا ہی پڑا۔ جا کے جو دیکھا معلوم ہوا۔ آہا! امراؤ جان تشریف رکھتی ہیں۔

امراؤ جان (دیکھتے ہی) اللہ! مرزا صاحب آپ تو ہمیں بھول ہی گئے۔

میں۔ یہ معلوم کسے تھا کہ آپ اس کوہ قاف میں تشریف رکھتی ہیں۔

امراؤ جان۔ یوں تو میں اکثر آپ کی آواز سنا کرتی تھی مگر کبھی بلانے کی جرأت نہ ہوئی مگر آج آپ کی غزل نے بے چین کر دیا۔ بے ساختہ منہ سے واہ نکل گیا۔ ادھر کسی صاحب نے کہا یہاں آئیے۔" میں اپنی جگہ پر آپ ہی شرمندہ ہوئی۔ جی میں آیا چپ رہوں مگر دل نہ مانا۔ آخر اگلی خصوصیتوں کے لحاظ سے آپ کو تکلیف دی معاف کیجئے گا۔ ہاں وہ شعر ذرا پھر پڑھ دیجئے۔"

میں "معاف تو کچھ بھی نہ ہوگا اور نہ میں شعر سناؤں گا۔ اگر آپ کو شوق ہے تو وہیں تشریف لے چلئے۔"

امراؤ جان "مجھے چلنے میں کوئی عذر نہیں۔ مگر خیال ہے کہ صاحب خانہ یا اور کسی صاحب کو میرا جانا ناگوار نہ ہو۔"

میں "آپ کے حواس درست ہیں؟ بھلا ایسی جگہ میں آپ کو چلنے کے لئے کیوں کہتا بے تکلف صحبت ہے۔ آپ کے جانے سے اور لطف ہوگا۔"

امراؤ جان "یہ تو سچ ہے مگر کہیں زیادہ بے تکلفی نہ ہو۔"

میں: "مرضی نہیں۔ وہاں میرے سوا کوئی آپ سے بے تکلف نہیں ہو سکتا۔"

امراؤ جان: "اچھا تو کل آؤں گی۔"

میں: "ابھی کیوں نہیں چلتیں؟"

امراؤ: "اے ہے دیکھئے تو کس حیثیت سے بیٹھی ہوں۔"

میں: "وہاں کوئی مجرا تو ہے نہیں، بے تکلف صحبت ہے چلی چلئے۔"

امراؤ: "اور مرزا۔ آپ کی تو باتیں لاجواب ہوتی ہیں۔ اچھا چلئے میں آتی ہوں۔"

میں اٹھ کے چلا آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد امراؤ جان صاحبہ ذرا کنگھی چوٹی کر کے کپڑے بدل کے آئیں۔

میں نے احباب سے چند الفاظ میں ان کے مذاق شعر و سخن اور کمال موسیقی وغیرہ کی تعریف کر دی تھی۔ لوگ مشتاق ہو گئے تھے۔ جب وہ تشریف لائیں تو یہ ٹھہری کہ سب صاحب اپنا اپنا کلام پڑھیں اور وہ بھی پڑھیں۔ خلاصہ یہ کہ بڑے لطف کا جلسہ ہوا۔ اس دن سے امراؤ جان اکثر شام کو چلی آتی تھیں۔ گھنٹہ دو گھنٹہ تک نشست رہتی تھی۔ کبھی شعر و شاعری کا جلسہ ہوا، کبھی انہوں نے کچھ گایا۔ احباب محظوظ ہوئے۔ ایسے ہی ایک جلسے کی کیفیت ہم یہاں لکھے دیتے ہیں۔ ان مشاعروں میں نہ کوئی طرح مقرر کی جاتی تھی اور نہ بہت سے لوگوں سے وعدے لئے جاتے تھے، صرف بے تکلف احباب جمع ہو جاتے تھے اور اپنی اپنی تازہ تصنیف غزلیں پڑھتے تھے۔

مشاعرہ

کس کو سنائیں حال دل زار اے ادا
آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی

مرزا رسوا: "کیا کہنا! امراؤ جان صاحبہ! یہ مقطع تو آپ نے حسب حال کہا ہے اور شعر کیوں نہ ہوں؟"

امراؤ جان: "تسلیم مرزا صاحب! آپ کے سر کی قسم۔ بس وہ مطلع یاد تھا اور یہ مقطع خدا جانے کس زمانے کی غزل کا ہے۔ زبانی کہاں تک یاد رہے۔ بیاض نگوڑی گم ہو گئی۔"

منشی صاحب: "اور وہ مطلع کیا تھا ہم نے نہیں سنا۔"

رسوا۔ آپ تو اہتمام میں مصروف ہیں۔ سُنے کون۔

اس میں شک نہیں کہ منشی صاحب نے آج کے جلسے کے لئے بڑے سلیقہ سے انتظام کیا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ مہتابی پر دو گھڑی دن رہے چھڑکاؤ ہوا تھا تاکہ شام تک زمین سرد رہے۔ اُسی پر دری بچھا کے اُجلی چاندنی کا فرش کردیا تھا۔ کوری کوری صراحیاں پانی بھر کے کیوڑا ڈال کے منڈیر پر چنوا دی گئی تھیں۔ ان پر بالو کے آبخورے ڈھکے ہوئے تھے۔ برف کا انتظام علیحدہ کیا گیا تھا۔ کاغذی ہنڈیوں میں سفید پانوں کی سات سات گلوریاں سرخ صافی میں لپیٹ کر کیوڑے میں بسا کر رکھ دی گئی تھیں۔ ڈھکنیوں پر تھوڑا تھوڑا کھانے کا خوشبودار تمباکو رکھ دیا تھا۔ ڈیڑھ حقوں کے نیچوں میں پانی چھڑک چھڑک کر ہار لپیٹ دیے تھے۔ چاندنی رات تھی۔ اس سے روشنی کا انتظام زیادہ نہیں کرنا پڑا۔ صرف ایک سفید کنول دور سے کے لئے روشن کردیا گیا تھا۔ آٹھ بجتے بجتے سب احباب میر صاحب، آغا صاحب، خان صاحب، شیخ صاحب، پنڈت صاحب وغیرہ وغیرہ تشریف لائے۔ پہلے شعر دالودہ کے ایک ایک پیالے کا دور چلا پھر شعر و سخن کا چرچا ہونے لگا۔

منشی صاحب ”تو پھر اہتمام آپ کیجئے بندہ شعر سنے گا“

رسوا۔ معاف فرمایئے۔ یہ دردِ سر مجھ سے نہ ہوگا“

منشی صاحب ”اچھا وہ مطلع کیا تھا؟“

امراؤ ”میں عرض کئے دیتی ہوں“

کعبے میں جا کے بھول گیا راہ دیر کی ایمان بچ گیا مرے مولا نے خیر کی

منشی صاحب ”خوب کہا ہے“

خان صاحب ”اچھا مطلع کہا ہے مگر یہ ”بھول گیا“ کیوں؟“

امراؤجان ”تو کیا خان صاحب میں ریختی کہتی ہوں“

خان صاحب ”مزا تو ریختی کا ہے“ مرے مولا نے خیر کی“ آپ ہی کی زبان سے اچھا معلوم ہوتا ہے“

رسوا۔ بس آپ کے حملے شروع ہو گئے۔ نئے اشعر سننے دیجئے۔ خان صاحب! اگر سب آپ ہی کے سے محقق ہو جائیں تو شعر گوئی کا مزا تشریف لے جائے۔

ع ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

خان صاحب۔ (کسی قدر برے تیوروں سے) درست“

امراؤ جان ادا

رسوا: امراؤ جان! اچھا تو کوئی اور غزل پڑھو۔"

امراؤ: "دیکھیے کچھ یاد آ گئے تو عرض کروں۔ تھوڑی دیر کے بعد۔

شبِ فرقت بسر نہیں ہوتی"

حضارِ جلسہ: "واہ وا! سبحان اللہ! کیا کہنا!"

امراؤ جان: (تسلیمیں کر کے) یہ شعر ملاحظہ ہو۔

شورِ فریاد تا فلک پہنچا / مگر اس کو خبر نہیں ہوتی

رسوا: "کیا شعر کہا ہے" (حضار نے بھی تعریف کی)

امراؤ: "آپ کی عنایت۔ تسلیم تسلیم"

ترے کوچے کے جے نوازوں کو / ہوس مال و زر نہیں ہوتی

(احباب) تعریف۔ امراؤ: تسلیم۔

جان دنیا کسی پہ لازم تھا / زندگی یوں بسر نہیں ہوتی

رسوا: "واہ خان صاحب! یہ شعر ملاحظہ ہو"

خان صاحب: "سبحان اللہ! حقیقت میں کیا شعر کہا ہے"

امراؤ: آپ سب صاحب قدر افزائی فرماتے ہیں ورنہ میں کیا میری حقیقت کیا

سچ یقین وہ نہ آئیں گے پھر بھی / کب نگہ سوئے در نہیں ہوتی

خان صاحب: "یہ بھی خوب کہا"

پنڈت صاحب: "کیا طرزِ کلام ہے۔"

امراؤ: (تسلیم کر کے)

اب کسی امید پر نظر میری / شکوہ تک اثر نہیں ہوتی

خان صاحب: "کیا اچھا کہا ہے۔ ذرا ریت ٹھیک رہی ہے"

منشی صاحب: "جو کچھ ہو۔ مضمون اچھا ہے۔ امراؤ: تسلیم"

ہم اسیرانِ عشق کو صیاد / ہوس بال و پر نہیں ہوتی

احباب۔ تعریف۔

امراؤ: "تسلیم"

غلط انداز ہی سہی وہ نظر / کیوں مرے حال پر نہیں ہوتی

خان صاحب۔ ہاں ہونا چاہیے۔ خوب کہا ہے۔

امراؤ:۔ تسلیم، مقطع ملاحظہ ہو۔"

اے ادا ہم کبھی نہ مانیں گے　　　دل کی دل کو خبر نہیں ہوتی

خاں صاحب:"کیا مقطع کہا ہے۔ یہ آپ اپنا تجربہ بیان کرتی ہیں اور لوگوں کی رائے اس کے خلاف ہے۔"

امراؤ:"ذاتی تجربہ جو کچھ ہو میں نے تو ایک شاعرانہ مضمون کہا ہے۔"

رسوا:" اچھا ذرا پھر تو پڑھئے۔

امراؤ جان نے پھر پڑھا۔

رسوا۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون کے دونوں پہلو اس شعر سے نکل سکتے ہیں۔"

خاں صاحب:" واقعی مرزا صاحب کیا بات کہی۔"

احباب:" غزل از مطلع تا مقطع ایک رنگ میں ہے۔"

آغا صاحب:" نشست الفاظ تو ملاحظہ ہو۔"

پنڈت صاحب۔ کیا دُر فشانی کی ہے۔"

امراؤ جان (کھڑی ہو کے) " تسلیم۔"

منشی صاحب۔ اب آپ کچھ ارشاد کیجئے۔

خاں صاحب:" حضرت مجھے تو معاف کیجئے۔ کچھ یاد ہی نہیں آتا۔"

رسوا:" کچھ تو پڑھئے۔"

خاں صاحب نے ایک مطلع اور دو شعر پڑھے۔

خاں صاحب۔ جینت جنت　　　نہیں ملتی

ماہ میں ایک شب نہیں ملتی

رسوا:" کیا اچھا کنایہ ہے۔ یعنی شب چاردہم۔"

خاں صاحب:" تسلیم۔"

یوں تو ملتی ہے دادِ صنعتِ شعر　　　دادِ حسنِ طلب نہیں ملتی

رسوا:" کیا اچھا کنایہ ہے۔"

خاں صاحب:" تسلیم۔"

شوخیوں سے کسی کی میری مراد　　　پہلے ملتی تھی اب نہیں ملتی

رسوا: "لاجواب شعر ہے۔"

خاں صاحب: "تسلیم۔"

اس کے بعد ایک صاحب تشریف لائے۔ آدمی کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔

خاں صاحب۔ "یہ کون صاحب آتے ہیں۔ شب ماہ میں لالٹین کی کیا ضرورت ہے۔"

نواب صاحب: "حضرت، حماقت تو ہوئی معاف کیجیے گا۔"

خاں صاحب۔ "اخاہ نواب صاحب! بحضور مضائقہ ندارد۔"

نواب صاحب تشریف لائے۔ سب نے تعظیم کی۔ غزل پڑھنے کی فرمائش ہوئی۔

نواب صاحب: "میں تو آپ صاحبوں کا مشتاق ہو کے آیا ہوں۔ مجھے تو کچھ یاد نہیں۔"

شیخ صاحب: "جناب غزل پڑھنا ہوگی۔"

نواب صاحب: "اچھا جو کچھ یاد آتا ہے عرض کیے دیتا ہوں۔"

دل میں کھپ جائے گی قاتل کی ادا ایک نہ ایک
کارگر ہوگا کبھی تیر قضا ایک نہ ایک

احباب۔ "واہ کیا شعر کہا ہے۔"

نواب صاحب۔ "تسلیم۔" (اس کے بعد چپ ہو رہے)

رسوا: "اور کچھ ارشاد ہو۔"

نواب صاحب: "واللہ اب کچھ یاد ہی نہیں آتا۔"

منشی صاحب: "اب آپ داد فصاحت دیجیے۔"

پنڈت جی: "امتثالاً للامر دو تین شعر عرض کیے دیتا ہوں۔" ؎

وصل میں ذکر عدو بھی دمبدم ہوتا رہا
شربت دیدار میرے حق میں سم ہوتا رہا

احباب۔ تعریف۔

پنڈت صاحب۔ زاہد وہ دن سے چرچا حق پرستی کا ہوا
ورنہ کعبہ میں سدا ذکر صنم ہوتا رہا

نواب صاحب۔ ہم نہیں کہہ سکتے مگر خوب کہا۔

پنڈت صاحب۔ کہیے یا نہ کہیے مگر بات یہی ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو۔

سامنا کیوں سر جھکائے وہ کسی کے رہرو
جس کا سر نقش قدم پر اسکے خم ہوتا رہا

احباب۔ تعریف۔

پنڈت صاحب۔ زلف کی تعریف میں دفتر کے دفتر

سو بہ حال پریشانی رقم ہوتا رہا

رسوا۔ "یہ خاص لکھنؤ کا مذاق ہے"

پنڈت جی۔ "اجی آپ دہلی کے کب ہیں؟"

رسوا۔ اچھا شعر پڑھیئے۔ میں نے تو ایک بات کہی۔

پنڈت جی۔ دل جو تھا پہلے گل نورستہ باغ مراد

خانہ خانہ حسرت و رنج و الم ہوتا رہا

نواب صاحب۔ "دیکھئے کیا شعر کہا ہے"

خاں صاحب۔ "متانت الفاظ ملاحظہ ہو"

پنڈت جی۔ "مقطع ملاحظہ ہو"

ہر نفس تجھ پر جو خان کا کرم ہوتا رہا — شکریہ تحریر اس کا کب ادا مجھ سے ہوا

خاں صاحب۔ سبحان اللہ ہر نفسے کہ فرو میرود ممد حیات است و چوں بر می آید مفرح ذات

رسوا۔ خاں صاحب آپ کے مارے تو شعر ہی پڑھنا مشکل ہے"

احباب۔ "سبحان اللہ کیا غزل فرمائی ہے"

پنڈت جی۔ "آپ کی عنایت، پرورش بندہ نوازی۔ واللہ یہ آپ ہی لوگوں کا صدقہ ہے"

منشی صاحب۔ شیخ صاحب آپ تو کچھ ارشاد کیجئے۔

شیخ صاحب۔ (مسکرا کر) جی "مجھے تو کچھ یاد نہیں"

خاں صاحب۔ یاد نہیں مگر شتر غمزہ کی غزل جیب میں ہوگی"

شیخ صاحب۔ "واللہ نہیں۔ صرف چار شعر ابھی موزوں کر لئے ہیں"

رسوا۔ "تو پھر پڑھتے کیوں نہیں"

شیخ صاحب۔ "عرض کئے دیتا ہوں"

بات وہ بات کہ جس بات سے انکار نہ ہو — عرض وہ عرض ہے جس میں کوئی اصرار نہ ہو

احباب۔ تعریف۔

شیخ صاحب۔ "تسلیم۔"

مثلِ یوسف سرِ بازار پڑے پھرتے ہو   کیا ہی شرماؤ اگر کوئی خریدار نہ ہو

رسوا: "کیا اچھا مذاق ہے۔"

شیخ صاحب۔ تسلیم

دل وہ اچھا جو حسینوں کی نظر میں نہ جچے   جنس وہ خوب کوئی جس کا خریدار نہ ہو

خاں صاحب: "بہت خوب۔"

شیخ صاحب: "تسلیم۔"

قتلِ عشاق کی بیکار قسم کھاتے ہو   ہم نہ مانیں گے اگر ہاتھ میں تلوار نہ ہو

اتنے میں ایک آدمی آیا اور اس نے ایک پرچہ منشی احمد حسین کو دیا۔

منشی صاحب۔ (رقعہ پڑھ کے) لیجیے مرزا صاحب تشریف نہیں لائیں گے غزل تازہ بھیج دی ہے۔"

میں نے آدمی سے پوچھا "کیا کر رہے ہیں؟"

آدمی۔ (مسکرا کے) جی حضور سکندر باغ سے سرِ شام بہت سے انگریزی درختوں کے تاندے لے کے آئے ہیں۔ ان کو گول حوض کے کنارے پتھروں کے اندر رکھ رہے ہیں۔ مالی پانی دیتا جاتا ہے۔"

رسوا: "جی ہاں انھیں اپنے اعمال سے فرصت کہاں جو مشاعرے میں تشریف لائیں۔"

منشی صاحب: "اچھا تو غزل پڑھ دیجیے۔ واللہ کیا صحبت کو بے لطف کیا۔ نہ آئے نہ۔ اچھا غزل ہی پڑھ دیجیے۔"

رسوا۔ مجھ سے تو کچھ نہ پڑھوائیے گا؟"

منشی صاحب: "ہاں خوب یاد آیا۔ اچھا تو پہلے آپ پڑھ لیجیے۔"

رسوا۔ نہ پوچھو ہم سے کیوں کر زندگی کے دن گزرتے ہیں

کسی بیدرد کی فرقت میں جینے میں نہ مرتے ہیں

کوئی ان سے کہے دل لے کے بھی یوں ہی مکر جانا

عدو کے سامنے جو گالیاں دے کر مکرتے ہیں

ابھی تو ہنس رہے ہیں مدعی ذوقِ جراحت پر

نہ پوچھو اس مزے کو جب نمک زخموں پہ بھرتے ہیں

تماشہ ہو جو اُن کا بوسہ لے کر ہم مکر جائیں
بہت جو چاہنے والوں کا دل لے کر مکرتے ہیں

انھیں کا نام لے لے کر کوئی فرقت میں مرتا ہے
کبھی تو وہ بھی سُن لیں گے جو بدنامی سے ڈرتے ہیں

بگاڑا ہم کو قسمت نے تو پھر بننا نہیں ممکن
وہ گیسو ہیں کسی کے جو بگڑ کے پھر سنورتے ہیں

کبھی شانے سے اُلجھے وہ کبھی آئینے کو توڑا
سنورنے میں بگڑتے ہیں بگڑنے میں سنورتے ہیں

ہمیں زندہ نہ چھوڑیں گی ادائیں ان کے جوبن کی
وہ بڑے ادھر کر آڑا جو چلنے میں ابھرتے ہیں

ادا سے ناز کو رسوا ہے دعویٰ پارسائی کا
کوئی پوچھے تو آخر مرنے والے کس پہ مرتے ہیں

احباب نے ہر شعر کی داد دی۔ رسوا نے سر تسلیم خم کیا۔ اس کے بعد مرزا صاحب نے غزل پڑھنا شروع کی۔

کل رات کو انھیں جو کہیں دیر ہو گئی — دنیا ہماری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی
مرنے کے دن قریب ہیں شاید کہ اے حیات — تجھ سے طبیعت اپنی بہت سیر ہو گئی
بیہودہ خواہشوں نے نہ جینے دیا ہمیں — ان موذیوں سے عقل اگر زیر ہو گئی
اے موت تجھ کو کیا ہوا تو ہی بلا سے آ — اُن کو تو آتے آتے بڑی دیر ہو گئی
میری تباہیوں کی تمھیں اب خبر ہوئی — کیا پوچھتے ہو عمر یوں ہی تیر ہو گئی
آج ہم سے اس نے آنے کا وعدہ کیا تو کیا — دم ہی نکل گیا جو کہیں دیر ہو گئی
ٹلنا تھا میرے پاس سے اے کاہلی تجھے — کمبخت تو تو آ کے یہیں ڈھیر ہو گئی
دبکی ہوئی تھی گربہ صفت خواہش گناہ — چمکارنے سے پھول گئی شیر ہو گئی

مرزا مشاعرے میں نہ تشریف لائیں گے
تا چند انتظار ہے بڑی دیر ہو گئی

اس کے بعد منظر الحق نامی ایک شاعر کہیں باہر کے رہنے والے جو اُس وقت اتفاق سے وارد مشاعرہ تھے۔ اُنھوں نے یہ نظم پڑھی۔

ہے ہمارے شاعروں کا یہ حال — جس کی اب نقل کرتے ہیں نقال
روش اہل فن پہ ہنستے ہیں — رنگ بزم سخن پہ ہنستے ہیں
کیا زمانے میں غدر ہے توبہ — شاعری کی یہ قدر ہے توبہ
گو کہ پاس ادب نہیں کرتے — ہجو کچھ بے سبب نہیں کرتے
چلتے ہیں شاعران خوش تقریر — اپنے ہمراہ لے کے جم غفیر
کب سخنور اکیلے جاتے ہیں — قدر دانوں کو لے کے آتے ہیں
جاتے ہیں معرکوں میں فوج سمیت — ساتھ ہوتے ہیں بے شمار بھیڑیت
جن کے ہمراہ یہ ہجوم نہ ہو — کبھی ان کی غزل کی دھوم نہ ہو
اک اُدھر واہ واہ کرتا ہے — اک اِدھر آہ آہ کرتا ہے
واہ کیا طرز درفشانی ہے — واہ کیا وضع خوش بیانی ہے
کوئی کہتا ہے واہ کیا کہنا — فی الحقیقت ہے یہ نیا کہنا
اس سے بہتر کہے گا کیا کوئی — کب ہے اُستاد آپ سا کوئی
اس زمانے میں آپ یکتا ہیں — واقعی فخر میر و مرزا ہیں
کب میسر تھا ان کو حسن کلام — کچھ نہ تھے وہ فقط ہے نام ہی نام
اُن کے دیواں میں کب یہ نشتر ہیں — بخدا آپ اُن سے بہتر ہیں
اُن سے واللہ آپ اچھے ہیں — تم باللہ آپ اچھے ہیں
کہیں بڑھ کر ہے آپ کا انداز — نکتہ سنجی ہے یا کہ ہے اعجاز
آپ قدرت نمائے معنی ہیں — فی الحقیقت خدائے معنی ہیں
آپ کے آگے کون منہ کھولے — کس کا مقدور ہے جو کچھ بولے
ہے یہ انداز آپ کا حصہ — ہے یہ اعجاز آپ کا حصہ
دل میں ہم خوب کر چکے ہیں غور — آپ ہی آپ ہیں نہیں کچھ اور
آپ ایسے ہیں آپ ویسے ہیں — ہم سمجھتے ہیں آپ جیسے ہیں
آپ کیا قدر اپنی پہچانیں — بس چھپے ہم سے آپ کیا جانیں
آپ کا کام ہے ہوا بندی — آپ پر ختم ہے ادا بندی
ایسے شاعر ہوئے ہیں کب پیدا — نہ ہوئے تھے نہ ہوں گے اب پیدا
الغرض بے تکی اڑاتے ہیں — بچھے جاتے ہیں لوٹے جاتے ہیں

ان کی تعریف ہے وہ لطائف
جس سے دکھتا ہے دھمر دنگا دل

منہ سے وہ شعر اُدھر نکالتے ہیں
یہ ادھر ٹوپیاں اُچھالتے ہیں

جن کی تعریف کا یہ تھا مذکور
اپنے دل میں بہت ہی ہیں مسرور

اگر اس میں کسی کو غصہ آئے
کچھ تعجب نہیں کہ لٹھ چل جائے

نہیں یہ بات کچھ تعجب کی
بلکہ اکثر ہوا ہے ایسا بھی

پڑھتے ہیں لفظ لفظ رک رک کے
ہو رہے ہیں سلام جھک جھک کے

گو بظاہر ہے انکسار بہت
دل میں ہے جوش افتخار بہت

کس قدر تنتے ہیں بھرتے ہیں
خود بھی تعریف اپنی کرتے ہیں

ہوتی ہے لفظ لفظ کی تشریح
ہوتی ہے بات بات کی تصحیح

کیوں نہ ہوں اپنی مدح کے شائق
جانتے ہیں کہ ہم ہیں اس لائق

کس قدر دور ہیں معاذ اللہ
کیسے مغرور ہیں معاذ اللہ

نکتہ فہم ایسے نکتہ داں ایسے
شاعر ایسے ہیں قدرداں ایسے

جھوٹی تعریف کی حقیقت کیا
جب حقیقت نہ ہو تو لذت کیا

اس میں کیا حظ ہے یہ مزا کیا ہے
کوئی پوچھے انہیں ہوا کیا ہے

گو کہ میری مذمتیں ہوں گی
میں سمجھتا ہوں جو گتیں ہوں گی

صاف گوئی کی داد پاؤں گا
میں بھی اپنی مراد پاؤں گا

کیا غرض ہے جو میں کسی سے ڈروں
بات سچی ہے کیوں نہ کہہ گزروں

مجھ کو بھاتی نہیں لگی لپٹی
بلکہ آتی نہیں لگی لپٹی

طرز اہل سخن سے ناخوش ہوں
روش اہل فن سے ناخوش ہوں

شاعری ہے اگر اسی کا نام
دور رہتے ایسی شاعری کو سلام

اس نظم کی انصاف پسند احباب نے بڑی تعریف کی۔

رسوا۔ ہر شعر پر اہل محفل تعریفیں کرتے جاتے تھے۔ منشی صاحب پر وجد کا عالم طاری تھا۔ امراؤ جان جھوم رہی تھیں اور میرا جو حال تھا وہ میرے دل سے کوئی پوچھے۔

منشی صاحب: ”ہاں جناب آغا صاحب اب آپ کچھ فرمایئے۔“

آغا صاحب: "بہت خوب۔ مطلع اوّل ملاحظہ ہو۔"

کہیں ساماں ایسے ہوں تو کچھ دل کو دے کل ہو
مژہ آبلے ہوئے ہوں اور اک شعلے کی برتلا ہو

احباب۔ آغا صاحب کیا مطلع فرمایا ہے۔
آغا صاحب۔" اے حضرت ابھی آپ نے سنا ہی کیا ہے۔ دوسرا مطلع سنئے۔"

وہ مضموں ڈھونڈھ کر باندھوں کہ جو مشکل سے مشکل ہو
کہوں وہ مطلع ثانی کہ جو اوّل سے اوّل ہو

احباب۔ بے شک اوّل سے اوّل ہے۔
آغا صاحب: "اب شعر ملاحظہ ہوں!"
اس شعر کا رخ نواب صاحب کی طرف تھا جو جالی کا کرتہ ہلکا بادامی رنگا اور باریک ململ کا انگرکھا پہنے بند کھولے ہوئے بیٹھے تھے اور ایک نہایت نفیس پنکھیا ہاتھ میں تھی اُسے جھلتے جاتے تھے۔

اگر جاڑے میں تو مل جائے تو کیا غم ہے جاڑے کا
تری زلفیں ہوں شانے پر دوشالہ ہو نہ مکمل ہو

احباب: "تعریف"
آغا صاحب۔ کہو بیچارگی میں بھی طبیعت خوش رکھے مجنوں
کہ جس نے ناقۂ لیلیٰ ہری جب دل کی کونپل ہو
پنڈت جی۔ سبحان اللہ! اور تو اور۔ یہ بیچارگی سے کیا چارہ نکالا ہے۔
احباب۔ واللہ سمجھے بھی خوب۔ سمجھ ہو تو ایسی ہو نہیں تو نہ ہو۔
آغا صاحب۔ نہ ہو۔ اچھا اب یہ شعر سنیئے۔

کہو عشاق سے اپنے کہ ضبطِ گریہ فرمائیں
رکے گا راستہ گھر کا، اگر کوچے میں دلدل ہو

شیخ صاحب: "اچھی کہی۔"
رسوا۔ (خاں صاحب سے) "آپ کیوں سکوت میں ہیں، کوئی اعتراض نکالیے۔"
آغا صاحب: "ہاں جناب سکوت قدر شناس ٹھیک نہیں ہے۔"

خاں صاحب: "آپ میری تعریف کو تحسین ناشناس نہ سمجھئے اس لئے چپ ہوں"

آغا صاحب: "نہیں حضرت میری ایسی اُلٹی سمجھ نہیں ہے۔"

احباب اس فقرہ پر لوٹ گئے۔

آغا صاحب۔ شعر سنیے۔

ہمیں رشک آئے اپنے سے ہمیں سے غیر پیدا ہو
ہم ایسے دو نظر آئیں اگر معشوق احول ہو

احباب: "آغا صاحب سبحان اللہ کیا نازک خیالی کی ہے۔"

آغا صاحب۔ ابھی کمسن ہیں انکو شوق ہے لنگر لڑانے کا
تکلا ڈور کا ہو۔ اک نہ کنکیا نہ کل ہو

اس شعر کا رخ بھی نواب صاحب کی طرف تھا اس لئے کہ آپ ہی کی سرکار عالی جاہ سے کنکوے کی برات بڑی دھوم سے نکلی تھی۔

آغا صاحب۔ کوئی ان سے کہے جو شعر معنی بند کہتے ہیں
کھلے کیا راز سربستہ جو دروازہ مقفل ہو

رسوا: "آغا صاحب کیا کہنا۔ امراؤ جان! ذرا سنا کیا شعر کہا ہے۔

امراؤ جان۔ سبحان اللہ۔ میں پہلے ہی سمجھ گئی۔ جو چاہیں کہیں مالک ہیں۔

آغا صاحب۔ تو صاف کیوں نہیں کہتیں کہ دوزخ کا دربان ہوں۔ اچھا سنیے۔

کسی صورت سے بہلائیں گے اس معشوق کمسن کو
ڈبل پیسہ نہ ہو دو پوڑی نہ ہو تو گول گپّل ہو

احباب: "کیا کہنا"

آغا صاحب۔ کبھی گالی سنا بیٹھے کبھی جوتا لگا بیٹھے
حکومت کا مزا آئے اگر معشوق ارزل ہو

خاں صاحب: "درست مگر آپ کی شرافت سے بعید ہے"۔

آغا صاحب: "جناب شریف کون ہے اس زمانے میں"۔

خدا کے فضل سے اترا تھا کیا ہی عرش سے جوڑا
نہ مجھ سا کوئی گرگا ہو نہ تم سی کوئی کُتفل ہو

نواب صاحب: "خوب، مگر روئے سخن کس کی طرف ہے؟"

آغا صاحب: "یہ تو آپ ہی خوب سمجھ سکتے ہیں اس لئے کہ آپ محرم راز ہیں۔

اِلْتِسُوْعِیدہ کُوْاِمْ الْنَّاس مَسْتُوْ حَمْ ط

خاں صاحب: "آپ جواب دیجئے"

آغا صاحب: "آپ کیا جواب دیں گے، یہ شعر سنیے"

ہم اس نازک ادا کی شوخیوں پر جان دیتے ہیں۔
شتر کے فرمہ جیسے ہرن فرس کی جسمیں تجلیل ہو

احباب: "واہ ری ہمت"

آغا صاحب: "اچھا نہ سہی۔ یہ سنیے"

میں دل کو چیر ڈالوں گا جو تم پہلو سے اٹھ جاؤ
میں آنکھیں پھوڑ ڈالوں گا جو تم آنکھوں سے اوجھل ہو

احباب۔ خوب"

آغا صاحب۔ تمہاری سادگی میں کچھ عجب عالم نکلتا ہے۔

نہ چوٹی ہو نہ کنگھی ہو نہ مستی ہو نہ کاجل ہو

امراؤ جان: "اوئی۔ تو کیا دن رات سر جھاڑ منہ پھاڑ بیٹھا رہے"

آغا صاحب: "سادگی کا یہی مزا ہے اور دوسرے مصرع کی بھی کفایت ہے اس مذاق میں لطف یہ ہے کہ امراؤ جان کسی قدر حسین شہر رکھتیں"

ٹکا ہم سے وہ جب مانگیں انہیں چپکے سے ہم دیدیں
نہ بک بک ہو نہ جھک جھک ہو نہ کچ پچ ہو نہ کل بل ہو

احباب۔ کیا مصرع کہا ہے۔

خانصاحب: "اوپر کا مصرع بھی خوب لگایا۔ وہی ارذل کی رعایت چلی آتی ہے"

امراؤ جان۔ ہنستے ہنستے لوٹی جاتی تھیں۔

آغا صاحب۔ اچھا تو اب ایسے شعر نہ پڑھیں ہمارا معشوق ذلیل ہوا جاتا ہے نازک خیالی سنیے۔

تری نازک کمر کے باب میں چابک بنا دیں گے
وہ کیا سمجھے یہ باریکی طبیعت جس کی شتل ہو

خاں صاحب۔ میں تسلیم کئے لیتا ہوں کہ میری طبیعت ایسی ہے جیسا آپ ارشاد

فرماتے ہیں، اگر برائے خدا اس پھبتی کے معنی سمجھا دیجئے۔"

آغا صاحب: "خیر خاطر سے سن لیجئے۔ ہم سب لوگ خانہ پری کے بجائے نمبر وغیرہ کے (×) نشان بنا دیا کرتے ہیں اس لئے اس سے یہ مطلب نکلا کہ کمر معدوم پر دوسرے ایک خط سے یعنی زیادہ سے دوسرے کو کاٹ دیا ہے اس سے یہ ظاہر ہوا کہ معشوق کی کمر کٹی ہوئی اور پھر جڑ گئی ہوئی بھی ہے۔"

خان صاحب: "یہ کیونکر؟"

آغا صاحب: "اب اس باریکی کو نہ پوچھئے۔ حضرت واضح ہو کہ جھلک علم ریاضی میں علامت جمع کی ہے۔ لطف یہ ہے کہ علامت کی کوئی مقدار نہیں ہوتی مطلب یہ نکلا کہ کمر باوجود معدوم ہونے کے جسم کے دونوں حصوں کو جوڑے ہوئے ہے۔"

اصحاب حضرت: "بس نازک خیالی کی حد ہو گئی۔ جو کوئی یہ علم جانتا ہو وہ اس شعر کو سمجھے۔"

آغا صاحب: "اسی سے تو میں ایسے ویسوں کے سامنے پڑھتا نہیں۔ افسوس استاد مرحوم زندہ نہ ہوئے نہیں تو ان شعروں کی کچھ داد ملتی۔ اب سمجھنے والوں میں کون رہ گیا ہے۔ خیر اب مقطع سن لیجئے طبیعت کو کلفت ہو گئی۔ کوئی قدر دان نہیں ہے۔

لیکن استغراق بس بلبل قیامت تم کو روکو
غصہ ہو جائے گا فرج مضامیں میں جو اپنی ہے

اصحاب: "مقطع پھر عنایت ہو۔" آغا صاحب نے دوبارہ پڑھا۔

نواب صاحب: "کیا زبردست تخلص رکھا ہے قزاق۔"

آغا صاحب: "معاف فرمائیے گا۔ ہے تو کچھ ایسا ہی۔ مگر کچھ نازیبا نہیں ہے۔ ایک تو خاندانی اعتبار سے اس لئے کہ فدوی کے آبا و اجداد دشت قبچاق میں لوٹ مار کیا کرتے تھے۔ دوسرے اس سبب سے کہ استاد مرحوم سارق تخلص فرماتے تھے اور یہ کچھ ایسا مناسب نہ تھا اس لئے کہ (ان کی روح شرمندہ نہ ہو) عمر بھر اگلے شاعروں کے مضمون چرا چرا کے شعر موزوں فرمایا کئے۔ سارا دیوان ملاحظہ کر لیجئے۔ شاید ہی کوئی شعر نیا ہو۔ جب یہ لقب تمام کی نگاہ میں بسبب استعارہ کے آئی تو میں نے سرقہ کو اپنی شان کے منافی سمجھ کے قزاق تخلص رکھ لیا۔ کچھ نہیں تو اس میں ایک طرح کا بانکپن تو ہے بندہ کا یہ دستور رہا ہے کہ شعرائے ماضی و حال کے مضامین زبردستی چھین چھین کے اپنے

قبضۂ تصرف میں کرنا رہتا ہے۔

نواب: "بہت مبارک۔"

مشاعرہ ختم ہونے کے بعد قالب کی برف جمائی گئی۔ اس کی دو دو قلفیاں احباب نے نوش کیں۔ سب اپنے اپنے مکان تشریف لے گئے۔ اس کے بعد دسترخوان بچھا۔ منشی صاحب نے اور میں نے اور امراؤ جان نے کھانا کھایا۔

منشی صاحب: (امراؤ جان سے) "ذرا اپنا مطلع تو پڑھئے جو آپ نے پہلے پڑھا تھا۔"

امراؤ جان: کس کو سنائیں حال دل زار اے ادا
آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی

منشی صاحب: "اس میں شک نہیں کہ آپ کے حالات بہت ہی دلچسپ ہوں گے۔ جب سے آپ نے یہ مطلع پڑھا ہے مجھے یہی خیال ہے۔ اگر آپ اپنی سرگزشت بیان کریں تو لطف سے خالی نہ ہوگا۔"

میں نے بھی منشی صاحب کے کلام کی تائید کی۔ مگر امراؤ جان پہلو بچاتی تھیں۔ ہمارے منشی صاحب مہربان کو ابتدائے سن سے قصہ کہانیوں کا بڑا شوق تھا۔ الف لیلہ، امیر حمزہ کی داستان کے علاوہ بوستانِ خیال کی کل جلدیں نظر سے گزری ہوئی تھیں۔ کوئی ناول ایسا نہ تھا جو آپ نے نہ دیکھا ہو۔ مگر لکھنؤ میں چند مدت رہنے کے بعد جب اہل زبان کی اصلی بول چال کی خوبی کھلی، اکثر ناول نویسوں کے بے تکے قصے سستی زبان اور تعصب آمیز بیہودہ جوش دلانے والی تقریریں آپ کے دل سے اتر گئیں۔ لکھنؤ کے بامذاق لوگوں کی گفتگو بہتری پسند آئی تھی۔ امراؤ جان کے اس مطلع نے آپ کے دل میں وہ خیال پیدا کیا جس کا اشارہ اوپر کیا گیا ہے۔ القصہ منشی صاحب کے شوق اور میری اشتعالک سے امراؤ جان کو مجبور کیا اور وہ اپنی سرگزشت کہنے پر مجبور ہو گئیں۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ امراؤ جان کی تقریر بہت مہذب تھی اور کیوں نہ ہو اول تو خاندانی، دوسرے اعلیٰ درجے کی رنڈیوں میں پرورش پائی۔ شہزادوں اور نوابزادوں کی صحبت اٹھائی۔ محلاتِ شاہی تک رسائی۔ جو کچھ انھوں نے آنکھوں سے دیکھا اور لوگوں نے کانوں سے نہ سنا ہوگا۔

اپنی سرگزشت وہ جس قدر کہتی جاتی تھیں میں اسے چھپا کے لکھتا جاتا تھا۔ تمام ہونے کے بعد میں نے مسودہ دکھایا۔ اس پر امراؤ جان بہت بگڑیں مگر اب کیا ہوتا

تھا۔ آخر کچھ سمجھ بوجھ کے چپ ہو رہی۔ خود پڑھا اور لکھا جو کچھ رہ گیا تھا اُسے درست کر دیا۔

میں امراؤ جان کو اس زمانے سے جانتا ہوں جب ان سے نواب صاحب سے ملاقات تھی۔ انھیں دنوں میری نشست بھی اکثر وہاں رہتی تھی۔ اس سرگذشت میں جو کچھ بیان ہوا ہے مجھے اس کے حرف حرف صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں ہے مگر یہ میری ذاتی رائے ہے ناظرین کو اختیار ہے جو چاہیں قیاس کر لیں۔

مرزا رسوا

امراؤ جان ادا

لطف ہے کون سی کہانی میں
آپ بیتی کہوں کہ جگ بیتی

سُنیے مرزا رسوا صاحب۔ آپ مجھ سے کیا چھیڑ چھیڑ کے پوچھتے ہیں۔ مجھ کم نصیب کی سرگذشت میں ایسا کیا مزا ہے جس کے آپ مشتاق ہیں۔ ایک ناشاد نامراد آوارہ وطن خانماں برباد ننگ خاندان، اور دو جہان کے حالات سُن کے مجھے ہرگز اُمید نہیں کہ آپ خوش ہوں۔

اچھا سنیے اور اچھی طرح سنیے۔

باپ دادا کا نام لے کے اپنی سرخروئی جتانے سے فائدہ کیا اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے یاد بھی نہیں ہاں اتنا جانتی ہوں کہ فیض آباد میں شہر کے کنارے کسی محلہ میں میرا گھر تھا۔ میرا مکان پختہ تھا۔ آس پاس کچھ کچے مکان کچھ جھونپڑے کچھ کھپریلیں۔ رہنے والے بھی ایسے ہی ویسے لوگ ہوں گے کچھ بہشتی نائی۔ دھوبی، کہار میرے مکان کے سوا ایک اونچا گھر اس محلہ میں اور بھی تھا۔ اس مکان کے مالک کا نام دلاور خاں تھا۔

میرے ابا بہو بیگم صاحبہ کے مقبرے پہ نوکر تھے معلوم نہیں کا ہے میں اسم تھا کیا تنخواہ تھی اتنا یاد ہے کہ لوگ ان کو جمعدار کہتے تھے۔

دن بھر میں اپنے بھائی کو کھلایا کرتی تھی اور وہ بھی مجھ سے اس قدر ہلا ہوا تھا کہ دم بھر کے لئے نہ چھوڑتا تھا۔

ابا جب شام کو نوکری پر سے آتے تھے اس وقت کی خوشی ہم بھائی بہنوں کی کچھ نہ پوچھئے۔ میں کمر سے لپٹ گئی بھائی ابا ابا کرکے دوڑا دامن سے چمٹ گیا۔ ابا کی باچھیں مارے خوشی کے کھلی جاتی ہیں مجھ کو چمکارا پیٹھ پر ہاتھ پھیرا بھیا کو گود میں اٹھا لیا۔ پیار کرنے لگے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ کبھی خالی ہاتھ گھر نہ آتے تھے۔ کبھی دو کیلے ہاتھ میں ہیں۔ کبھی بتاشوں پائی کے لڈوؤں کا دونا ہاتھ میں ہے۔ اب اس کے حصے لگائے جا رہے ہیں۔ اس وقت بھائی بہنوں میں کس مزے کی لڑائیاں ہوتی تھیں وہ کیلا چھینے لئے جاتا ہے۔ میں مٹھائی کا دونا چھینے لیتی ہوں۔ اماں سامنے کھپریل میں بیٹھی کھانا پکا رہی ہیں ابا ادھر آکے بیٹھے نہیں ادھر میرے تقاضے شروع ہو گئے ابا اللہ گڑیاں نہیں لائے۔ دیکھو میرے پاؤں کی جوتی کیسی ٹوٹ گئی ہے۔ تم کو تو خیال ہی نہیں رہتا۔ لو ابھی تک میرا طوق سنار کے ہاں سے بن کے نہیں آیا۔ چھوٹی خالہ کی لڑکی کی دودھ بڑھائی ہے بھئی میں کیا پہن کے جاؤں گی، چاہے کچھ ہو عید کے دن تو میں نیا جوڑا پہنوں گی۔ ہاں میں تو نیا پہنوں گی۔ ہاں میں تو نیا پہنوں گی جب اماں کھانا پکا چکیں مجھے آواز دی۔ میں گئی روٹی کی ٹوکری اور سالن کی پتیلی اٹھا لائی۔ دسترخوان بچھا۔ اماں نے کھانا نکالا۔ سب نے سر جوڑ کے کھانا کھا کے خدا کا شکر کیا۔ ابا نے عشا کی نماز پڑھی، سو رہے۔ صبح کو تڑکے ابا اٹھے نماز پڑھی اسی وقت میں بھی سو کے اٹھ بیٹھی پھر فرمائشیں شروع ہوئیں۔

"میرے ابا آج نہ بھولنا گڑیاں ضرور لیتے آنا۔ ابا شام کو بہت سارے امرود اور نارنگیاں لانا۔ . . . "

ابا صبح کی نماز پڑھ کے وظیفہ پڑھتے ہوئے کوٹھے پر چڑھ جاتے تھے کبوتروں کو کھول کے دانہ دیتے تھے۔ ایک دو ہوائیں اڑاتے تھے۔ اتنے میں اماں جھاڑو بہارو سے فراغت کر کے کھانا تیار کر لیتی تھیں کیونکہ ابا پہر دن چڑھے سے پہلے ہی نوکری پر چلے جاتے تھے۔ اماں سینا پرونا لے کے بیٹھ جاتی تھیں۔ میں بھیا کو لئے کہیں محلے میں نکل گئی یا دروازے پر املی کا درخت تھا وہاں چلی گئی ہمجولی لڑکیاں لڑکے جمع ہوئے بھیا کو بٹھا دیا خود کھیل میں مصروف ہو گئی۔ ہائے کیا دن تھے کسی بات کی فکر ہی نہ تھی۔ اچھے سے اچھا کھاتی تھی اچھے سے اچھا پہنتی تھی کیونکہ ہمجولی لڑکے لڑکیوں میں کوئی مجھے اپنے سے بہتر نظر نہ آتا تھا۔ دل کھلا ہوا نہ تھا۔ نگاہیں

بچی ہوئی نہ تھی۔ جہاں میں رہتی تھی وہاں کوئی مکان میرے مکان سے اونچا نہ تھا اور سب ایک کھڑ یا کھپریل میں رہتے تھے۔ میرے مکان میں آمنے سامنے دو دالان تھے۔ صدر کے دالان کے آگے کھپریل پڑی ہوئی دو کوٹھریاں تھیں۔ سامنے دالان کے ایک باورچی خانہ تھا دوسری طرف کوٹھے کا زینہ۔ کوٹھے پر ایک کھپریل دو کوٹھریاں، کھانے پکانے کے برتن ضرورت سے زیادہ تھے۔ دو چار دریاں چاندنیاں بھی تھیں۔ ایسی چیزیں محلے کے لوگ ہمارے گھر سے مانگنے آتے تھے۔ ہمارے گھر میں بہشتی پانی بھرتا تھا محلے کی عورتیں خود ہی کنوئیں سے پانی بھراتی تھیں۔ ہمارے ابا جب گھر سے وردی پہن کر نکلتے تھے تو لوگ انھیں جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔ میری اماں ڈولی پر سوار ہو کے مہمان جاتی تھیں ہمسائیاں پاؤں پیدل ماری ماری پھرتی تھیں۔

صورت شکل میں بھی میں اپنی ہمجولیوں سے اچھی تھی۔ اگرچہ در حقیقت خوبصورتوں میں میرا شمار نہیں ہو سکتا مگر ایسی بھی نہ تھی جیسی اب ہوں کھلتی ہوئی چمپئی رنگت تھی۔

ناک نقشہ بھی خیر کچھ ایسا برا نہ تھا۔ ماتھا کسی قدر اونچا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں بچپنے کے پھولے پھولے گال تھے، ناک اگرچہ ستواں نہ تھی مگر چپٹی اور بیٹھی ہوئی بھی نہ تھی ڈیل ڈول بھی سن کے موافق اچھا تھا۔ اگرچہ اب ویسی نہیں رہی۔ نازکوں میں میرا شمار جب تھا نہ اب ہے۔ اس قطع پر پاؤں میں لال گلبدن کا پاجامہ چھوٹے چھوٹے پائنچوں کا ٹول کا نیفہ۔ نینو کی کرتی تنزیب کی اوڑھنی ہاتھوں میں چاندی کی تین تین چوڑیاں گلے میں طوق ناک میں سونے کی نتھنی اور سب لڑکیوں کی نتھنیاں چاندی کی تھیں۔ کان ابھی تازے تازے چھدے تھے۔ ان میں صرف نیلے ڈورے پڑے تھے۔ سونے کی بالیاں بننے کو گئی تھیں۔

میری شادی میری پھوپھی کے لڑکے کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی۔ منگنی نو برس کے سن میں ہو گئی تھی۔ اب ادھر سے شادی کا تقاضا تھا۔ میری پھوپھی نواب گنج میں بیاہی ہوئی تھیں پھوپھا ہمارے زمیندار تھے۔ پھوپھی کا گھر ہمارے گھر سے زیادہ بھرا پرا تھا منگنی ہونے سے پہلے میں کئی مرتبہ اپنی ماں کے ساتھ وہاں جا چکی تھی۔ وہاں کے کارخانے ہی اور تھے۔ مکان تو کچا تھا مگر بہت وسیع دروازے پر چھپر پڑے تھے۔ گائے، بیل، بھینسیں بندھی تھیں گھی دودھ کی افراط تھی۔ اناج کی کثرت بھٹوں کی فصل میں ٹوکروں بھٹے چلے آتے ہیں کتاروں کی پھاندیاں پڑی ہوتی ہیں۔ اوکھ کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں، کوئی کہاں تک کھائے۔

میں نے اپنے دولہا (یعنی جس کے ساتھ میری نسبت ٹھہری ہوئی تھی) کو بھی دیکھا تھا۔ بلکہ ساتھ کھیلی تھی۔ ابا پورا جہیز کا سامان کر چکے تھے۔ کچھ روپئے کا اور فکر تھی۔ رجب کے مہینے میں شادی کا تقرر ہو گیا تھا۔

رات کو ابا اماں میں جب میری شادی کی باتیں ہوتی تھیں۔ میں چپکے چپکے سنا کرتی تھی اور دل ہی دل میں خوش ہوتی تھی۔ واہ میرے دولہا کی صورت کریمن (ایک ہمسایے کی لڑکی کا نام تھا جو میرے ہمسن تھی) کے دولہا سے اچھی ہے وہ تو کالا کالا بھجنگ ہے میرا دولہا گورا گورا ہے۔ کریمن کے دولہا کے منہ پر کیا بڑی سی داڑھی ہے میرے دولہا کے ابھی مونچھیں بھی اچھی طرح نہیں نکلیں کریمن کا دولہا ایک میلی سی دھوتی باندھے رہتا ہے۔ ماشی رنگی ہوئی مرزئی پہنے رہتا ہے میرا دولہا عید کے روز کس ٹھاٹھ سے آیا تھا۔ سبز چھینٹ کا دگلا گلبدن کا پائجامہ مشروع کی ٹوپی مخملی جوتہ۔ کریمن کا دولہا سر میں ایک پھینٹا باندھے ہوئے ننگے پاؤں پھرتا ہے۔

غرضکہ میں اپنی حالت میں خوش تھی اور کیوں نہ خوش ہوتی کیونکہ اس سے بہتر اور کوئی حالت میرے خیال میں نہ آسکتی تھی مجھے اپنی تمام آرزوئیں بہت ہی جلد پوری ہوتی معلوم ہوتی تھیں۔

مجھے یاد نہیں کہ جب تک میں اپنے ماں باپ کے گھر میں رہی مجھے کوئی صدمہ پہنچا ہو مگر ایک مرتبہ جب میری انگلی کا ایک چھلا چند روز ہوئے کھیلنے میں جاتا رہا تھا (چاندی کا تھا شاید ایک آنے سے زیادہ کا نہ ہوگا۔ یہ اب کہتی ہوں اس وقت اتنی تمیز کہاں تھی کہ قیمت کسی چیز کی مجھے معلوم ہی نہ تھی) اس چھلے کے لئے میں اتنا روئی کہ آنکھیں سوج گئیں۔ اماں سے دن بھر چھپایا۔ آخر جب رات کو انھوں نے انگلی خالی دیکھی مجھ سے حال پوچھا اب کہنا ہی پڑا۔ اماں نے ایک طمانچہ میرے منہ پر مارا میں چیخیں مار مار کے رونے لگی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اتنے میں ابا آگئے انھوں نے مجھے چمکارا۔ اماں پر خفا ہوئے اس وقت مجھے تسکین ہوئی۔

بے شک ابا مجھے اماں سے زیادہ چاہتے تھے۔ ابا نے کبھی پھول کی چھڑی نہیں چھوائی۔ اماں ذرا ذرا سی بات پر مار بیٹھتی تھیں۔ اماں چھوٹے بھیا کو بہت چاہتی تھیں چھوٹے بھیا کے لئے میں نے بہت مار کھائی مگر پھر بھی مجھے اس سے انتہا کی محبت تھی اماں کی ضد سے تو کبھی کبھی دو دو پہر میں نے گود میں نہیں لیا۔ مگر جب ان کی آنکھ اوجھل ہوئی فوراً گلے سے لگا لیا۔ گود میں اٹھا لیا۔ پیار کر لیا۔ جب دیکھا اماں آتی ہیں جلدی سے اتار

دیا اب وہ رونے لگا۔ اس پر اماں سمجھتی تھیں کہ میں نے رُلا دیا، لگیں گھُرکیاں دینے۔

یہ سب کچھ تھا مگر جہاں میری انگلی دُکھی اور اماں بے قرار ہو گئیں۔ کھانے پینے کا ہوش نہیں راتوں کی نیند حرام۔ کسی سے دوا پوچھتی ہیں کسی سے تعویذ منگاتی ہیں۔

میرے جہیز کے لئے اپنے ہاتھ گلے کا گہنا اتار کے ابا کے حوالے کیا۔ اس میں تھوڑی چاندی ملوا کے پھر سے بنوا دو۔ دو ایک عدد جو نئے بنے ہوئے ہیں اُن کو اُجلوا دو۔ گھر بھر کے برتنوں میں سے دو چار رکھ لئے باقی نکال کے الگ کر دیئے کہ ان پر قلعی کرا دو۔ بلکہ ابا نے کہا بھی کہ اپنے آئندہ کا بھی خیال رکھو۔ اماں نے کہا اوہ جی ہو گا! تمھاری بہن نہ میدار کی بیوی ہیں وہ بھی تو جانیں کہ بھائی نے لڑکی کو کچھ دیا۔ آخر تمھاری بہن ہیں۔ سسرال کا نام برا ہوتا ہے۔ میری لڑکی ننگی بوچی جائے گی تو لوگ طعنے دیں گے۔

مرزا رسوا صاحب! میں نے اپنے ماں باپ کے گھر اور بچپن کی حالت کا پورا نقشہ آپ کے سامنے کھینچ دیا ہے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر میں اس عالم میں رہتی تو خوش رہتی یا ناخوش۔ اسے آپ خود قیاس کر سکتے ہیں۔ میری ناقص عقل میں تو یہ آتا ہے کہ میں اسی حالت میں اچھی رہتی۔

ابتداءِ آوارگی کی جوشِ وحشت کا سبب

ہم تو سمجھے ہیں مگر ناصح کو سمجھائیں گے کیا

میں نے اکثر لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ جو خانگی رنڈیاں ہیں اُن کا تو ذکر ہی کیا جو کچھ نہ کریں کم ہے کیونکہ ایسے گھر اور ایسی حالت میں پرورش پاتی ہیں جہاں سوائے بدکاری کے اور کسی چیز کا مذکور ہی نہیں۔ ماں بہن جس کو دیکھتی ہیں اسی حالت میں ہے مگر یہ ماں باپ کی بیٹیاں جو اپنے گھروں سے نکل کے خراب ہو جاتی ہیں اُن کو ڈال مارے جہاں پانی نہ ملے۔

میرا حال جتنا میں بیان کر چکی ہوں اتنا ہی کہہ کے چھوڑ دوں اور اس کے بعد یہ کہہ دوں کہ میں اس کے بعد میں آوارہ ہو گئی اس سے یہ خیال پیدا ہو گا کہ کمبخت اور سیانی تھی شادی ہونے میں دیر ہوئی۔ کسی سے آنکھ لگا کے نکل آئی۔ اس نے چھوڑ دیا کسی اور سے آشنائی کی۔ اس سے بھی نہ بنی آخر رفتہ رفتہ یہی پیشہ ہو گیا واقعی اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت سی بہو بیٹیوں کو خراب ہوتے دیکھا اور سنا۔ اس کے سبب

بھی کئی ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جوان ہو گئیں ماں باپ شادی نہیں کرتے۔ دوسرے یہ کہ شادی اپنی پسند سے نہیں ہوتی۔ ماں باپ نے جہاں پایا جھونک دیا۔ نہ سن کا لحاظ کیا نہ صورت شکل دیکھی۔ نہ مزاج حال دریافت کیا۔ میاں سے نہ بنی نکل کھڑی ہوئیں۔ جوانی میں سر پر آسمان ٹوٹا رانڈ ہو گئیں۔ صبر نہ ہو سکا دوسرا کر لیا۔ یا بد صحبت ملی آوارہ ہو گئیں۔ مگر مجھ بد نصیب ناشدنی کو بخت و اتفاق نے مجبور کر کے ایسے جنگل میں چھوڑا جہاں سوائے گمراہی کے کوئی راستہ ہی نہ تھا۔

دلاور خاں جس کا مکان ہمارے مکان سے تھوڑی دور پر تھا۔ سوا ڈکیتوں سے ملا ہوا تھا۔ لکھنؤ میں برسوں قید رہا اسی زمانے میں نہیں معلوم کس کی سفارش سے چھوٹ آیا تھا۔ ابا سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ جب فیض آباد سے گرفتار ہوا تو محلہ سے اس کے چال چلن کی تحقیقات کے لئے لوگ طلب ہوئے۔ اُن میں ابا بھی تھے۔ آہ بیچارے یوں بھی دل کے سادے اور زبان کے سچے تھے۔ اُس پر طرہ یہ رانی واکے صاحب نے ان کے ہاتھ میں قرآن دے کے پوچھا "دل جمعدار تم سچ سچ کہو یہ کیسا آدمی ہے؟" ابا نے صاف صاف جو اُس کا حال تھا کہہ دیا۔ انھیں کی گواہی پر دلاور خاں قید ہو گیا۔ یہ حال میں نے اپنی ماں سے سنا تھا۔ وہ کینہ اس کے دل میں چلا آتا تھا۔ اب کی جب قید سے چھوٹ کر آیا تو اس نے ابا کی ضد پر کبوتر پال لے۔ ایک دن اس نے ابا کا کبوتر مارا اپنے گھر گھیرے دیا۔ ابا چار آنے دیتے تھے وہ آٹھ آنے مانگتا تھا۔ ابا تو نوکری پر چلے گئے۔ جھٹ پٹے وقت خدا جانے میں کیوں نکلی تھی۔ دیکھتی کیا ہوں، املی کے نیچے کھڑا ہوا ہے۔ کہنے لگا "چھو بیٹا تمھارے ابا پیسے دے گئے تھے کبوتر لے لو"۔ میں اس کے دم میں آگئی ساتھ چلی گئی جا کے جو دیکھتی ہوں گھر میں کوئی چڑیا نہیں، اکیلا مکان پڑا ہے۔ ادھر میں مکان میں داخل ہوئی اُدھر اس نے اندر سے کنڈی بند کر لی۔ چاہتی ہوں کہ چیخوں، اس نے منہ میں گودڑ ٹھونس دیا۔ میرے دونوں ہاتھ رومال سے کس دئے۔ اس مکان کا ایک دروازہ دوسری طرف تھا۔ مجھے زمین پر بٹھا کے آپ گیا وہ دروازہ کھولا اور پیر بخش کہہ کے آواز دی پیر بخش اندر آیا۔ دونوں نے مل کے مجھے بیل گاڑی پر سوار کیا کہ گاڑی چل نکلی۔ میں دم بخود رہ گئی۔ تلے کی سانس تلے اوپر کی اوپر۔ کروں کیا کوئی بس نہیں۔ موذی کے چنگل میں ہوں۔ دلاور خاں بہل کے اندر مجھے گھٹنوں کے نیچے دبائے بیٹھا ہے۔ ہاتھ میں چھری ہے۔ موئے کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے پیر بخش گاڑی ہانک رہا ہے

ہیں ہی گھوڑے چلے جا رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں شام ہو گئی۔ چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ جاڑے کے دن تھے۔ سناٹے کی ہوا چل رہی تھی۔ سردی کے مارے میری بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی۔ دم نکلا جاتا تھا۔ آنکھوں سے باران جاری تھا۔ دل میں یہ خیال آتا ہے ہائے کس آفت میں پھنسی۔ ابا نوکری پر سے آئے ہوں گے۔ مجھے ڈھونڈھتے ہوں گے اماں بیٹھی رو رہی ہوں گی۔ چھوٹا بھائی کھیل رہا ہوگا۔ اسے کیا معلوم بہن کس آفت میں ہے ماں باپ بھائی، مکان کا دالان، انگنائی، باورچی خانہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ یہ سب خیالات ایک طرف تھے اور جان کا خوف ایک طرف۔ دلاور خان گھڑی گھڑی چھری دکھاتا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب کوئی دم میں یہ چھری میرے کلیجے کے پار ہو گی گو ڈر اب میرے منھ میں نہ تھا مگر مارے ڈر کے منھ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ ادھر میرا تو یہ حال تھا ادھر دلاور خاں اور پیر بخش میں ہنس ہنس کے باتیں ہو رہی تھیں۔ میرے ماں باپ پر اور مجھ پر بات بات میں گالیاں پڑتی جاتی تھیں۔

دلاور خاں: "دیکھا بھائی پیر بخش! سپاہی کے پوت بارہ برس کے بعد اپنا بدلہ لیتے ہیں۔ اب کیسا . . . تلملاتا پھرتا ہوگا!"

پیر بخش: "بھئی تم نے بیشک اس مثل کو اصل کر دکھایا۔ بارہ برس تو ہوتے ہو گئے تمہیں قید ہوئے۔"

دلاور خاں: "پورے بارہ برس ہوئے، بھائی لکھنؤ میں کیا کیا مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ خیر . . . . . . وہ بھی تو کوئی دن یاد کرے گا۔ یہ تو میرا پہلا وار تھا۔ میں تو اس کو جان سے ماروں گا۔"

پیر بخش: "کیا یہ بھی ارادہ ہے؟"

دلاور خاں: "تم سمجھتے کیا ہو۔ جان سے نہ مارا تو پٹھان کا تخم نہیں۔"

پیر بخش: "بھئی تم قول کے سچے ہو جو کہو گے کر دکھاؤ گے۔"

دلاور خاں: "دیکھنا۔"

پیر بخش: "اور اسے کیا کرو گے؟"

دلاور خاں: "کریں گے کیا۔ یہیں کہیں مار کے نالے میں ٹوپ دو۔ راتوں بہہ جائے گی۔"

میں چونکی مجھے اپنی موت کا یقین ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو تھم گئے۔ دل میں

ایک دھکا لگا تھا ... دل بیٹھ گیا تھا۔ ہاتھ پاؤں ڈال دئے۔ یہ جان لیا کہ بس ... مجھے بھی موت کا ڈر ذرہ نہ آیا اور ایک گونہ ... میرے پیچھے ... مارا کہ ... تھا کہ کیا کہہ رہا ہوں۔

پیر بخش۔ "ارے ... تمہارا ... دیکھا؟"

دلاور خاں۔ "ہو گئے تھے پانی۔"

پیر بخش۔ "کہاں سے دوڑ گئے؟ ہم تو گھبرا گئے تھے۔"

دلاور خاں۔ "گھر چلو۔ کہیں سے نہ ہو سکے گا تو کچھ تربیت کے دیر دیں گے۔"

پیر بخش۔ "تم بے عقل ہو۔ کیوں کیوں بیچو۔ ہم تو ایک بات بتائیں۔"

دلاور خاں۔ "کہو۔"

پیر بخش۔ "ارماں لکھنؤ میں چل کے اسی چھوکری کے کوٹھے کر لو۔"

جب سے اپنے مرنے کا یقین ہو گیا تھا۔ مجھے ان دونوں موذیوں کی باتیں کانوں سے اچھی طرح سنائی نہ دیتی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی خواب میں باتیں کر رہا ہے۔

پیر بخش کی باتیں سن کر میرے دل کو پھر اپنی زندگی کا کچھ آسرا بندھا۔ دل ہی دل میں پیر بخش کو دعائیں دینے لگی۔ مگر اب یہ انتظار ہے کہ دیکھوں یہ موذی کیا کہتا ہے۔

دلاور خاں۔ "اچھا دیکھا جائے گا۔ ابھی چلے چلو۔"

پیر بخش۔ "یہاں ذرا ٹھہر جائیں۔" وہ سامنے درخت کے نیچے آگ جل رہی ہے۔ تھوڑی آگ لے آئیں تو حقہ بھر لیں۔"

پیر بخش تو آگ لینے گیا۔ مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں پیر بخش کے آتے آتے یہ میرا کام نہ تمام کر دے۔ جان کا خوف برا ہوتا ہے۔ ایکبارگی زور سے چیخ ماری۔ چیخ کا مارنا تھا کہ دلاور خاں نے دو تین طمانچے میرے منہ پر کس کس کے لگائے۔ "حرامزادی چپ نہیں رہتی۔ ابھی چھری بھونک دوں گا۔ . . . چنیں کرتی ہے۔"

پیر بخش۔ (ابھی تھوڑی ہی دور گیا ہوگا) "تمہیں کبھی نہیں ایسا کام نہ کرنا تمہیں ہمارے سر کی قسم۔ ارماں ہمیں تو آ لینے دو۔"

دلاور خاں۔ "اچھا جاؤ آگ تو لے آؤ۔"

پیر بخش گیا اور تھوڑی دیر کے بعد آگ لے کے آیا۔ حقہ بھرا۔ دلاور خاں کو دیا۔

دلاور خاں ۔ (ایک کش حقہ کا پی کے) "تو یہ کتنے تک بک جائے گی؟ اور بیچے گا کون؟ ایسا نہ ہو کہیں پکڑے جائیں تو اور مشکل ہو۔"

پیر بخش "اس کا ہمارا ذمہ ہم تو بیچ دیں گے۔ ارے میاں تمھاری باتیں، پکڑے گا کون؟ لکھنؤ میں ایسے معاملے دن رات ہوا کرتے ہیں۔ ہمارے سالے کو جانتے ہو؟"

دلاور خاں "کریم؟"

پیر بخش "ہاں۔ اس کی روٹی اسی پر ہے۔ بیسیوں لڑکے لڑکیاں پکڑ لے گیا لکھنؤ میں جا کے دام کھرے کر لیے۔"

دلاور خاں "آج کل کہاں ہے؟"

پیر بخش "کہاں ہے؟ لکھنؤ میں گومتی اس پار اس کی سسرال ہے وہیں ہوگا۔"

دلاور خاں "بھلا لڑکا لڑکی کتنے کو بکتے ہیں؟"

پیر بخش "جیسی صورت ہوئی۔"

دلاور خاں "بھلا یہ کتنے کو بک جائے گی؟"

پیر بخش "سو ڈیڑھ سو جیسی تمھاری تقدیر ہوئی۔"

دلاور خاں "بھائی کی باتیں، سو ڈیڑھ سو۔ اس کی صورت ہی کیا ہے؟ ۔ سَو بھی تو بہت ہے۔"

پیر بخش "اچھا اس سے کیا۔ لے تو چلو۔ مار ڈالنے سے کیا فائدہ؟"

اس کے بعد دلاور خاں نے پیر بخش کے کان میں کچھ جھک کے کہا جس کو میں نے نہیں سنا۔ پیر بخش نے جواب دیا "وہ تو ہم پہلے ہی سمجھے تھے۔ تم کیا بے وقوف ہو۔"

رات بھر گاڑی چلا کی میری جان سانسے میں تھی، موت آنکھوں کے سامنے پھر رہی تھی، طاقت سلب ہو گئی تھی۔ بدن سُن ہو گیا تھا۔ آپ نے سنا ہوگا کہ نیند سولی پر بھی آتی ہے۔ تھوڑی دیر میں آنکھ لگ گئی۔ ترس خدا کر کے پیر بخش نے بیلوں کا کمل اڑھا دیا۔ رات کو کئی مرتبہ چونک پڑی۔ آنکھ کھل جاتی تھی مگر ڈر کے مارے چپکی پڑی تھی۔ آخر ایک مرتبہ ڈرتے ڈرتے منھ پر سے کمل سرکا کے جو دیکھا معلوم ہوا میں گاڑی میں اکیلی ہوں پردے سے جھانک کر دیکھا سامنے کچھ کچے مکان ہیں۔ ایک بنیے کی دکان ہے۔ دلاور خاں اور پیر بخش کچھ نہیں ہیں۔ بیل سامنے برگد کے درخت کے نیچے بھوسہ کھا رہے ہیں دو تین گنوار الاؤ کے پاس بیٹھے تاپ رہے ہیں۔ ایک چلم پی رہا ہے۔ اتنی دیر میں پیر بخش

نے گاڑی کے پاس آ کے تھوڑے سے بھنے ہوئے چنے دیے۔ میں رات بھر کی بھوکی تھی کھانے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک لوٹا پانی لا کے دیا میں نے تھوڑا سا پیا پھر چپکی ہو کے پڑ رہی۔

بڑی دیر تک گاڑی یہاں رکی رہی پھر پیر بخش نے بیل جوتے۔ دلاور خاں حقہ بھر کے میرے پاس آ بیٹھا گاڑی روانہ ہوئی۔ آج دن کو مجھ پر زیادہ سختی نہیں ہوئی نہ دلاور خاں کی چھری نکلی نہ مجھ پر گھونسے پڑے نہ گھڑکیاں۔ دلاور خاں اور پیر بخش دونوں جگہ بجگہ پر حقہ بھر بھر کے پیتے تھے باتیں ہوتی جاتی تھیں۔ جب باتیں کرتے کرتے تھک گئے کچھ گانے لگے ایک گاتا ہے دوسرا چپکا سن رہا ہے۔ سن کیا رہا ہے سوچ رہا ہے کہ اب کیا بات نکالوں۔ پھر کوئی بات نکل آئی۔ اس گفتگو میں اکثر ایسا بھی ہوا کہ آپس میں گالی گلوج ہونے لگی آستینیں چڑھ گئیں، کمریں کسی جانے لگیں۔ ایک گاڑی پر سے کود پڑتا ہے دوسرا وہیں گلا گھونٹنے کو تیار ہے۔ پھر کسی بات پر دونوں ڈھیلے پڑ گئے۔ بات رفت گزشت ہوئی۔ پھر ملاپ ہوا دوستی کی باتیں ہونے لگیں۔ گویا کبھی لڑے ہی نہ تھے۔

ایک۔ "یار ہمارے تمہارے لڑائی کی بات ہی کیا تھی۔"

دوسرا: "بات ہی کیا تھی۔"

پہلا: "اچھا تو پھر اس بات کو جانے دو۔"

دوسرا: "جانے دو۔"

دے پھڑکنے کی اجازت صیاد
شب اوّل ہے گرفتاری کی

گرفتاری کی شب اوّل کا حال تو آپ سن چکے۔ ہائے وہ بے بسی۔ مرتے دم تک نہ بھولوں گی۔ مجھے خود حیرت ہے کہ میں کیونکر زندہ بچی۔ ہے ہے کیا سخت جان تھی کہ دم نہ نکلا دلاور خاں بندے دنیا میں تو خیر اپنی سزا کو پہنچا مگر کیا اس سے میرے دل کو تسکین ہوئی۔ اگر اس کی بوٹیاں کاٹ کاٹ کے چیل کوؤں کو کھلاتی تو بھی مجھے آہ نہ آتی، یقین ہے کہ قبر میں صبح و شام جہنم کے کندے پڑتے ہوں گے اور قیامت کے دن خدا چاہے تو اس سے بدتر درجہ ہوگا۔

ہائے میرے ماں باپ کا کیا حال ہوا ہوگا مجھے تیری جان کو کلپتے ہوں گے۔

بس مرزا صاحب! اتنی آج کی باتیں کل کہوں گی۔ اب میرا دل ہے کہ امڈا چلا آتا ہے۔ جی چاہتا ہے خوب چیخیں مار مار کے روؤں ۔ ۔ ۔ ۔

آپ میری آوارگی کی سرگزشت سن کے کیا کیجئے گا۔ بہتر ہے کہ یہیں تک رہنے دیجئے میں تو یہ کہتی ہوں کہ کاش دلاور خاں مجھ کو مار ہی ڈالتا تو اچھا تھا مٹی بھر خاک سے میری آبرو ڈھک جاتی میرے ماں باپ کی عزت کو دھبہ نہ لگتا۔ یہ دین و دنیا کی روسیاہی تو نہ ہوتی۔

ان دنوں میں نے اپنی ماں کو ایک بار پھر دیکھا تھا۔ کب اس کو دیکھا تھا، اس کو ایک زمانہ ہوا۔ اب خدا جانے جیتی ہیں یا مر گئیں۔ سنا ہے کہ چھوٹے بھائی کے ایک لڑکا ہے ماشاءاللہ چودہ پندرہ برس کا۔ دو لڑکیاں ہیں۔ میرا بے اختیار جی چاہتا ہے کہ ان سب کو دیکھوں مگر ایسا دل بھی نہیں۔ موئے ایک روپئے میں تو آدمی فیض آباد پہنچ سکتا ہے مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ اس زمانے میں جب ریل نہ تھی فیض آباد سے لکھنؤ چار دن کا راستہ تھا۔ مگر دلاور خاں اس خوف سے کہ کہیں میرا باپ پیچھا نہ کرے نہ معلوم کن کن راستوں سے لایا کوئی آٹھ دن میں لکھنؤ پہنچی۔ مجھ کو کیا خبر تھی کہ لکھنؤ کہاں ہے مگر دلاور خاں اور پیر بخش کی باتوں سے میں اتنا سمجھ گئی تھی کہ یہ لوگ مجھے لکھنؤ لئے جاتے ہیں۔ لکھنؤ کا میں نام گھر میں سنا کرتی تھی کیونکہ میرے ماموں یہیں کسی محل کی ڈیوڑھی پر سپاہیوں میں نوکر تھے۔ گھر میں ان کا ذکر ہوتا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ فیض آباد بھی گئے تھے۔ میرے لئے بہت سی مٹھائی اور کھلونے لے گئے تھے۔ میں انھیں اچھی طرح پہچانتی تھی۔

لکھنؤ میں گومتی اس پار کریم کی سسرال میں مجھے لا کر اتارا۔ چھوٹا سا کچا مکان کریم کی ساس موئی مردہ شو کی سی معلوم ہوتی تھی۔ مجھے گھر میں لے گئی ایک کوٹھری میں بند کر دیا۔ صبح ہوتے لکھنؤ پہنچی تھی۔ دوپہر تک بند رہی۔ پھر کوٹھری کا دروازہ کھلا ایک جوان سی عورت (کریم کی جورو) تین چپاتیاں اور ایک مٹی کے پیالے میں کچھ بے باس کی دال اور ایک بدھنی پانی کی میرے آگے رکھ کے چلی گئی۔ مجھے اس وقت وہ بھی نعمت ہو گئی۔ آٹھ دن ہو گئے تھے گھر کا پکا کھانا نصیب نہ ہوا تھا۔ راستے میں چنے اور ستوؤں کے سوا کچھ ملا ہی نہ تھا۔ کوئی آدھی بدھنی بھر پانی پی گئی۔ اس کے بعد زمین پر پاؤں پھیلا کے سو رہی۔ خدا جانے کتنی دیر سوئی۔ کیونکہ اس اندھیری کوٹھری میں دن رات کی تمیز نہ ہو سکتی تھی۔ اس درمیان میں کئی مرتبہ آنکھ کھلی۔ چاروں طرف اندھیرا کوئی آس نہ پاس۔ پھر اوڑھنی سے منہ ڈھانپ کے پڑ رہی۔ پھر نیند آ گئی۔ تیسری چوتھی مرتبہ جو آنکھ کھلی تو پھر نیند نہ آئی

پڑی جاگتی رہی۔ اتنے میں کریم کی ساس ڈائن کی شکل بکتی بڑبڑاتی اندر آئی، میں اٹھ بیٹھی
"ارے تو یہ کتنی سوتی ہے۔ رات کو پٹخ پٹخ کے گلا پڑ گیا۔ جھنجھوڑ جھنجھوڑ کے اٹھایا۔
سانس ہی سانس میں آج بھی تھی سانپ سونگھ گیا۔ اسے لو وہ تو پھر اٹھ بیٹھی۔" میں
چپکے بیٹھی۔ جب خوب بک جھک چکی تو پوچھنے لگی . . . . .

"پیالہ کہاں ہے؟" میں نے اشارہ کیا وہ باہر لیکر نکلی۔ کوٹھڑی کا دروازہ بند
ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کریم کی جورو آئی۔ اسی کوٹھڑی میں ایک کھڑکی لگی تھی اسے کھول
دیا۔ مجھ کو باہر نکالا۔ ایک ٹوٹا سا کھنڈر پڑا تھا یہاں آ کے آسمان دیکھنا نصیب ہوا۔ تھوڑی
دیر کے بعد پھر اسی کال کوٹھڑی میں بند کر دی گئی۔ آج اوپر کی دال اور جوار کی روٹی
کھانے کو ملا۔

اسی طرح دو دن گزرے تیسرے دن ایک اور لڑکی مجھ سے سن میں دو ایک
برس بڑی اسی کوٹھڑی میں لا کے بند کی گئی۔ کریم خدا جانے کہاں سے پھسلا کے لے آیا تھا
بیچاری کیسی چیخ چیخ کے رو رہی تھی۔ مجھ کو اس کا آنا غنیمت ہو گیا۔ جب وہ رو دھو چکی تو چپکے
چپکے باتیں ہوا کیں۔

کسی بنئے کی لڑکی تھی رام دئی نام تھا۔ سیتاپور کے پاس کوئی گاؤں تھا وہاں
کی رہنے والی تھی۔

اندھیرے میں تو اس کی شکل دکھائی نہ دی تھی۔ حسب معمول دوسرے دن کھڑکی
کھولی گئی تو اس نے مجھ کو دیکھا میں نے اسے دیکھا۔ گوری گوری تھی۔ بہت خوبصورت
ناک نقشہ۔ ڈیل ڈول اچھا بھرا تھا۔

پھر تھوڑے دن اس کال کوٹھڑی سے اس کی رہائی ہوئی۔ میں وہیں رہی۔ پھر تنہائی
نصیب ہوئی۔ دو دن اکیلی اور پڑی رہی۔ تیسرے دن رات کے وقت دلاور خاں اور
پیر بخش نے مجھے آ کے نکالا، اپنے ساتھ لے کے چلے۔ اندھیری رات تھی۔ پہلے ایک میدان
پھر ایک بازار میں سے ہو کر گزرے۔ پھر ایک پل پر آئے نیچے دریا لہریں مار رہا تھا ٹھنڈی
ہوا چل رہی تھی۔ میں کانپی جا رہی تھی۔ تھوڑی دور کے بعد ایک بازار پھر ملا اس سے
نکل کے ایک تنگ گلی میں بہت دور تک چلنا پڑا۔ پاؤں تھک گئے۔ اس کے بعد ایک اور
بازار میں آئے یہاں بڑی بھیڑ تھی راستہ مشکل سے ملتا تھا۔ ایک مکان
کے دروازے پر پہنچی۔

مرزا رسوا صاحب! آپ سمجھے یہ کون سا بازار تھا؟ یہ وہ بازار تھا جہاں میری عصمت فروشی کی دکان تھی یعنی چوک۔ اور یہ وہ مکان تھا جہاں سے ذلت عزت بدنامی نیکنامی۔ زرد روئی سرخ روئی جو کچھ دنیا میں ملنا تھا ملا یعنی خانم جان کے مکان کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ تھوڑی دور پر زینہ تھا۔ زینہ پر سے چڑھ کے اوپر گئی۔

مکان کے صحن میں سے ہو کے صدر دالان کے داہنی طرف ایک دالان وسیع میں خانم جان کے پاس گئی۔

خانم صاحب کو آپ نے دیکھا ہوگا اس زمانے میں ان کا سن قریب پچاس برس کے تھا۔ کیا شاندار بڑھیا تھی۔ رنگ تو سانولا تھا مگر ایسی بھاری بھرکم جامہ زیب عورت دیکھی نہ تھی۔ بالوں کے آگے کی لٹیں بالکل سفید تھیں۔ ان کے چہرے پر بھلی معلوم ہوتی تھیں ململ کا دوپٹہ سفید کیسا باریک چنا ہوا کہ شاید و باید۔ اودے مشروع کا پاجامہ بڑے بڑے پائنچے۔ ہاتھوں میں موٹے موٹے سونے کے کڑے۔ کلائیوں میں پھنسے ہوئے کانوں میں سادی دو انتیاں لاکھ لاکھ بناؤ دیتی تھیں۔ بسم اللہ کی رنگت، ناک نقشہ ہو بہو انھیں کا سا تھا مگر وہ نمک کہاں۔ اس وقت کی صورت خانم کی مجھے آج تک یاد ہے۔ پلنگڑی سے لگی ہوئی قالین پر بیٹھی ہیں۔

کنول روشن ہے بڑا سا نقشی پاندان آگے کھلا ہوا رکھا ہے۔ پیچوان پی رہی ہیں سامنے ایک سانولی سی لڑکی (بسم اللہ جان) ناچ رہی ہے۔ ہمارے جانے کے بعد ناچ موقوف ہوا سب لوگ کمرے سے چلے گئے۔ معاملہ تو پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔

خانم جان: "یہی چھوکری ہے؟"

دلاور خاں: "جی ہاں"

مجھے پاس بلایا۔ چمکار کے بٹھایا، ماتھا اٹھا کے صورت دیکھی۔

خانم جان: "اچھا پھر جو ہم نے کہہ دیا ہے وہ موجود ہے اور دوسری چھوکری کیا ہوئی؟"

پیر بخش: "اس کا تو معاملہ ہو گیا۔"

خانم: "کتنے پہ؟"

پیر بخش: "دو سو پہ"

خانم: "اچھا۔ خیر۔ کہاں ہوا؟"

پیر بخش :" ایک بیگم صاحبہ نے اپنے صاحبزادے کے واسطے مول لینا ہے۔"
خانم :" صورت شکل کی اچھی ہے۔ اس قدر ہم بھی دے نکلتے۔ مگر تم نے جلدی کی۔"
پیر بخش :" میں کیا کروں۔ میں نے تو بہت سمجھایا میرے سالے نے نہ مانا۔"
دلاور خاں :" صورت تو اسکی بھی اچھی ہے۔ آگے آپ کی پسند۔"
خانم :" خیر آدمی کا بچہ ہے۔"
دلاور خاں :" اچھا جو کچھ ہے آپ کے سامنے حاضر ہے۔
خانم :" اچھا تمھاری ہی ضد سہی۔" یہ کہکے حسینی کو آواز دی۔
حسینی گدبدی سی سانولی ادھیڑ عورت سامنے آکھڑی ہوئی۔
خانم :" حسینی!"
حسینی :" خانم صاحب"
خانم :" صندوقچہ لاؤ۔"
حسینی گئی صندوقچہ لے آئی۔ خانم صاحبہ نے صندوقچہ کھولا۔ بہت سے روپئے دلاور خاں کے سامنے رکھ دیے بعد ازاں معلوم ہوا کہ سوا سو روپئے تھے۔
ان میں سے کچھ روپئے پیر بخش نے گن کے اپنے رومال میں باندھے سنا ہے کہ پچاس روپئے، باقی دلاور خاں مردے نے اپنے ڈب میں رکھے۔ دونوں سلام کر کے رخصت ہوئے۔ اب کمرے میں خانم صاحب ہیں اور بوا حسینی اور میں ہوں۔
خانم صاحب۔ (حسینی سے) "حسینی! یہ چھوکری اتنے داموں کی کچھ مہنگی تو نہیں معلوم ہوئی۔"
حسینی :" مہنگی۔ میں کہتی ہوں سستی۔"
خانم :" سستی بھی نہیں ہے۔ خیر ہوگا۔ صورت تو بھولی بھولی ہے۔ خدا جانے کس کی لڑکی ہے۔ ہائے۔ ماں باپ کا کیا حال ہوا ہوگا۔ خدا جانے کہاں سے موئے پکڑ لاتے ہیں۔ ذرا ابھی خوف خدا نہیں۔"
"بوا حسینی! ہم لوگ بالکل بے قصور ہیں۔ عذاب ثواب انھیں موؤں کی گردن پر ہوتا ہے۔ ہم سے کیا۔ آخر یہاں نہ بکتی کہیں اور بکتی۔"
حسینی :" خانم صاحب! یہاں پھر اچھی رہے گی۔ آپ نے سنا نہیں بیویوں میں لونڈیوں کی کیا گتیں ہوتی ہیں۔"
خانم صاحبہ۔ سنا کیوں نہیں۔ اے ابھی اس دن کا ذکر ہے سنا تھا سلطان جہاں بیگم نے اپنی لونڈی

کو کہیں میاں سے بات کرتے دیکھ لیا تھا۔ چمٹوں سے داغ کے مار ڈالا۔"

حسینی :" دنیا میں جو چاہیں کریں قیامت کے دن ایسی بیویوں کا منہ کالا ہوگا۔"

خانم :" منہ کالا ہوگا۔ جہنم کے کندے پڑیں گے۔"

حسینی :" خوب ہوگا۔ موئیوں کی یہی سزا ہے۔

اس کے بعد بوا حسینی نے بڑی منت سے کہا۔

" بیوی یہ چھوکری تو مجھے دید یجئے۔ میں پالوں گی۔ مال آپ کا ہے خدمت میں کروں گی۔"

خانم :" تمہیں پالو۔"

اب تک بوا حسینی کھڑی ہوئی تھیں۔ اس گفتگو کے بعد میرے پاس بیٹھ گئیں مجھ سے باتیں کرنے لگیں۔

حسینی :" بچی! تو کہاں سے آئی ہے؟"

میں۔ (روکے) " بنگلے سے۔"

حسینی۔ (خانم سے) " بنگلا کہاں ہے؟"

خانم :" اے ہے کیا نئی ہو؟ فیض آباد کو بنگلا بھی کہتے ہیں۔"

حسینی۔ (مجھ سے) " تمہارے ابا کا کیا نام ہے؟"

میں :" جمعدار۔"

خانم :" تم بھی غضب کرتی ہو۔ بھلا وہ نام کیا جانے۔ ابھی بچہ ہے۔"

حسینی :" اچھا تمہارا نام کیا ہے؟"

میں :" امیرن۔"

خانم :" بھئی یہ نام تو ہمیں پسند نہیں ہم تو امراؤ کہہ کے پکاریں گے۔"

حسینی :" سنا بچی! امراؤ کے نام پر تم بولنا۔ جب بیوی کہیں کہ " امراؤ " تم کہنا۔ جی۔"

اس دن سے امراؤ میرا نام ہوگیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد جب میں رنڈیوں کے شمار میں آئی۔ لوگ امراؤ جان کہنے لگے۔

خانم صاحبہ مرتے دم تک امراؤ کہا کیں۔ بوا حسینی امراؤ صاحب کہتی تھیں۔ اس کے بعد بوا حسینی مجھے اپنی کوٹھری میں لے گئیں۔ اچھا اچھا کھانا کھلایا۔ مٹھائیاں کھلائیں منہ ہاتھ دھلایا۔ اپنے پاس سلا رکھا۔

آج آج رات کو میں نے ماں باپ کو خواب میں دیکھا۔ جیسے ابا نوکری پر سے آئے ہیں مٹھائی کا دونا ہاتھ میں ہے۔ چھوٹا بھائی سامنے کھیل رہا ہے۔ اس کو مٹھائی کی ڈلیاں نکال کے دیں۔ مجھے پوچھ رہے ہیں جیسے میں دوسرے دالان میں ہوں۔ اماں باورچی خانے میں ہیں۔ استنے میں ابا کو جو دیکھا دوڑ کے لپٹ گئی۔ رو رو کے اپنا حال کہہ رہی ہوں۔

خواب میں اتنا روئی کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ بوا حسینی نے بیدار کیا۔ آنکھ جو کھلی کیا دیکھتی ہوں نہ وہ گھر ہے نہ دالان۔ ابا ہیں نہ اماں۔ بوا حسینی کی گود میں پڑی رو رہی ہوں۔ بوا حسینی آنسو پونچھ رہی ہیں۔ چراغ روشن تھا۔ میں نے دیکھا کہ بوا حسینی کے آنسو بھی برابر جاری ہیں۔

واقعی بوا حسینی بڑی نیک ذات عورت تھی۔ اس نے مجھ پر وہ شفقت کی چند ہی روز میں میں اپنے ماں باپ کو بھول گئی اور بھولتی نہ تو کرتی کیا۔ اوّل تو مجبوری دوسرے نئے ڈھنگ نئے رنگ۔ اچھے سے اچھا کھانے کو۔ کھانا وہ جن کے ذائقے سے کبھی آگاہ نہ تھی۔ کپڑے وہ جو میں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ تین لڑکیاں بسم اللہ جان خورشید جان۔ امیر جان ساتھ کھیلنے کو۔ دن رات ناچ گانا، جلسے تماشے۔ میلے باغوں کی سیر۔ وہ کون سا ایسا عیش کا سامان تھا جو مہیا نہ تھا۔

مرزا صاحب! آپ کہیں گے کہ میں بڑے کٹّر دل کی تھی کہ بہت جلد اپنے ماں باپ کو بھول کر کھیل کود میں پڑ گئی۔ اگرچہ میرا سن بہت کم تھا مگر خانم کے مکان میں آنے کے ساتھ ہی میرے دل کو آگاہی سی ہو گئی کہ اب مجھے عمر بھر یہیں بسر کرنا ہے جیسے نئی دلھن اپنی سسرال جا کے سمجھ لیتی ہے کہ میں یہاں ایک دو دن کے لئے نہیں بلکہ مرنے اور بھرنے کے لئے آئی ہوں۔ ٹھیک وہی میرا حال تھا۔ راستے میں موئے ڈکیتوں کے ہاتھ سے وہ ایذا اٹھائی تھی کہ خانم کا مکان میرے لیے بہشت تھا۔ ماں باپ کے ملنے کو میں بالکل ناممکن سمجھ چکی تھی اور جو چیز ناممکن سمجھی جاتی ہے اس کی آرزو باقی نہیں رہتی۔ اگرچہ فیض آباد لکھنؤ سے صرف ۴۰ کوس ہے مگر اس زمانے میں مجھے بے انتہا دور معلوم ہوتا تھا۔ بچپن کی سمجھ میں اور اب میں بڑا فرق معلوم ہوتا ہے۔

اک حال میں انساں کی بسر ہو نہیں سکتی
اب رنگ طبیعت کا بدل جائے تو اچھا

مرزا رسوا صاحب! خانم کا مکان تو آپ کو یاد ہو گا۔ کس قدر وسیع تھا۔ کتنے کمرے تھے۔ ان سب میں رنڈیاں (خانم کی نوچیاں) رہتی تھیں۔ بسم اللہ (خانم کی لڑکی) خورشید میری ہمسنیں تھیں۔ ان کی ابھی رنڈیوں میں گنتی نہ تھی۔ ان کے علاوہ دس گیارہ ایسی تھیں جو الگ الگ کمروں میں رہتی تھیں۔ ہر ایک کا عملہ جدا تھا۔ ہر ایک کا دربار علیحدہ ہوتا تھا۔ ایک سے ایک خوبصورت تھی۔ سب گہنے پاتے سے آراستہ۔ ہر وقت بنی ٹھنی تولواں جوڑے پہنے سادے کپڑے جو ہم لوگ روزمرہ پہنے رہتے تھے وہ اور رنڈیوں کو عید بقرعید میں نہیں نصیب ہوتے۔ خانم کا مکان تھا کہ ایک پرستان تھا۔ جس کمرے میں جا نکلو سوائے ہنسی مذاق گانے بجانے کے کوئی اور چرچا نہ تھا۔ اگرچہ میں کمسن تھی مگر پھر بھی عورت ذات بڑی ہوشیار ہوتی ہے اپنے مطلب کی سمجھتی تھی۔ بسم اللہ۔ خورشید کو گاتے ناچتے دیکھ کے میرے دل میں خود بخود ایک اُمنگ سی پیدا ہوئی۔ بجائے خود گنگنانے اور تھرکنے لگی۔ اسی عرصہ میں میری بھی تعلیم شروع ہو گئی۔ میری طبیعت فن موسیقی سے بہت ہی مناسب پائی گئی۔ آواز بھی پکے گانے کے لائق تھی۔ سرگم صاف ہونے کے بعد اُستاد نے آستائی شروع کرا دی۔ استاد جی بہت اصول سے تعلیم دیتے تھے۔ ہر ایک راگ کا سُر بیورہ زبانی یاد کرایا جاتا تھا اور وہی گلے سے نکلواتے تھے۔ مجال نہ تھی کوئی سُر کومل سے اُت کومل سُدھ سے اسُدھ یا تور سے تور تر ہو جائے۔ اور میری بھی حجتیں کرنے کی عادت تھی۔ پہلے تو استاد جی (خدا کرے ان کی روح شرمندہ نہ ہو) ٹال دیا کرتے تھے۔

ایک دن خانم صاحب کے سامنے میں رام کلی گا رہی تھی۔ دھیوت سر پہ لگا گئی استاد جی نے نہ ٹوکا۔ خانم صاحب نے پھر اسی کو کہلوایا۔ میں نے پھر اسی طرح کہا۔ استاد جی پھر باخبر نہ ہوئے۔ خانم صاحب نے گھور کے دیکھا۔ میں استاد جی کا منہ دیکھنے لگی انھوں نے سر جھکا لیا۔ پھر تو خانم نے ان کو آڑے ہاتھوں لیا۔

خانم: "استاد جی! یہ کیا تھا۔ رام کلی میں او چار دھیوت سے ہے اور وہی سُر ٹھیک نہیں۔ میں آپ سے پوچھتی ہوں دھیوت کومل ہے یا شدھ؟"

استاد۔ کومل۔

خانم۔ او چھوکری! تو نے کیا کہا تھا۔

استاد۔ سدھ

خانم: "پھر آپ نے ٹوکا کیوں نہیں۔؟"

استاد: "کچھ مجھے خیال نہیں رہا۔"

خانم: "واہ۔ خیال کیوں نہیں رہا۔ اسی لئے میں نے دوبارہ کہلوایا۔ پھر بھی آپ منہ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھے رہے۔ آپ اسی طرح چھوکریوں کو تعلیم دیتے ہیں۔ ابھی کسی سمجھدار کے سامنے اسی طرح گاتی تو کیا وہ میرے جنم کو تھوکتا۔"

استاد جی اس وقت تو بہت ہی خفیف ہوئے چپ ہو رہے مگر دل میں بات لئے رہے استاد جی اپنے کو نائک سمجھتے تھے اور تھے بھی ایسے ہی۔ اس دن سے خانم کا ٹوکنا ان کو بہت ہی ناگوار ہوا۔

ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ میں سوہا گا رہی ہوں۔ خانم بھی موجود ہیں۔ میں نے استاد جی سے پوچھا گندھار اس میں کومل ہے یا ات کومل؟

استاد جی۔ "ات کومل"

خانم: "خاں صاحب ماشاء اللہ۔ یہ میرے سامنے۔"

استاد۔ "کیوں؟"

خانم: "اور پھر آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کیوں؟ سوہا میں گندھار ات کومل ہے؟ بھلا آپ تو کہیئے۔"

استاد: "کہنے لگے، گندھار کومل لگا گئے۔"

خانم: "بس آپ ہی قائل ہو جئیے۔ خود آپ کومل کہیں اور چھوکری کو بہکاتے ہیں یا مجھے کستے ہیں۔ خاں صاحب میں کچھ عطائی نہیں۔ خاک چاٹ کے کہتی ہوں گلے سے ادا ہو مگر ان کانوں نے کیا نہیں سنا۔ میں بھی ایسے ویسے گھرانے کی شاگرد نہیں ہوں۔ میاں غلام رسول کو آپ جانتے ہوں گے۔ ان باتوں سے کیا فائدہ۔ اگر بتانا ہو تو دل سے بتائیے نہیں تو معاف کیجئے میں اور کوئی بندوبست کر لوں گی۔ چھوکریوں کو غارت نہ کیجئے۔"

استاد جی: "بہت خوب۔"

وہ یہ کہہ کے اٹھ گئے کئی دن نہیں آئے۔ خانم خود تعلیم دینے لگیں۔ چند روز کے بعد خلیفہ جی

بیچ میں بڑے قسما قسمی ہو کے ملاپ ہوگیا۔ اس دن سے استاد جی ٹھیک ٹھیک بتانے لگے بتاتے نہ تو کرتے کیا۔ وہ خانم کو اتائی سمجھتے تھے مگر پھر حیرت رہی مجھے کہ خانم زیادہ جانتی ہیں یا استاد جی۔ کیونکہ بہت سی باتیں جو خانم سے معلوم ہوئیں استاد جی ان کو نہ بتا سکتے تھے۔ یا جان بوجھ کے بتاتے نہ تھے۔ لاکھ قسما قسمی ہو چکی تھی مگر پھر بھی یہ لوگ گُر کی باتیں نہیں بتاتے، مجھے کچھ ایسا شوق ہو گیا تھا کہ جہاں کسی بات میں شک ہوا یا میں سمجھتی کہ استاد جی ٹالتے ہیں، استاد جی کے جانے کے بعد خانم صاحب سے پوچھ لیتی تھی۔ وہ بھی میرے اس شوق سے بہت ہی خوش ہوتی تھیں۔ بسم اللہ کو لعنتیں دیا کرتی تھیں۔ بسم اللہ پر بہت محنت ہوئی مگر پہاڑی، ٹھمری کے سوا کچھ نہ آیا۔ اس پر بھی میں ھادی رہی۔ خورشید کی آواز اچھی نہ تھی صورت پری کی گلا ایسا جیسے پھٹا بانس۔ ہاں ناچنے میں اچھی تھی۔ اور یہی اس نے سیکھا بھی تھا۔ اُن کا مجرا صرف ناچ کا ہوتا تھا۔ یوں گانے کو ایک آدھ چیز سیدھی سادی گا بھی دیتی تھیں کہ گانے کا نام ہو جائے۔

خانم کی نوچیوں میں بیگا جان گانے میں فرد تھیں۔ مگر صورت وہ کہ رات کو دیکھو تو ڈر جاؤ۔ سیاہ جیسے اُلٹا توا۔ اس پر چیچک کے داغ۔ پاؤ بھر قیمہ بھر دو تو سما جائے۔ لال لال آنکھیں بھدی ناک بیچ میں سے پچکی ہوئی۔ موٹے موٹے ہونٹھ بڑے بڑے دانت۔ فربہ انتہا سے زیادہ۔ اس پر ٹھگنا قد بونی، ہتھنی کی لوگ پھبتی کہتے تھے۔ مگر قیامت کا گلا تھا معلومات بہت اچھی تھی۔ موریچھنا انھیں کے گلے سے نکلتے سنا۔ میں جب ان کے کمرے میں جا نکلتی مارے فرمائشوں کے دق کر دیتی تھی۔

میں: "باجی ہاں! ذرا سرگم تو کہنا۔"
بیگا: "سنو۔ سا۔ رے گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی۔"
میں۔ "میں یہ نہیں مانتی۔ سُرتیاں الگ کر کے بتاؤ۔"
بیگا۔ "لڑکی! تو تو بہت ستاتی ہے۔ اپنے استاد جی سے نہیں پوچھتی۔"
میں: "اللہ باجی تمھیں بتا دو۔"
بیگا: "سا رے گا ما پا دھا نی۔ دیکھ بائیس ہوئیں۔"
۴ ۳ ۲ ۴ ۴ ۳ ۲
میں۔ (شرارت سے) "اونھ۔ میں نے نہیں گنیں۔ پھر کہو۔"
بیگا: "جا اب نہیں کہتی۔"
میں: "واہ۔ میں تو کہلا کے چھوڑوں گی۔"

بیگا۔ "دیپک (وہی کہدیا) لے اب ترتا۔"

میں۔ "ہاں اب کی گنیں۔ نکھادیں دو برس ناہ۔"

بیگا۔ "ہاں دو۔"

میں۔ "تو ٹھیک بائیس ہوئیں۔ اچھا لے اب تینوں گرام کہدو۔"

بیگا۔ "لے اب چلئے۔ کل آئیے گا۔"

میں۔ "اچھا طنبورہ اٹھالاؤں کچھ گاؤ۔"

بیگا۔ "کیا گاؤں۔"

میں۔ "دھناسری۔"

بیگا۔ "کیا گاؤں۔ آستائی۔ دُھرپد۔ ترانہ؟"

میں۔ "اللہ باجی دُھرپد گاؤ۔"

بیگا۔ "لے سُن۔

تن کی تپ تب ہی مٹے جب پیا کو درشٹ بھر دیکھوں گی
جب درشن پاؤں گی ان کو تب ہی جی جنم اپنا لیکھوں گی
اشٹ جام دھیان مو ہے واکو رہت ہے نہ جانوں کب درشن تھیلونگی
جو کو ہو بر بھو پیارے سے ملاوے واکے پائن میں سیس نگونگی"

خانم جان کی نوچیوں کو صرف ناچ گانے کی تعلیم نہیں دی جاتی تھی بلکہ لکھنے پڑھنے کے لئے مکتب بھی تھا۔ مولوی صاحب نوکر تھے جب دستور ہیں بھی مکتب میں۔ کبھی کبھی مولوی صاحب کا نورانی چہرہ سفید کتروان داڑھی۔ صوفیانہ لباس ہاتھ میں عمدہ فیروزے اور عقیق کی انگوٹھیاں۔ خاک پاک کی تسبیح اس میں سجدہ گاہ بندھی ہوئی۔ ہرونی کی جریب۔ چاندی کی شام بہت ہی نفیس۔ ڈیڑھ خمہ حقہ۔ افیون کی ڈبیہ پیالی۔ غرضکہ جملہ تبرکات آج تک نظر میں ہیں۔ کیا شگفتہ مذاق تھا وضعدار بھی ایسے کہ کسی زمانے میں بوا حسینی سے حسب اتفاق کچھ رسم ہوگیا تھا آج تک اُسے نباہے جاتے تھے۔ بوا حسینی بھی انھیں دین و دنیا کا شوہر سمجھتی تھیں۔ بڑھیا بڈھے میں اس مزے کی باتیں ہوتی تھیں کہ جوانوں کو حوصلہ ہوتا تھا مکان کہیں زید پور کی طرف تھا۔ گھر پر خدا کے دیئے گاؤں گراؤں۔ مکان۔ بیوی جوان لڑکے لڑکیاں سب کچھ موجود تھا۔ مگر خود جب سے لکھنؤ میں تحصیل علم کے لئے تشریف لائے یہیں رہے۔ شاید دو چار مرتبہ گئے ہونگے۔ اکثر عزیز ملنے کو یہیں چلے آتے تھے۔ گھر سے

کبھی کبھی کچھ آیا بھی کرتا تھا۔ دس روپیہ خانم صاحب دیتی تھیں۔ یہ سب بوا حسینی کو ملتا تھا کھانے پینے حقہ افیون کی تاک بوا حسینی لیتی تھیں۔ تحویلدار بوا حسینی تھیں۔ کپڑا بوا حسینی بنوا دیتی تھیں۔ خانم صاحب بھی مولوی صاحب کو بہت مانتی تھیں بلکہ مولوی صاحب کی وجہ سے بوا حسینی کی عزت کرتی تھیں۔

یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ میری پرورش بوا حسینی نے اپنے ذمہ لی تھی اس لئے مجھ پر مولوی صاحب کی توجہ خاص تھی۔ یہ تو میں اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتی کہ مجھے کیا سمجھتے تھے پاس ادب مانع ہے اور لڑکیوں سے زیادہ مجھ پر تاکید تھی۔ مجھ ایسی کندۂ ناتراش کو انھوں نے آدمی بنایا۔ یہ انھیں کی جوتیوں کا صدقہ ہے کہ جس امیر و رئیس کی محفل میں گئی حیثیت سے زیادہ میری عزت ہوئی۔ انھیں کی بدولت آپ ایسے لائق فائق صاحبوں کے جلسے میں منہ کھولنے کی جرأت ہوئی۔ شاہی درباروں میں شرکت کا فخر حاصل ہوا۔ اعلیٰ درجے کی بیگمات کے محل میں گزر ہوا۔

مولوی صاحب نے بہت ہی شفقت سے مجھے پڑھایا تھا۔ "الف بے" ختم ہونے کے بعد "کریما" "ماقیما"۔ محمود نامہ۔ صرف رواں پڑھا کے آمدنامہ یاد کرادیا اس کے بعد گلستاں شروع کرادی۔ دو سطریں پڑھاتے تھے۔ سبق حفظ کرایا جاتا تھا خصوصاً اشعار۔ لفظ لفظ کے معنی فقرے کی ترکیب نوک زبان تھی۔ لکھنے پڑھنے پر بھی محنت کی۔ املا درست کرایا گیا۔ خط لکھوائے گئے۔ گلستاں کے بعد اور کتابیں فارسی کی پانی ہوگئی تھیں۔ سبق اس طرح ہوتا تھا جیسے آموختہ پڑھایا جاتا ہے۔ عربی کی صرف و نحو اور دو ایک رسالے منطق کے پڑھے۔ سات آٹھ برس مولوی صاحب کے پاس پڑھتی رہی۔ شاعری کے شوق کی ابتدا اور انتہا سے آپ خود واقف ہیں۔ اس کے بیان کی کوئی ضرورت نہیں۔

ہم نہیں ان میں جو پڑھ لیتے ہیں طوطے کی طرح
مکتب عشق و وفا تجربہ آموز بھی تھا

مکتب میں مجھ سمیت تین لڑکیاں تھیں اور ایک لڑکا تھا۔ گوہر مرزا حد کا شریر اور بدذات۔ سب لڑکیوں کو چھیڑا کرتا تھا۔ کسی کو منہ چڑھا دیا کسی کے چٹکی لے لی۔ اس کی چوٹی پکڑ کے کھینچ لی۔ اس کے کان دکھا دیے دو لڑکیوں کی چوٹی ایک میں جکڑ دی۔ کہیں

کتاب پر دوات اُلٹ دی ۔ غرضکہ اس کے مارے ناک میں دم تھا ۔ لڑکیاں بھی خوب دھینیاتی تھیں اور مولوی صاحب بھی قرار واقعی سزا دیتے تھے مگر اپنی کرنی بانی سے نہ چوکتا تھا۔ سب سے بڑھ کے میری گت بناتا تھا کیونکہ میں سب سے ایلی اور گیگلی سی تھی اور مولوی صاحب کے دباؤ میں بھی رہتی تھی ۔ میں نے مولوی صاحب سے کہہ کہہ کے مار پٹوائی مگر بے غیرت کسی طرح باز نہ آیا ۔ آخر میں بھی چٹکیاں کھاتے کھاتے عاجز آ گئی میری فریاد پر مولوی صاحب اس کو بہت ہی بے دردی سے سزا دیتے تھے کہ خود مجھے ترس آ جاتا تھا ۔

گوہر مرزا کے اس مکتب میں آنے کا سبب بھی بوا حسینی تھیں ۔

نواب سلطان علی خاں ایک بڑے عالی خاندان رئیس تھے ۔ توپ دروازہ میں رہتے تھے ۔ ان سے اور بنو ڈومنی سے رسم تھا ۔ انھیں سے یہ لڑکا پیدا ہوا اگرچہ بنو سے اور نواب صاحب سے اب تک ملاقات ہوئے مدت گزر گئی تھی مگر دس روپیہ ماہ بماہ لڑکے کی پرورش کے دیے جاتے تھے ۔ اور بیگم صاحب سے چوری چھپے کبھی کبھی بلا کے دیکھ بھی لیا کرتے تھے ۔ بنو قاضی کے باغ کی رہنے والی تھیں وہیں بوا حسینی کے بھائی کا گھر تھا ۔ کھڑکی درمیان میں تھی ۔ گوہر مرزا بچپنے ہی سے ذات شریف تھے ۔ تمام محلہ کا ناک میں دم تھا ۔ کسی کے گھر میں ڈھیلا پھینکا یا کسی لڑکے سے چڑ کوؤں کا پنجرہ دیکھنے کو مانگا اس نے دے دیا ۔ آپ نے کھڑکی کی تیلی کھول دی ۔ سب چڑکوے پھر سے اڑ گئے غرض کہ طرح طرح کے آزار دیتے تھے ۔ آخر ماں نے عاجز آ کر محلہ کی مسجد میں ایک مولوی صاحب کے پاس بٹھا دیا یہاں بھی آپ نے اپنے ہتھکنڈے نہ چھوڑے ۔ تمام ہم مکتب لڑکوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا ۔ اس کے کرتے میں مینڈک چھوڑ دیا ۔ اس کی ٹوپی پھاڑ ڈالا ایک لڑکی کی جوتی اٹھا کے کوئیں میں ڈال دی ۔

ایک دن مولوی صاحب نماز پڑھ رہے تھے ۔ حضرت نے ان کا نیا جڑھواں بدھ حوض میں پیرا دیا ۔ خود بیٹھے ہوئے سیر دیکھ رہے ہیں ۔ اتنے میں کہیں مولوی صاحب سر پر پہنچ گئے ۔ اب تو گوہر مرزا کی خوب مرمت ہوئی ۔ مولوی صاحب نے مارے طمانچے کے منہ لال کر دیا اور کان پکڑے ہوئے بنو کے گھر پر لے آئے ۔ دروازے پر سے کے کہا "لو صاحب اپنا لڑکا ۔ لو ۔ ہم اسے نہ پڑھائیں گے" یہ کہہ کے مولوی صاحب تو اُٹھ گئے ۔ گوہر مرزا مظلوم صورت بنائے ہوئے روتا ہوا گھر میں آیا ۔ اس وقت اتفاق

حسینی بنو سے بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھیں۔ لڑکے کا جو یہ حال دیکھا، آپ کو بہت ہی غصہ آیا۔ لڑکے کے کرتوتوں سے تو آگاہ نہیں۔ مولوی صاحب کو برا بھلا کہنے لگیں۔

بوا حسینی: "اے ہے مولوی کا ہے کو ہوا قصائی ہے۔ لڑکے کا منہ مارے طمانچوں کے سجا دیا۔ اسے تو کان بھی لہولہان کر دے۔ بی بی ایسے مولوی سے کوئی تو جو پڑھوائے۔ آخر اور مولوی صاحب بھی تو پڑھاتے ہیں۔ کیسا چمکار کے دلار سے پڑھاتے ہیں۔" بنو نے سنتے ہی کہا "پھر بوا حسینی اس کو بلا سے اپنے مولوی صاحب ہی کے پاس لے جاؤ۔"

بوا حسینی: "لے تو جاؤں مگر دور بہت ہے۔"

بنو: "تمہارے بھائی کے ساتھ صبح کو بھجوا دیا کرو نگی۔ شام کو بلا لیا کروں گی۔"

بوا حسینی: "اچھا تو بھجوا دیا کرو۔"

مولوی صاحب سے کچھ پوچھنا نہ تھا۔ اس لئے کہ بوا حسینی کو اپنی حسن خدمت پر پورا بھروسا تھا۔ جانتی تھیں کہ مولوی صاحب انکار تو کریں گے نہیں۔

دوسرے دن علی بخش (بوا حسینی کے بھائی کا نام تھا) گوہر مرزا کو ساتھ لئے مٹھائی کا خوان سر پر رکھے بوا حسینی کے پاس پہنچے۔ بوا حسینی نے خوشی خوشی مٹھائی تقسیم کی۔ لڑکے کو مولوی صاحب کے پاس بٹھا دیا۔

گوہر مرزا سب سے زیادہ مجھی کو ستاتا تھا۔ دن رات دھما چوکڑی کا شغل رہتا تھا۔ مولوی صاحب نے اس کو بہت پیٹا بھی مارا مگر اس نے مجھے ستانا نہ چھوڑا۔ اسی طرح کئی برس گزر گئے۔ آخر میرے اس کے صلح ہو گئی۔ یا یوں کہئے کہ میں اس کے ستانے کی خوگر ہو گئی۔

گوہر مرزا کے اور میرے سن میں کچھ ہی فرق ہوگا۔ شاید وہ مجھ سے دو ایک سال بڑا ہو۔ جس زمانے کا حال لکھ رہی ہوں میرا سن کوئی تیرہ برس کا ہوگا اور گوہر مرزا کو چودھواں یا پندرھواں سال تھا۔

گوہر مرزا کے ستانے سے اب مجھ کو مزا آنے لگا۔ اس کی آواز بہت اچھی تھی ڈومنی کا بیٹا، ادھر ہی سے داد۔ بتانے میں مشاق۔ بوٹی بوٹی پھڑکتی تھی۔ ادھر میں لے سر سے واقف۔ جب مولوی صاحب مکتب میں نہ ہوتے تھے خوب جلسے ہوتے تھے۔ کبھی میں گانے لگی وہ بتانے لگا۔ کبھی وہ گا رہا ہے میں تال دے رہی ہوں۔ گوہر مرزا کی آواز پر اور بڑی بڑی بھی فریفتہ تھیں۔ ہر ایک گھر میں بلایا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ میرا جانا بھی ایک طرح ضرور دریافت تھی کیونکہ بغیر میری اس کی سنگت کے لطف نہ آتا تھا۔

سب سے زیادہ امیر جان اس کے گانے پر عاشق تھیں۔

مرزا صاحب! آپ کو تو امیر جان یاد ہوں گی۔

رسوا: ''یاد ہیں۔ کہے جاؤ۔''

امیر جان کا وہ زمانہ جب مفتخر الدولہ بہادر کی ملازم تھیں۔ اللہ رے جوبن کے ٹھاٹھ۔ وہ اُٹھتی ہوئی جوانی ؎

کھلتی کھلتی وہ چمپئی رنگت — بھولی بھولی وہ موہنی صورت

بانکی بانکی ادائیں ہوش رُبا — ترچھی ترچھی نگاہیں قہر خدا

بوٹا سا قد، چھریرا بدن، نازک نازک ہاتھ پاؤں۔

رسوا: ''اب تو میں نے جب ان کو دیکھا ہے انگلی پر ڈالنے کے لائق تھیں۔ ایسی بری صورت ہوگئی تھی کہ دیکھا نہیں جاتا تھا۔''

امراؤ: ''کہاں دیکھا تھا؟''

رسوا: ''انھیں کے گھر میں دیکھا تھا جن کے کمرے کے سامنے شاہ صاحب گیروے کپڑے پہنے ہزار دانے کی تسبیح ہاتھ میں لئے کھڑے رہتے تھے۔ اُدھر سے جو نکلتا تھا اس کو سلام کر لیتے تھے۔ کبھی کسی سے سوال نہیں کرتے تھے۔''

امراؤ: ''سمجھ گئی۔ وہ شاہ صاحب ان کے عاشقوں میں تھے۔''

رسوا: ''جی ہاں۔ کیا میں نہیں جانتا۔''

امراؤ: ''اچھا! تو آپ وہیں رہتے ہیں۔''

رسوا: ''ان کی مصاحبت میں ہوں۔''

امراؤ: ''ادھر ان کا حال کیا ہے؟''

رسوا: ''وہ ایک حکیم صاحب پر مرتی ہیں۔''

امراؤ: ''کون حکیم صاحب؟''

رسوا: ''آپ نہیں جانتیں۔ نام بھی بتا دونگا۔ تب بھی آپ نہ سمجھیں گی بھر کیا فائدہ۔''

امراؤ: ''خیر کچھ بتا دیجئے۔ میں سمجھ جاؤں گی۔''

رسوا: ''وہ نخاس ....''

امراؤ: ''خوب جانتی ہوں یہی امیر جان اس زمانہ میں ایسی تھیں کہ لوگ اُن کو ایک نظر دیکھنے کی آرزو رکھتے تھے۔ مزاج میں وہ تمکنت تھی کہ ایسے ویسوں کا تو ذکر ہی کیا ہے اچھے

اچھوں کی دعا قبول نہ ہوتی تھی۔ ٹھاٹھ بھی ایسے ہی تھے۔ چار چار مہریاں ساتھ ایک گرگڑی لئے ہے ایک کے ہاتھ میں پنکھا ہے۔ ایک لٹیا لیے۔ ایک کے پاس خاصدان ہے۔ خدمتگار وردیاں پہنے سواری کے ساتھ دوڑتے جاتے ہیں۔"

امیر جان گوہر مرزا کے گانے پہ عاشق تھیں۔ خود گانا دانا جانتی نہیں تھیں مگر گانا سننے کا بڑا شوق تھا۔

گوہر مرزا بچپنے ہی سے رنڈیوں کا کھلونا تھا۔ ہر ایک اس پر دم دیتی تھی۔ صورت شکل بھی پیار کرنے کے قابل تھی رنگ تو کسی قدر سانولا تھا مگر ناک نقشہ قیامت کا پایا تھا اس پر نمک اور جامہ زیبی، شوخی شرارت کوئی بات . . . .

رسوا: "کیوں نہ ہو۔ کس ماں کا بیٹا تھا"

امراؤ: "اہاہ۔ تو کیا آپ نے بنو کو دیکھا تھا؟"

رسوا۔ (مسکراتے ہوئے) "جی ہاں آپ ہی قیاس کر لیجئے"

امراؤ: "مرزا صاحب! آپ کے مذاق بھی کیا در پردہ ہوتے ہیں"

رسوا: "خیر! آپ نے تو پردہ فاش کر دیا"

امراؤ: "تو اچھا اب تھوڑی دیر مذاق ہی رہنے۔ میری سرگذشت کو آگ لگائیے"

رسوا: "مذاق کے لئے شب بھر باقی ہے۔ آپ اپنا قصہ کہیئے"

امراؤ: "دیکھئے دوسری ہتنی۔ اچھا سنئے"

صبح سے دس گیارہ بجے تک تو مولوی صاحب کے پاس سے کس کی مجال تھی کہ دم بھر کے لئے کہیں کھسک جائے۔ اس کے بعد مولوی صاحب خاصہ کھانے چلے جاتے تھے اس وقت ہم کو فرصت ملتی تھی۔ پھر ایک ایک کرہ ہے اور ہم ہیں۔ آج امیر جان کے پاس۔ کل جعفری کے کمرے میں پرسوں بتن کے یہاں۔ پھر جہاں جاؤ خاطر مدارات میوہ مٹھائیاں حقہ پان۔

رسوا: "آپ بچپن ہی سے حقہ پیتی ہیں؟"

امراؤ: "جی ہاں! گوہر مرزا کی دیکھا دیکھی مجھے بھی ہوس ہوئی تھی۔ شوقیہ پیتی تھی۔ پھر تو نگوڑی لت ہو گئی۔

رسوا: "گوہر مرزا صاحب تو چنڈو بھی پیتے تھے۔ عجب نہیں آپ نے اس میں بھی ان کی ہوس کی ہو۔"

امراؤ: "خدا نے اس سے تو آج تک بچایا مگر ہاں افیون کی قسم نہیں کھاتی وہ بھی اب شروع کی ہے۔ کربلا ئے معلیٰ سے آنے کے بعد نزلے کی شدت ہوتی آٹھ دن زکام رہتا تھا۔ حکیم صاحب نے کہا افیون کھاؤ کھانے لگی۔"

رسوا: "اور وہ چیز نزلے کی روکنے والی۔"

امراؤ: "اب اس کا ذکر نہ کیجئے۔"

رسوا: "کیا تائب ہو گئیں؟"

امراؤ: "مدت سے۔"

رسوا: "واقعی کمبخت کیا بری چیز ہے۔ اپنا تو یہ حال ہے سے

بعد توبہ کے بھی ہے دل میں یہ حسرت باقی
دے کے قسمیں کوئی اک جام پلا دے ہم کو

امراؤ: "ہائے کیا شعر کہا ہے مرزا صاحب۔ قسمیں دلانے کو تو میں موجود ہوں پینے نہ پینے کا آپ کو اختیار ہے۔"

رسوا: "آپ بھی شغل کیجئے گا؟"

امراؤ: "توبہ"

رسوا: "توبہ" ابر بھی ہے ہوائے سرد بھی ہے۔
پھر وہ یاد بخیر یاد بھی ہے۔"

امراؤ: "بے بس اب طبیعت کو روکئے۔ جمائیاں آنے لگیں۔ للہ اس ذکر کو جانے دیجئے۔"

رسوا: "جانے دیجئے۔"

امراؤ: "مذاق سے بھی معاف رکھئے۔"

اب نہ ہم منہ لگائیں گے اس کو
یاد آئی تو خیر یاد آئی

رسوا: "واللہ امراؤ جان کیا شعر کہا ہے۔"

امراؤ: "تسلیم۔"

دیکھ کر مشہد ادا ان کو
لالہ و گل کی سیر یاد آئی

رسوا: "ماشاء اللہ طبیعت زوروں پر ہے۔ کیوں نہ ہو عالم شباب کے ذکر کی یہ تاثیر ہے۔"

امراؤ: "جی نہیں۔ شراب کے ذکر کی یہ تاثیر ہے۔"

زاہد آج ہم کو کیونکر وہ شئے
جس سے ہے تم کو سیر یاد آئی

رسوا۔ "ہاہاہا۔ کیا قافیہ نکالا ہے۔ اور کہا بھی خوب"

کعبہ سے پھر کے ہم ہوئے گمراہ — پھر وہی راہ دیر یاد آئی

امراؤ: "اے کیا کہا یہ "کعبہ سے پھر کے"، کیا خوب کہا ہے۔ مرزا صاحب اسے مطلع نہ کر دیجئے"

پھر کے کعبہ سے سیر یاد آئی — پھر وہی راہ دیر یاد آئی

رسوا: "خاصہ"

امراؤ: "روش وحش و طیر یاد آئی — دشت وحشت کی سیر یاد آئی

رسوا: "یہ بھی مطلع برا نہیں ہے"

امراؤ: "یہ شعر ملاحظہ ہو"

ہم کو بنت العنب سے شکوہ ہے — کیوں ہمیں اس بغیر یاد آئی"

رسوا: "میں تو کہتا ہوں کہ طبیعت آج جودت پر ہے۔ اچھا یہ شعر سن لیجئے اور پھر اپنا قصہ دھرانا شروع کیجئے"

حلوا بھی ابر بھی گلزار بھی شراب بھی ہو — یہ سب بھی ہو مگر اک گلا سادہ شباب بھی ہو

امراؤ: "واہ مرزا صاحب! آپ نے تو دل کو مردہ کر دیا۔ خیر آمدم بر سر مطلب"

اسی طرح سے کئی برس میری زندگی کے خانم کے مکان پر گزرے۔ اس درمیان میں کوئی ایسا واقعہ نہیں گزرا جس کا بیان ضروری ہو۔

ہاں خوب یاد آیا۔ بسم اللہ کی مسی بڑے دھوم سے ہوئی۔ میری آنکھوں کے دیکھتے شاہی سے لیکر اب تک پھر ویسی مسی نہیں ہوئی۔ دلارام کی بارہ دری اس جلسے کے لئے سجی گئی تھی اندر سے باہر تک روشنی تھی۔ شہر کی رنڈیاں۔ ڈوم۔ ڈھاڑی۔ کشمیری بھانڈ سب تو تھے ہی دور دور سے ڈیرہ دار طوائفیں بلائی گئی تھیں۔ بڑے بڑے نامی گویے دلی تک سے آئے تھے۔ سات دن رات گانے بجانے کی صحبت رہی۔ خانم نے جیسا دل کھول کے حصے تقسیم کئے ہیں اس کا آج تک شہرہ ہے۔ بسم اللہ خانم کی اکلوتی لڑکی تھی جو کچھ نہ ہوتا کم تھا۔ نواب چھبن صاحب نے اپنی دادی نواب عمدۃ الخاقان بیگم کا ورثہ پایا تھا بہت ہی کمسن نواب زادہ تھا۔ خانم نے خدا جانے کن ترکیبوں سے کیا مارا۔ بے چارے پھنس ہی تو گئے۔ پچیس تیس ہزار روپئے نواب صاحب کے اسی جلسہ میں خرچ ہوئے۔ اس کے بعد بسم اللہ نواب صاحب کی ملازم ہوگئیں۔

مرزا رسوا صاحب! جو باتیں آپ مجھ سے پوچھتے ہیں ان کا میری زبان سے نکلنا سخت مشکل ہے۔ یہ سچ ہے کہ رنڈیاں بہت بے باک ہوتی ہیں مگر زمانہ خاص ہوتا ہے۔ سن کا تقاضا بھی کوئی چیز ہے۔ جوش جوانی کی وجہ سے جو باتیں اپنی حد سے گزر جاتی ہیں مگر آخرکار ان میں کمی ضرور ہونا چاہیئے تاکہ اعتدال قائم رہے۔ آخر رنڈیاں عورت ذات ہیں ان باتوں کے پوچھنے سے آپ کو کیا فائدہ۔

رسوا: "کچھ تو فائدہ ہے جو میں اصرار کر کے پوچھتا ہوں۔ اگر آپ خواندہ نہ ہوتیں تو شاید یہ سب عذر قابل سماعت ہوتے۔ پڑھے لکھوں کو ایسی بے جا شرم نہیں چاہیئے۔"

امراؤ: "اوئی! تو کیا پڑھنے سے آنکھوں کا پانی ڈھل جاتا ہے، یہ آپ نے خوب کہی۔

رسوا: "اچھا۔ اچھا تو آپ کہیئے فضول باتوں سے میرا وقت ضائع کیجئے

امراؤ: "کہیں کسی اخبار میں نہ چھپوا دیجئے گا۔"

رسوا: "اور آپ کیا سمجھی ہیں؟"

امراؤ: "ہائے فضیحت! تو یہ کہیئے مجھے بھی آپ اپنی طرح رسوا کریں گے۔"

رسوا: "خیر۔ اگر میرے ساتھ آپ رسوا ہوں گی تو کوئی قباحت نہیں۔"

رسوا سے کیوں ہے ہم سے محبت جتا کے تم — چھوڑوں گا اب نہ میں تمہیں رسوا کئے بغیر

امراؤ: "نوج آپ سے کوئی محبت کرے۔

زاہد سے گفتگو ہو کہ ناصح سے بحث ہو — بنتی نہیں ہے ذکر کسی کا کئے بغیر

رسوا: "کس کا شعر ہے؟"

امراؤ: "یہ آپ مجھ سے کیوں پوچھا کرتے ہیں۔"

رسوا: "ہاں بھلا۔ تو یہ کہیئے آپ نے بھی یہ غزل سنی ہے۔"

امراؤ: "وہ جاتے ہیں جان بیچ کے بازار عشق میں
ہم آئیں گے نہ حسن کا سودا کئے بغیر"

رسوا: "اور وہ شعر یاد ہے، تقاضا کئے بغیر"

وعدہ ہو یا کہ قول وہ ایسے ہیں نادہند — ملتا نہیں کچھ ان سے تقاضا کئے بغیر"

رسوا: "اور کوئی شعر یاد ہے؟"

امراؤ: "اور تو کوئی یاد نہیں آتا۔"

رسوا: "یہ تو بہت بڑی غزل تھی، دیکھنا کہیں نقل پڑی ہو تو مجھے دکھانا۔"

امراؤ: "انھیں سے نہ منگوا لو"

رسوا: "خود جا کے لکھا لاؤں تو ممکن ہے وہ ہرگز نہ لکھیں گے۔"

امراؤ: "یہ بھی کوئی بات ہے؟"

رسوا: "جی ہاں آپ کو نہیں معلوم مسودے کے سوا غزل صاف کرنے تک کی قسم ہے۔"

امراؤ: "اچھا۔ ایک دن ہم اور آپ دونوں چلیں۔ ہاں ایک شعر اور یاد آیا۔

ہر چند اس میں آپ ہی بدنام کیوں نہ ہوں ۔۔۔ باز آئیں گے نہ وہ مرا چرچا کئے بغیر"

اور سنیئے۔

غیروں کو ہے تم کے تقاضے کا حوصلہ ۔۔۔ چھوڑیں گے یہ نہ عشق کو رسوا کئے بغیر

رسوا: "میری بھی غزل اسی طرح میں تھی مگر خدا جانے کیا ہوئی صرف مقطع یاد رہ گیا تھا۔"

امراؤ: "مقطع پھر سنائیے۔ کیا خوب کہا ہے۔"

رسوا: "رسوا سے کیوں ملے ہو محبت جتا کے تم
چھوڑوں گا اب نہ میں تمھیں رسوا کئے بغیر"

امراؤ: "واقعی خوب کہا ہے مگر اس میں آپ کے تخلص نے خاص لطف پیدا کر دیا ہے۔"

رسوا: "تخلص کا ذکر نہ کیجئے۔ ایک عنایت فرما کی عنایت سے شہر میں اب کئی رسوا موجود ہیں لوگ خواہ مخواہ اپنے اچھے خاصے تخلص چھوڑ کے رسوا ہوئے جاتے ہیں وہ تو کہیئے میرا نام نہیں جانتے نہیں تو کیا عجب ہے لوگ نام بھی بدل ڈالیں مگر میں تو خوش ہوں۔ اس لیئے کہ انگریزی رسم کے موافق باپ بیٹوں کا نام ایک ہی ہوتا ہے۔ یہ سب میرے روحانی فرزند ہیں۔ جس قدر نسل ترقی کرے گی میرا نام روشن ہوگا۔

لے اب ٹالیے نہ۔ جو کچھ میں نے پوچھا ہے وہ کہنا ہی پڑے گا۔"

امراؤ: "کیا زبردستی ہے۔ کیا بے شرمی کی باتیں آپ پوچھتے ہیں۔"

رسوا: "بیاہ براتوں میں گالیاں گانے سے زیادہ بے شرمی نہ ہوگی۔

امراؤ: "آپ کے لکھنؤ میں تو رنڈیاں گالیاں نہیں گاتیں۔ ڈومنیاں البتہ گاتی ہیں وہ بھی عورتوں میں۔ دیہات کی رنڈیوں کو گانا پڑتی ہیں۔ مردوں میں واقعی مرزا صاحب شہر یا دیہات یہ رسم تو کچھ اچھی نہیں۔"

رسوا: "آپ کے کہنے سے اچھا نہیں ہے ہم نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے اور ان کانوں سے سنا ہے۔ اچھے اچھے شریف مرد آدمی عورتوں میں گھس کے شوقیہ گالیاں سنتے ہیں۔ ماں

ماں بہنیں نانی دادی بنی ہیں اور یہ خوش ہیں۔ باچھیں کھلی جاتی ہیں آج خدا نے یہ دن دکھایا۔ کاش خدا یہ دن نہ دکھاتا! اس کے علاوہ برات کی رات بھر اور صبح کی جو بیہودگیاں باعصمت بہو بیٹیوں میں ہوتی ہیں اس کا ذکر بھی کیا۔ خیر ان باتوں کو رہنے دیجئے اپنی بیتی کہئے۔ ہم کوئی سیلف قوم نہیں جو ان باتوں پر نکتہ چینی کریں۔"

امراؤ: "آپ نہ مانیے گا۔ سنئے:"

جب سے بسم اللہ کی نتھ ہوئی خورشید جان اور امیر جان کے کارخانے دیکھے۔ میرے دل میں ایک خاص قسم کی امنگ پیدا ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک خاص رسم (جس سے میں بالکل ناواقف تھی) کے ادا ہونے کے بعد بسم اللہ سے بسم اللہ جان اور خورشید سے خورشید جان ہوگئیں۔ بے باکی کی سند حاصل ہوگئی آزادی کا خلعت مل گیا۔ اب یہ لوگ مجھ سے علیحدہ ہوگئے۔ میں ان کی نگاہوں میں حقیر سی معلوم ہوتی تھی۔ وہ دونوں کے ساتھ بے تکلف ہنسی مذاق کرنے لگی تھیں۔ ان کے کمرے جدا جدا سج دیے گئے تھے۔ نواڑ کے پلنگ ڈوریوں سے کسے ہوئے تھے۔ فرش پر ستھری چاندنی بچھی ہوئی، بڑے بڑے نقشی پاندان۔ حسن دان خاصدان اگالدان اپنے اپنے قرینوں سے رکھے ہوئے۔ دیواروں پر جلستی آئینے عمدہ عمدہ تصویریں، چھت میں چھت گیریاں لگی ہوئی جس کے درمیان ایک مختصر سا جھاڑ۔ ادھر ادھر عمدہ ہانڈیاں سرشام سے دو کنول روشن ہو جاتے ہیں دو دو مہریاں۔ دو دو خدمتگار ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ خوبصورت نوجوان رئیس زادے ہر وقت دل بہلانے کو حاضر۔ چاندی کی گڑگڑی منہ سے لگی ہوئی ہے۔ سامنے پاندان کھلا ہوا ہے۔ ایک ایک کو پان لگا کے دیتی جاتی ہیں چہلیں ہوتی جاتی ہیں۔ اٹھتی ہیں تو لوگ بسم اللہ کہتے ہیں چلتی ہیں تو لوگ آنکھیں بچھائے دیتے ہیں۔ یہ ہیں کہ کسی کی پرواہ ہی نہیں کرتیں۔ جو ہے انھیں کے حکم کا تابع ہے حکومت بھی وہ کہ زمین و آسمان ٹل جائے مگر ان کا کہنا نہ ٹلے۔ فرمائشوں کا ذکر ہی کیا بن مانگے لوگ کلیجہ نکال کے دیے دیتے ہیں۔ کوئی دل ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہے کوئی جان قربان کرتا ہے۔ یہاں کسی کی قدر ہی نہیں قبول ہوتی۔ کوئی بات نظر میں نہیں سماتی بے پروائی یہ کہ کوئی جان بھی دیدے تو ان کے نزدیک کوئی مال نہیں۔ غرور ایسا کہ ہفت اقلیم کی سلطنت ان کی ٹھوکر پر ہے ناز وہ جو کسی سے اٹھایا نہ جائے مگر اٹھانے والے اٹھاتے ہیں۔ انداز وہ جو مار ہی ڈالے مگر مرنے والے مرے ہی جاتے ہیں۔ ادھر اس کو رلا دیا ادھر اس کو ہنسا دیا کسی کے کلیجہ میں چٹکی لے لی، کسی کا دل تلووں سے مسل ڈالا۔ بات بات میں روٹھی جاتی ہیں

لوگ منا رہے ہیں، کوئی ہاتھ جوڑ رہا ہے، کوئی منت کر رہا ہے۔ قول کیا اور مکر گئیں، قسم کھائی اور بھول گئیں۔ محفل بھر میں سب کی نگاہ ان کی طرف ہے۔ یہ آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتیں۔ پھر جدھر دیکھ لیا، ادھر سب دیکھنے لگے۔ جس پر ان کی نگاہ پڑتی ہے اس پر ہزاروں نگاہیں پڑتی ہیں۔ رشک کے مارے لوگ جلے جاتے ہیں اور یہ جان جان کے جلا رہی ہیں اور لطف یہ کہ دل میں کچھ نہیں، وہ بھی پیچ ہے فقط بناوٹ۔ اگر وہ بیچارہ اس فریب میں آگیا پھر کیا تھا پہلے بظاہر خود مرنے لگیں ؎

آج کل ان کو بہت ہے مری خاطر منظور — یا مری یا مرے دشمن کی قضا آئی ہے

مریں ان کے دشمن۔ آخر اسی کو مار ڈالا۔ اب جا کے کلیجہ میں ٹھنڈک پڑی۔ اس غریب کے گھر میں رونا پیٹنا پڑا ہے۔ یہ بیٹھی یاروں کے ساتھ قہقہے لگا رہی ہیں۔

مرزا صاحب! ان سب باتوں کو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں اور بیان کر سکتے ہیں مگر یہ کرشمہ دیکھ کے جو کچھ میرے دل پر گذرتی تھی اس کو میں خوب جانتی ہوں۔ عورت کو عورت سے جو رشک ہوتا ہے اس کی کچھ انتہا نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے اگرچہ مجھے کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ سب کے چاہنے والے مجھی کو چاہیں اور سب کے مرنے والے مجھی پر مریں۔ نہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھیں نہ کسی پر جان دیں، مگر میری طرف کوئی آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھتا تھا۔ بوا حسینی کی کوٹھری جس کی در و دیوار سے لے کر چھت تک دھوئیں سے سیاہ تھی، اس کے ایک طرف جھلنگا پلنگ پڑا ہوا تھا، اس پر ہم اور بوا حسینی رات کو پڑ رہتے تھے۔ ایک طرف کوٹھری میں چولھا بنا ہوا تھا، اس کے پاس دو گھڑے رکھے ہوئے تھے، یہیں دو بدقلعی سی پتیلیاں۔ لگن۔ توا۔ رکابیاں پیالے ادھر ادھر پڑے رہتے تھے۔ ایک کونے میں آٹے کی مٹکی تھی۔ اس پر دو تین والیں نمک مصالحہ ہانڈیوں میں۔ اسی کے پاس جلانے کی لکڑیاں سوختے۔ مسالحہ پیسنے کی سل بٹہ خلاصہ یہ کہ تمام کر کری خانہ یہیں تھا۔ چولھے کے اوپر دیوار میں دو کیلیں لگی تھیں۔ کھانا پکاتے وقت اس پر چراغ رکھ دیا جاتا تھا اور چکنا ہوا چھوٹا سا ڈیوٹ پلنگ کے پاس دھرا رہتا تھا۔ کھانا پکانے کے بعد ہی وہ چراغ اس پر رکھ دیا جاتا تھا۔ چراغ میں پتلی سوت کی بتی پڑی ہے۔ موا اندھا اندھا جل رہا ہے۔ لاکھ اکساؤ لو اونچی نہیں ہوتی۔ اس کوٹھری کی آرائش میں دو چھینکے بھی تھے ان میں سے ایک میں پیاز رہتی تھی اور دوسرے میں سالن دال کی پتیلی۔ چپاتیاں مولوی صاحب کے واسطے ڈھانپ کے رکھ دی جاتی تھیں

پیاز ڈالا چھینکا تو چولہے کے قریب تھا اور یہ دوسرا میرے سینے پر تھا جس کے بوجھ سے کھانا گویا میرے سینے پر دھرا رہتا تھا۔ اگر پلنگ پر اچانک کھڑی ہوئی تو سالن کی پتیلی کھٹ سے سر میں لگی۔

صبح سے گیارہ بجے تک مولوی صاحب کی قمچیاں اور شام سے ۹ بجے تک استاد کی جھڑکیاں اور گزوں کی مار۔ یہ ہمارا اخلاص پیار تھا۔ یہ سب کچھ تھا مگر میں اپنے کرتوتوں سے باز نہ آتی تھی۔

اوّل اوّل تو مجھے آئینہ دیکھنے کا شوق ہوا۔ اب میرا سن چودہ برس کا تھا ادھر بوا حسینی کوٹھڑی سے ٹلیں ادھر میں نے ان کی پٹاری سے آئینہ نکالا۔ اپنی صورت دیکھنے لگی۔ اپنا ناک نقشہ اور رنڈیوں سے ملاتی تھی۔ مجھے اپنے چہرے بھر میں کوئی چیز بری نہ معلوم ہوتی تھی بلکہ اوروں سے اپنے کو بہتر سمجھتی تھی اگرچہ درحقیقت ایسا نہ تھا۔

رسوا: ”تو کیا آپ کی صورت کسی سے بری تھی؟ اب بھی سینکڑوں سے اچھی ہو۔ اس وقت تو اور بھی جوبن ہوگا۔“

امراؤ: ”تسلیم۔ خیر اب اس تعریف کو رہنے دیجئے بالکل بے محل اور بے موقع ہے معاف کیجئے گا، مگر ہاں اس وقت میرا ایسا ہی خیال تھا اور یہ خیال میری جان کے لئے آفت تھا۔ میں دل ہی دل میں کہتی تھی، ہائے مجھ میں کیا برائی ہے جو کوئی میری طرف توجہ نہیں کرتا۔“

رسوا: ”یہ تو ممکن نہیں کہ کسی کو آپ کی طرف توجہ نہ ہو۔ نگاہیں ضرور پڑتی ہوں گی مگر بات یہ ہے کہ آپ کی مسّی نہیں ہوئی تھی، خانم سے لوگ ڈرتے تھے اس لئے آپ سے کوئی بولتا نہ ہوگا۔“

امراؤ: ”شاید یہی ہو مگر مجھے اتنی تمیز کہاں تھی۔ میری تو وہ مثل تھی ”بے دولتی اپنے تئیں آپ کھولتی“ اپنی ہمجولیوں کو دیکھ دیکھ کے پھکی جاتی تھی۔ کھانا پینا حرام۔ راتوں کو نیند اڑ گئی تھی۔“

اسی زمانے میں پھر کنگھی کرتے وقت اور بھی صدمہ ہوتا تھا۔ اس لئے کہ کوئی چوٹی کا گوندھنے والا نہ تھا۔ جب بسم اللہ کی چوٹی نواب چھبن صاحب اپنے ہاتھ سے گوندھتے تھے میرے سینے پر سانپ لوٹ جاتا تھا۔ یہاں کون تھا ہی بوا حسینی وہ بھی جب انھیں فرصت ہوئی۔ نہیں تو دن دن بھر بال کھلے ہیں۔ سر جھاڑ منہ پہاڑ پھر رہی ہوں۔ آخر میں نے اپنے

ہاتھ سے چوٹی گوندھنا سیکھا اور سب رنڈیاں تو دن بھر میں تین تین جوڑے بدلتی تھیں یہاں وہی آٹھویں دن۔ پوشاک بھی بھاری نہ تھی۔ وہ لوگ کارچوبی جوڑے بدلتے تھے۔ یہاں وہی گلبدن کا پائجامہ ململ کا دوپٹہ۔ بڑی بڑائی ہوئی ٹکی کی ٹوپی دیدی گئی۔

اس پر بھی کپڑے بدل کے میرا جی چاہتا تھا کہ مردوں میں جا کے بیٹھوں کبھی بسم اللہ کے کمرے میں چلی گئی، کبھی امیر جان کے پاس۔ مگر جہاں جاتی تھی کسی نہ کسی بہانہ سے اٹھا دی جاتی تھی۔ ان لوگوں کو میرا بیٹھنا ناگوار تھا سب کو اپنی مزے داریوں کا خیال تھا مجھے کون بیٹھنے دیتا۔

اور نہ بیٹھنے دینے کا ایک اور بھی سبب تھا کہ ان دنوں میری طبیعت میں شرارت کسی قدر سما گئی تھی۔ جہاں بیٹھی کسی کو ٹھینگا دکھا دیا۔ کسی کو منہ چڑھا دیا کسی کے چٹکی لے لی۔ ہر طرح مردوں سے لگاوٹ کرتی تھی اس وجہ سے لوگ میرے بیٹھنے کے روادار نہ تھے۔

مرزا صاحب! آپ سمجھ سکتے ہیں کہ گوہر مرزا ایسے وقت اور اس حالت میں مجھے کس قدر غنیمت معلوم ہو سکتا تھا اس لئے کہ وہ مجھ سے پیار کی باتیں کرتا تھا۔ میں اس کو چھیڑتی تھی وہ مجھے چھیڑتا تھا۔ میں اس کو اپنا چاہنے والا سمجھتی تھی، اور وہ بھی ان دنوں مجھ کو چاہتا تھا۔ جب صبح مکتب میں آتا کبھی دو نارنگیاں جیب میں پڑی ہیں مجھے چپکے سے دیدیں۔ کسی دن حلوا سوہن کی ٹکیہ لیتا آیا مجھ کو کھلا دی ایک دن نہیں معلوم کہاں سے ایک روپیہ لایا تھا وہ بھی مجھے حوالے کر دیا ہزاروں روپے میں نے اپنی زندگی میں اپنے ہاتھ سے اٹھائے ہوں گے مگر اس ایک روپیہ کے پانے کی خوشی کبھی نہ بھولوں گی۔ اس کے پہلے مجھے پیسے تو بہت ملے تھے مگر روپیہ کبھی نہ ملا تھا۔ وہ روپیہ بہت دن تک میں نے جگو رکھا اس لئے کہ اس کے صرف کی کوئی ضرورت مجھے نہ تھی اور اگر تھی بھی تو یہ خیال تھا کہ اگر یہ صرف کرتی ہوں تو لوگ پوچھیں گے کہاں سے ملا تو کیا بتاؤں گی۔ رازداری کی سمجھ مجھے بھی آ گئی تھی اور یہ سمجھ بغیر سن تمیز کو پہنچے نہیں آتی۔ بے شک میں سن تمیز کو پہنچ چکی تھی۔

ایک شاطر چور دل میرا چرا کر لے گیا
پاسباں کمبخت سب سوتے کے سوتے رہ گئے

برسات کے دن ہیں گھٹا آسمان پر چھائی ہوئی ہے۔ پانی تلے دھار اوپر دھار برس رہا ہے۔ بجلی چمک رہی ہے بادل گرج رہا ہے۔ میں بوا حسینی کی کوٹھری میں اکیلی پڑی ہوں۔ بوا حسینی

خانم کے ساتھ حیدری کے گھر گئی ہوئی ہیں۔ چراغ گل ہو گیا ہے اور اندھیری وہ کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا۔

اور کمروں میں جشن ہو رہے ہیں۔ کہیں سے گانے کی آواز آ رہی ہے کہیں قہقہے اڑ رہے ہیں۔ ایک میں ہوں کہ اس اندھیری کوٹھری میں اپنی تنہائی پر رو رہی ہوں۔ کوئی آس پاس نہیں ہے۔ دل پر جو گذر رہی ہے دل ہی جانتا ہے جب بجلی چمکتی ہے مارے ڈر کے دولائی سے منہ ڈھانپ لیتی ہوں۔ جب گرج کی آواز آتی ہے کانوں میں انگلیاں دے لیتی ہوں۔ اسی عالم میں آنکھ لگ گئی اتنے میں یہ معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے زور سے میرا ہاتھ پکڑ لیا میری گھگھی بندھ گئی منہ سے آواز تک نہ نکلی اور آخر کار میں بیہوش ہو گئی۔

صبح کو چور کی ڈھنڈھیا ہوئی۔ وہ کہاں ملتا ہے۔ خانم منہ تھوتھائے بیٹھی ہیں بوا حسینی بڑبڑاتی پھرتی ہیں۔ میں ٹھگ ماری سی چپکی بیٹھی ہوں۔ سب پوچھ پوچھ کے تھک گئے مگر مجھے کچھ معلوم ہو تو بتاؤں۔"

رسوا: "یہ نہیں کہتیں کہ اگر معلوم بھی ہوتا تو کیوں بتاؤں؟"

امراؤ: "خیر اب حاشیے نہ چڑھائیے سنتے جائیے۔"

خانم کی اس دن کی مایوسی اور بوا حسینی کا اداس چہرہ جب مجھے یاد آتا ہے تو بے اختیار ہنسی آتی ہے۔"

رسوا: "کیوں نہ ہنسی آئے۔ ان کی تو ساری امیدیں خاک میں مل گئیں اور آپ کا نقصان بچ گیا۔"

امراؤ: "امیدیں خاک میں مل گئیں! خانم کو آپ نہیں جانتے ایک ہی گھاگ ہوا تھیں اس معاملہ کو اس طرح دبا دیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا اور وہ وہ انتظام و تدبیریں کیں کہ شاید و باید۔ اب کسی آنکھ کے اندھے اور گانٹھ کے پورے کی تلاش ہوئی۔ آخر ایک ہُد ہُد پھنس گیا۔

ان دنوں ملک آشیت سے ایک صدر العلوم کے صاحبزادے طالب علمی کے لئے لکھنؤ میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ گھر سے خوش۔ والد مرحوم ان کی رشوت و نذرانہ کے روپے سے ایک بڑا علاقہ ان کے صرف کے لئے چھوڑ گئے تھے چند روز یہاں آ کر اچھے رہے پھر جو لکھنؤ کی ہوا لگی علم تماش بینی میں طاق اور فن بے غیرتی میں مشاق ہو گئے۔ اسم شریف راشد علی تھا۔ راشد تخلص کرتے تھے۔ لکھنؤ کے کسی استاد نے مرشد بنا دیا۔ اس تخلص پر آپ کو بہت ہی فخر تھا۔

وطن سے جو ملازم ہمراہ آئے تھے وہ سب رکھن میاں کہتے تھے لکھنؤ والوں نے ان کو راجہ

کا لقب دیا مگر اس نام اور القاب میں کسی قدر دیہاتیت تھی۔ آپ لکھنؤ کی وضع قطع پر مرتے تھے، اس لئے تھوڑے ہی دنوں میں نواب صاحب بن گئے۔ جب گھر سے آئے تھے تو خاصی ڈاڑھی منھ پر تھی۔ لکھنؤ کی ہوا لگتے ہی پہلے کتروائی ہوئی۔ پھر خشخاش۔ اور تھوڑے دنوں کے بعد تو بالکل صفایا ہوگیا۔

ڈاڑھی منڈنے سے چھوٹا سا چہرہ کیسا بدنما نکل آیا۔ مگر آپ اسے خوبصورتی سمجھتے تھے سیاہ رنگ چیچک کے داغ۔ بھدی سی ناک، چھوٹی چھوٹی آنکھیں گال پچکے ہوئے۔ تنگ پیشانی کوتاہ گردن۔ ٹھنگنا سا قد۔ غرضکہ ہمہ صفت موصوف تھے، مگر آپ اپنے کو یوسف ثانی سمجھتے تھے پہروں آئینہ سامنے رہتا تھا۔ مونچھیں اس قدر مروڑی گئیں کہ آخر چوہیا کی دُم ہوگئی۔ بال بڑھائے گئے گھونگھر بنایا گیا۔ نکے دار ٹوپی سر پر رکھی گئی۔ اونچی چولی کا انگرکھا ڈانٹا۔ بڑے پائچوں کا پاجامہ پہنا گیا۔ یہ سب ٹھاٹھ رنڈیوں کی دربارداری کے لئے کیا گیا تھا۔

اوّل تو خود ہی طبیعت بہت رسا تھی دوسرے لائق احباب کی وساطت سے چند ہی روز کے بعد اونچے اونچے کمروں پر رسائی ہوگئی۔ رسائی کیسی بے تکلفی بڑھ گئی۔ چھٹن جان سے مادر پدر ہوتا ہے۔ بگن چٹکیں لگاتی ہیں۔ جٹّن نے جوتا کھینچ مارا۔ آپ ہیں کہ ہی ہی ہنس رہے ہیں یہ سب کچھ تھا مگر نائکاؤں کا بڑا ادب کرتے تھے۔ جس رنڈی سے ایک شب کے لئے بھی واسطہ ہوگیا اس کی نائکہ کو مجمع عام میں اماں جان کہنا اور جھک کے تسلیم کرنا عین سعادت مندی تھی اس میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ یاروں پر ظاہر ہو جاتا تھا کہ آپ یہاں مشرف ہوچکے ہیں۔

سرِ شام سے دو تین گھڑی رات گئے تک خانم صاحب کا دربار کرتے تھے۔ اُن کی ہمراہ ایک نوچی کی خدمت میں نیاز حاصل تھا۔ علم موسیقی میں بھی آپ کو کمال تھا۔ ٹھمریاں خود تصنیف فرماتے خود ہی دُھن بنا کے گاتے تھے۔ خود ہی بھاؤ بتاتے جاتے تھے اور تو جو کچھ تھا منھ سے طبلہ خوب بجاتے تھے۔ یاروں نے خوب بنا لیا تھا۔ آپ کے اشعار پر لوگوں نے اتنی تعریف کی کہ آپ کو فخرِ آتش و ناسخ بنا دیا۔ مشاعروں میں ڈریائے گئے۔ آپ سے غزل پڑھوائی تمام مشاعرہ چونک گیا۔ ریختی گویوں سے پہلے آپ کا کلام پڑھا جاتا تھا سنتے سنتے لوگوں کے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔ لوگ بناتے تھے آپ خوش ہوتے تھے جھک جھک کے تسلیمیں کرتے تھے۔

وطن سے بے غل و غش روپیہ چلا آتا تھا۔ ان کی والدہ بیچاری اس خیال سے کہ لڑکا پڑھنے گیا ہے مولوی بن کے آئے گا۔ جو کچھ لکھ بھیجتے تھے بھیج دیتی تھیں لکھنؤ کے بےفکرے

خوش پوشاک۔ عیش پسند۔ مفت خورے۔ آپ کے ہمراہ رہتے تھے۔ انھیں لوگوں کے کہنے سننے سے کچھ خیال پیدا ہوا۔ اس خیال نے ترقی کرتے کرتے اشتیاق تک نوبت پہنچائی آخر کو عشق اور اس کے بعد جنون ہو گیا۔ ادھر خانم نے کھنچاؤ کیا۔ خانم کا یہ کہنا "نا صاحب ابھی وہ کمسن ہے" اور اُن کی التجا منت وزاری۔ بیقراری آج تک مجھے یاد ہے۔ آخر دعا تعویذ کی تاثیر اور غمخواروں کی دوا دوش سے پانچ ہزار روپیہ پر توڑ ہوا۔ اس روپیہ کے لینے کے لئے آپ کو چند روز کے لئے وطن جانا پڑا۔ ماں سے چھپا کے دو گاؤں آپ نے رہن کر دیے۔ بیس پچیس ہزار روپئے لے کے لکھنؤ آئے۔ پانچ توڑے گن دئے۔

روپیہ عین المال دیوانجی کی معرفت خانم کے خزانۂ عامرہ میں داخل ہوا۔ بوا حسینی نے پاؤں پھیلائے۔ پانچ سو روپیہ نذر نیاز کے نام سے لے مریں۔ خلاصہ یہ کہ میں آپ کے سر منڈھی گئی۔ چھ مہینہ تک آپ لکھنؤ میں رہے۔ سو روپیہ ماہوار دیتے تھے۔ فرمائش کا ذکر نہیں جو کچھ مجھے خفیہ دیا وہ بوا حسینی کے پاس رہتا تھا خانم کو اس کی خبر نہ تھی۔ اب میں گویا آزاد ہو گئی۔ دو مہریاں دو خدمتگار میرے لئے خاص ملازم ہوئے۔ پھاٹک کے پاس والا کمرہ میرے رہنے کے لئے بچ دیا گیا۔ دو چار مرد آدمی، شریف زادے، نواب زادے میرے پاس بھی آ کے بیٹھنے لگے۔

گلبدن اول گوہر مرزا ہر زمانے میں مجھ سے برابر ملتا رہا۔ خانم اور بوا حسینی اسکی صورت سے مبتلا تھیں مجھے محبت تھی اس لئے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ اِدھر گوہر مرزا کے والد نے انتقال کیا، جو آمدنی وہاں سے تھی وہ بند ہو گئی۔ بنّو بڑھیا ہو چکی تھیں کوئی پوچھتا نہ تھا۔ اس لئے گوہر مرزا کے صرف کی خبر گیری میرے ذمہ تھی۔

سب رنڈیوں کا قاعدہ ہے کہ ایک نائیکہ کو اپنا بنا رکھتی ہیں۔ ایسے شخص سے بہت زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ جب کوئی نہ ہوا تو اُسی سے دل بہلایا۔ سودے سلف کا آرام رہتا ہے۔ آدمی سے منگاؤ تو کچھ نہ کچھ کھا جائیگا یہ مارے خیر خواہی کے اچھی سے اچھی چیز شہر بھر سے ڈھونڈھ کے لاتے ہیں۔ بیمار پڑو تو حد سے زیادہ خدمت کرتے ہیں۔ طرح طرح کے آرام دیتے ہیں۔ رات بھر پاؤں دباتے ہیں۔ صبح کو دوا بنا کے پلاتے ہیں حکیم صاحب سے حال کہتے جاتے ہیں۔ دوست آشناؤں سے تعریفیں کرتے رہتے ہیں۔ مجرے کو ٹھہرا کے لاتے ہیں۔ جہاں شادی بیاہ ہوا ناچ کا انتظام اپنے ذمہ لے کے مجرے میں انھیں کو لے جاتے ہیں محفل میں بیٹھ کر اہل محفل کو متوجہ کرتے ہیں۔ وہ ناچ رہی ہے یہ تال دیتے جاتے ہیں۔

ہر سم پر آہ کھینچتے ہیں۔ ہر تال پر واہ کر رہے ہیں۔ وہ بھاؤ بتا رہی ہے یہ شرح کرتے جاتے ہیں انھیں کی وجہ سے اچھے سے اچھا کھانے کو ملتا ہے خاطر مدارات اور رنڈیوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ انعام و اکرام سوا ملتا ہے۔ اگر کسی رئیس امیر سے ملاقات ہو گئی انھیں کی بدولت ان کو لطف رقابت حاصل ہوتا ہے۔ ادھر وہ چاہتے ہیں کہ رنڈی ہم کو چاہنے لگے۔ اُدھر رنڈی جان جان کے ان کا کلمہ بھر رہی ہے۔ کبھی یہ فقرہ ہے "صاحب! میں ان کی پابند ہوں نہیں معلوم آپ سے کیونکر ملتی ہوں اب ان کے آنے کا وقت ہے مجھے جانے دیجئے وہ تو ہمیشہ سے کہتے ہیں آپ اس طرح کیا بنا بیٹھے گا؟"

تماشبین ان سے دبتے رہتے ہیں اگر کسی سے کچھ تکرار ہوئی یہ حمایت کو مستعد شہر کے بانکے ترچھوں سے ملاقات بات کی بات میں پچاس ساٹھ آدمی جمع ہو سکتے ہیں۔ تماشبین کا ایک طرف خود نائکہ پر دباؤ رہتا ہے۔ ہر وقت یہ خوف لگا رہتا ہے رنڈی ان کو پیار کرتی ہے کہیں ایسا نہ ہو ان کے گھر جا بیٹھے۔

امیر جان کاظم علی پر مرتی تھیں برسوں اپنے پاس سے روپیہ دیا۔ ایک مرتبہ پانچ سو کے کپڑے اتار کے دے دیئے اور صبح کو غل مچا دیا کوئی اتار کے لے گیا ایک دن جھالے کی ایک فرد گیارہ سو کے جوڑ کی دیدی اور کہہ دیا کہ عیش باغ کے میلے میں کانوں سے گر گئی۔ اسی طرح ہزاروں روپیہ کا سلوک کیا۔ گھر بھر کی روٹیاں امیر جان کی بدولت تھیں۔

خود پیارے صاحب پر جان دیتی تھیں۔ بسم اللہ کے کوئی آشنا نہ تھا۔ طبیعت میں سفلہ پن تھا کسی پر بند نہ تھیں۔

اوروں کا ذکر کیا۔ خانم صاحب پچاس پچپن برس کے سن میں میر اولاد علی پر جان دیتی تھیں۔ میر صاحب کا سن اٹھارہ انیس برس کا تھا۔ صورت دار جوان تھے کسرتی بدن تھا۔ اچھے اچھوں کی نگاہ پڑتی تھی۔ خانم کا رعب غالب تھا کیا مجال کوئی بات کر سکے۔ بیچارے غریب آدمی تھے۔ نان شبینہ کو محتاج۔ خانم کی بدولت سارا کنبہ پرورش پاتا تھا۔ ڈیڑھ ہزار روپیہ لگا کے شادی کردی مگر برات کی رات کے سوا میر صاحب کو کبھی شب کو گھر میں سونا نصیب نہیں ہوا۔ دن رات یہیں رہتے تھے۔ گھڑی کو گھر بھی ہو آتے تھے۔

ایک اور مرزا صاحب کوئی ستر برس کا سن کمر جھکی ہوئی۔ نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں

آنت۔ خانم صاحب کے قدیم آشناؤں میں تھے۔ اب ان سے کوئی واسطہ نہ تھا مگر گھر والوں کی طرح رہتے تھے۔ صبح شام کھانا خانم کے ساتھ کھاتے تھے کپڑا خانم بنوا دیتی تھیں۔ افیم۔ گنّ ریوڑیاں ان سب اخراجات کا بار خانم کے سر تھا۔ ایک دن ہم لوگ خانم صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ خورشید جان غمزدہ صورت بنائے بیٹھی ہیں۔

کیوں! پیارے صاحب کی شادی ہوتی ہے ان پر غم سوار ہے۔ خانم نے براہ فہمائش کہا۔ جاؤ چھوکریو.. تمہیں معلوم اس زمانے کی محبتیں کس قسم کی ہیں جیسے رنڈیاں ویسے اُن کے آشنا۔ ایک ہمارا زمانہ تھا دیکھو (مرزا صاحب کی طرف اشارہ کرکے) ایک یہی مرد آدمی بیٹھے ہیں۔ جوانی میں مجھ سے آشنائی ہوئی۔ ماں باپوں نے شادی ٹھہرائی۔ آپ مانجھے کا جوڑا پہن کے مجھے دکھانے آئے میں نے مانجھے کے جوڑے کے پُرزے پُرزے کر دیے ہاتھ پکڑ کے بیٹھ گئی کہ میں تو نہ جانے دوں گی۔ اس کو ۳۰ برس کا زمانہ گزرا۔ آج تک تو گھر نہیں گئے۔ کہو ہے کوئی ایسا تمہارا ابھی؟ سب نے سر جھکا لیا۔

یوں تو بسم اللہ کی ستی میں پہلے پہل ناچی گائی تھی مگر پہلا مجرا میرا نواب شجاعت علی خاں کے لڑکے کی شادی میں ہوا تھا۔ وہ محفل بھی یادگار تھی نواب کی بارہ دری کس شان سے سجی گئی تھی۔ بیش قیمت شیشہ آلات کی روشنی سے رات کو دن ہو گیا۔ صاف ستھرا فرش۔ ایرانی قالین زربفت کے مسند تکیے۔ سامنے رنگ رنگ کے مردنگوں کی قطار روشن۔

عطر اور پھولوں کی خوشبو سے تمام بارہ دری بسی ہوئی تھی۔ دُھواں دھار حقوں کی خوشبو گلوری کی مہک سے دماغ معطر تھے۔ میرا سن کوئی چودہ برس کا تھا۔ اس زمانے میں بڑودے سے ایک بائی جی آئی ہوئی تھیں۔ تمام شہر میں ان کے گانے کی دھوم تھی بڑے بڑے گویئے کان پکڑتے تھے۔ معلومات ایسی کہ پوتھیاں گویا نوک زبان تھیں۔ گلا وہ کہ چار محلے ادھر آواز جائے مگر واہ خانم صاحب واقعی کیا رنگ دیکھتی تھیں، ان کے بعد مجھ کو کھڑا کر دیا۔ مجھے تو کیا تمیز تھی مگر سمجھدار لوگ حیران تھے کہ خانم صاحب کیا کرتی ہیں۔ بھلا بائی جی کے سامنے اس چھوکری کا رنگ جمے گا۔

پہلے گت شروع ہوئی۔ اس میں محفل کچھ میری طرف مخاطب ہوئی۔ میری بھی اٹھتی جوانی تھی صورت اچھی نہ تھی مگر اس وقت کی پھرتی چالاکی الھڑپن۔

کچھ نہ پوچھو شباب کا عالم
کیا کہوں کچھ عجب زمانہ تھا

گرت تھوڑی ہی دیر ناچی ہوں گی کہ خانم نے یہ غزل شروع کرا دی۔

آج اس بزم میں وہ جلوہ نما ہوتا ہے
دیکھئے دیکھئے اک آن میں کیا ہوتا ہے

اس غزل کے شروع کرنے کے ساتھ ہی محفل تہ و بالا ہو گئی، اس کے بعد دوسرا مطلع اگ ذرا ابتا کے جو گایا اہل محفل جھومنے لگے۔

نالہ رکتا ہے تو سرگرم جفا ہوتا ہے
درد تھمتا ہے تو بیدرد خفا ہوتا ہے

اور اس شعر نے تو قیامت ہی برپا کر دی۔

پھر نظر جھپتی ہے آنکھ جھکی جاتی ہے
دیکھئے دیکھئے پھر تیر خطا ہوتا ہے

اس شعر کا یہ حال تھا کہ جس سے نظر ملا کے گایا نظر نہ اٹھا سکا۔

بت پرستی میں نہ ہوگا کوئی مجھ سا بدنام
جھینپتا ہوں جو کبھی ذکر خدا ہوتا ہے

ذرا اس شعر کو سنیے اور قیاس کیجیے۔ عاشق مزاجوں پر اس کا کیا اثر ہوا ہوگا۔

عشق میں حسرت دل کا تو نکلنا کیسا
دم نکلنے میں بھی کمبخت مزا ہوتا ہے

پھر اس کے بعد یہ شعر پڑھا۔

حال دل اُن سے نہ کہنا تھا ہمیں چوک گئے
اب کوئی بات بنائیں بھی تو کیا ہوتا ہے

تمام محفل پر وجد کا عالم طاری تھا۔ ہر شخص محظوظ تھا۔ ہر لفظ پر واہ ہر سم پر اہاہاہا ایک ایک شعر آٹھ دس مرتبہ گوایا گیا۔ پھر بھی سیری نہیں ہوتی تھی۔ اسی غزل پر میرا مجرا موقوف ہوا۔ دوسرے مجرے میں پھر یہی گوائی گئی۔

مرزا رسوا: "وہ خیر محفل کا جو حال ہوا ہوا از برائے خدا اور جس قدر شعر اس غزل کے یاد ہوں سنا دیجئے۔ یہ کس کی غزل ہے"

امراؤ: "اوئی۔ کیا آپ نہیں جانتے؟"

رسوا: "میں سمجھا"

امراؤ: "اور شعر سنیئے"

ناسبب گور پہنچ جاتے ہیں مرنے والے
وہ بھی اس وقت کہ جب شوق رسا ہوتا ہے

رسوا: "سبحان اللہ"

امراؤ: "واقعی قلم توڑ دیا ہے۔"

آہ میں کچھ بھی اثر ہو تو شرر بار کہوں
ورنہ شعلہ بھی حقیقت میں ہوا ہوتا ہے

رسوا: یہ فلسفہ ہے اسے وہی خوب سمجھتے ہیں۔

امراؤ: "اور سنیئے"

کس قدر معتقد حسن ملاقات ہوں میں — دل میں خوش ہوتا ہوں جب رنج سوا ہوتا ہے

رسوا: "یہ بھی فلسفہ ہے۔ اسے زاہد خوب سمجھتے ہیں"

امراؤ: "اور سنیئے"

شوق اظہار اگر ہے تو مرے دل کو نہ توڑ — اسی آئینہ میں تو جلوہ نما ہوتا ہے

رسوا: "یہ تصوف ہے۔ ہم دنیا کے لوگ ہیں۔ ہمیں اس سے کچھ غرض نہیں مگر "شوق اظہار" یہ تعقیدیں کیونکر چل جایا کرتی ہیں"

امراؤ: "مقطع سنیئے:-

ہجر میں نالہ و فریاد سے باز آ... — ایسی باتوں سے وہ بیدرد خفا ہوتا ہے

رسوا: یہ مطلع سے مقطع نکالا ہے۔ مقطع کہنے کی فرصت نہ ملی ہوگی۔

امراؤ: فرصت انھیں کب ملتی ہے۔

پہلے مجرے کے دوسرے دن بوا حسینی میرے کمرے میں آئیں ایک خدمتگار ان کے ساتھ تھا۔

بوا حسینی: "دیکھو امراؤ صاحب یہ کیا کہتا ہے"

اتنا کہہ کے بوا حسینی کمرے کے باہر چلی گئیں۔

خدمتگار: "(سلام کرکے) مجھے نواب سلطان صاحب نے بھیجا ہے جو کل شب کو کھڑکی میں زرد مندیل سر پر رکھے دولھا کے داہنی طرف بیٹھے تھے اور فرمایا ہے کہ میں کسی وقت آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں بشرطیکہ جس وقت میں آؤں اس وقت کوئی اور نہ ہو۔ اور اسی غزل کی نقل مانگی ہے جو آپ نے کل گائی تھی"

میں: "نواب صاحب سے میری تسلیمات کہنا اور کہنا شام کو جب چاہیے تشریف لائیے تخلیہ ہو جائے گا۔ غزل کے لئے کل دن کو کسی وقت آنا لکھ دوں گی"

دوسرے دن پہر دن چڑھے خدمتگار آیا۔ میں کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی غزل کی نقل میں نے کر رکھی تھی۔ اس کے حوالے کی۔ اس نے پانچ اشرفیاں کمر سے نکال کے مجھے دیں اور کہا کہ نواب صاحب نے کہا ہے کہ آپ کے لائق تو نہیں مگر خیر پان کھانے کے لئے میری طرف سے قبول کیجئے۔ آج شب کو چراغ جلنے کے بعد میں ضرور آؤں گا۔ خدمتگار سلام کرکے رخصت ہوا۔ اس کے جانے کے بعد پہلے تو مجھے خیال ہوا کہ بوا حسینی کو بلا کے یہ

اشرفیاں دیدوں وہ خانم کے حوالے کریں۔ پھر ایک دفعہ جو اشرفیوں کی طرف دیکھا چمکتی چمکتی نئے سکوں کی اشرفیاں بھلا میرے دل سے کب نکلتی تھیں اس وقت صندوقچہ وندوقچہ تو میرے پاس نہ تھا۔ پلنگ کے پائے کے نیچے دبا دیں۔

مرزا رسوا صاحب! میرے نزدیک ہر عورت کی زندگی میں ایک وہ زمانہ آتا ہے جب وہ چاہتی ہے کہ اُسے کوئی چاہے۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ خواہش چند روزہ ہوتی ہے بلکہ عنفوان شباب سے اس کی ابتدا ہوتی ہے اور سن کے ساتھ ہی اس کا نشو و نما ہوتا رہتا ہے۔ جس قدر سن بڑھتا ہے اسی قدر یہ خواہش بڑھتی رہتی ہے۔

گوہر مرزا بے شک میرا چاہنے والا موجود تھا، مگر اس کی چاہت اور قسم کی تھی۔ اس کی چاہت میں ایک بات کی کمی تھی جسے میرا دل ڈھونڈھتا تھا۔ مردانہ ہمت کو اس کی طینت میں لگاؤ نہ تھا۔ ماں کا ڈومنی پنا اس کے خمیر میں داخل تھا۔ وہ جو کچھ پاتا تھا مجھ سے چھین جھپٹ کے لے لیتا تھا، خود ایک روپیہ کے سوا جس کو میں کہہ چکی ہوں کبھی نہیں دیا۔ اب میرا دل ایسا عاشق ڈھونڈھتا تھا جو میری ناز برداری کرے۔ روپیہ خرچے۔ کھلائے پلائے نواب سلطان صاحب (نواب صاحب کا یہی نام آدمی نے بتایا تھا) صورت شکل کے اچھے تھے۔ اُن کے چہرے پر اس قسم کا رعب تھا جس پر عورت ہزار دل سے فریفتہ ہو جاتی تھی۔ بعض لوگ غلطی سے یہ خیال کرتے ہیں کہ عورت کو صرف خوشامد اور اظہار عشق پسند ہے۔ بے شک پسند ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس میں ذرا بھی کمینہ پن نہ ہو۔ جو لوگ رنڈیوں کا کہنا کتے ہوئے آتے ہیں جن کے ہر کنائے سے یہ مدعا نکلتا ہے کہ ہمیں چاہو خدا کے لئے چاہو اور ہمارے گھر پڑ جاؤ۔ جو کچھ کہ تمہارے پاس ہے ہمیں دیدو اور ہمارے گھر کی ماگیری کرو۔ روٹیاں پکا پکا کے کھلاؤ۔ ہمارے اور ہمارے بال بچوں کی جوتیاں سیدھی کرو ہر شخص کا حسن حضرت یوسف کا معجزہ نہیں ہے کہ ہر ایک عورت اس پر جان دینے لگے۔ مرد عورت سے اور عورت مرد سے محبت کرتے ہیں۔ مگر اس محبت میں اکثر اغراض ذاتی کا بھی لحاظ رہتا ہے۔ بے غرض محبت جیسے لیلیٰ مجنوں۔ شیریں فرہاد۔ یہ صرف قصے کہانیوں میں پائی جاتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک طرفہ محبت نہیں ہوتی۔ ہم نے اسے بھی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ مگر اس کو خلل دماغ سمجھنا چاہئے پھر کیا ضرورت ہے کہ مرد عورت دونوں دیوانے ہو رہیں۔

دوسرے دن شب کو نواب صاحب تشریف لائے۔ بوا حسینی سے معمولی گفتگو کے بعد تعین اخراجات ہو کر کمرے میں تخلیہ ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ نواب صاحب نے ملازم نہیں رکھا صرف یہ طے ہوا ہے کہ کبھی کبھی رات کو گھڑی دو گھڑی کے لئے آیا کریں گے۔ نواب صاحب بہت ہی کم سخن بھولے آدمی تھے۔ سن اٹھارہ انیس برس کا تھا۔ بسم اللہ کے گنبد میں پرورش پائی تھی۔ ماں باپ کے دباؤ میں تھے۔ دنیا کے مکر فریب سے بالکل آگاہ نہ تھے۔ اظہار تعشق خدمتگار کی زبانی ہو چکا تھا۔ ورنہ نواب صاحب کو اس میں بھی کچھ نہ کچھ مشکل ہوتی مگر میں نے تھوڑی دیر میں بے تکلف بنا لیا۔

بہت سی لگاوٹ کی باتیں کیں بالکل عاشق زار بن گئی۔ اس میں کچھ سچ تھا کچھ جھوٹ۔ سچ اس لئے کہ نواب صاحب کی صورت ایسی نہ تھی کہ ایک عورت خواہ وہ کیسی ہی سخت دل کیوں نہ ہو ان پر مائل نہ ہو جائے۔ گوری گوری رنگت جیسے گلاب کا پھول۔ ستواں ناک۔ پتلے پتلے ہونٹھ۔ خوبصورت بتیسی، گھونگھر والے بال۔ کتابی چہرہ، اونچا ماتھا، بڑی بڑی آنکھیں بھرے بھرے بازو مچھلیاں پڑی ہوئی چوڑی کلائیاں بلند بالا کسرتی بدن۔ [illegible] سر سے لے کے پاؤں تک تمام بدن نور کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ اس پر بھولی بھولی باتیں بات بات میں عاشقانہ شعر جن میں اکثر انھیں کی تصنیف۔ شعر پڑھنے میں ہر ادا ٹوٹا ہوا تھا۔ خاندانی شاعر تھے۔ مشاعروں میں اپنے والد کے ساتھ غزل پڑھتے تھے۔

شاعروں کو کیسا ہی عاشقانہ شعر ہو کسی کے سامنے پڑھتے ہوئے جھجک نہیں ہوتی۔ خورد بزرگ کے سامنے اور بزرگ خورد کے سامنے چاہے اور قسم کی گفتگو نہ کر سکتے ہوں۔ مگر شعر پڑھنے میں تکلف نہیں ہوتا۔ شعر بھی ایسے کہ اگر نثر میں ان کا مطلب ادا کیا جائے تو منھ سے کہتے نہ بنے۔ غرضکہ اس شب کو بڑے لطف کی صحبت رہی۔

نواب: "آپ کی اداؤں نے تو مجھے ایسا فریفتہ کر لیا کہ بغیر آپ کے دیکھے مجھے چین ہی نہیں آتا۔"

میں: "یہ سب آپ کی قدردانی ہے ورنہ میں کیا اور میری حقیقت کیا۔

"ایاز قدر خود بشناس من آنم کہ من دانم۔"

نواب: "اوہو! آپ تو خواندہ معلوم ہوتی ہیں!"

میں: "جی ہاں کچھ شُد بُد پڑھا تو ہے۔"

نواب: "اور لکھنا بھی جانتی ہو؟"

میں ۔ ”جی ہاں۔ لکھ بھی لیتی ہوں۔“

نواب ۔ ”تو وہ غزل آپ ہی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔؟“

میں ۔ مسکرا کے چپ ہو رہی۔

نواب ۔ ”واللہ! کتنا پیارا خط ہے۔ اس بات سے تو بہت ہی جی خوش ہوا۔ اغیار کو رازِ دل کا حال کہتے نہیں بنتا۔ اب زبان قلم سے گفتگو ہوا کرے گی۔ ہم تو ایسا چاہتے ہی تھے۔ جہاں تک ہو سکے ایسے معاملے میں غیر کی وساطت نہ ہو۔

نہ غیروں کی وساطت ہو نہ یاروں کی شماتت ہو
جو ہیں آپس کی باتیں رازداروں کے ہمیں تم ہو

میں ۔ ”یہ آپ ہی کا شعر ہے؟“

نواب ۔ ”جی نہیں۔ والد مرحوم نے فرمایا تھا۔“

میں ۔ ”کیا خوب فرمایا ہے۔“

نواب ۔ ”ماشاءاللہ! آپ کو شاعری کا مذاق بھی ہے۔“

اچھی صورت جو خدا دے تو یہ اوصاف بھی دے
حسن تقریر بھی ہو خوبی تحریر بھی ہو

میں ۔ ”کس کا شعر ہے؟“

نواب ۔ ”انھیں کا۔“

میں ۔ ”کیا خوب فرمایا ہے۔“

نواب ۔ ”جی ہاں وہ ایسا ہی فرماتے تھے مگر واللہ آپ کی شان کے لائق ہے۔

میں ۔ ” یہ فقط آپ کی عنایت ہے
ورنہ میں کیا مری حقیقت کیا

نواب ۔ ”واہ کیا صاف صاف شعر ہے۔“

میں ۔ ”تسلیم۔“

نواب ۔ ”یہ کہیئے آپ شعر بھی کہتی ہیں۔“

میں ۔ ”جی نہیں آپ ایسے قدردانوں سے کہلوا لیتی ہوں۔“

اس بات پر پہلے تو نواب صاحب اک ذرا جھینپ ہوئے پھر مجھے مسکراتے ہوئے دیکھ کر ہنس پڑے۔

نواب: "خوب کہی۔ جی ہاں اکثر رنڈیوں کا یہ وطیرہ ہے کہ یاروں سے کہوا کے اپنے نام سے پڑھا کرتی ہیں۔"

میں: "آپ رنڈیوں کو ایسا نہ کہئے کیا مرد ایسا نہیں کرتے؟"

نواب: "واللہ سچ ہے۔ والد مرحوم کے دوستوں میں اکثر ایسے صاحب ہیں جنہوں نے کبھی ایک مصرع نہیں کہا اور ہر مشاعرے میں غزل پڑھنے کو مستعد۔ اکثر والد ہی کہہ دیا کرتے تھے۔ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ میری غزل میں شعر زائد ہوئے چھانٹ دیئے۔ میں کہتا ہوں کہ اس میں لطف ہی کیا ہے۔ والد مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے حضرت استاد کے بنائے ہوئے شعر دیوان سے نکال ڈالے۔ جھوٹی تعریفوں سے دل کو کیا خوشی ہوتی ہوگی۔"

میں: "خدا جانے! یہ بھی ایک ہوس ہے اور بری ہوس۔"

نواب: "اچھا تو اس غزل کا اور کوئی شعر یاد ہو تو پڑھئے۔"

میں: "فرض ہے ضبط نالہ و فریاد!
جس سے ناخوش ہو تم وہ عادت کیا"

نواب: "کیا شعر پڑھا ہے پھر پڑھئے گا۔ واللہ کیا نئی بات کہی ہے۔"

میں: "(شعر دوبارہ پڑھ کے) تسلیم۔ آپ قدردانی کرتے ہیں"

نواب: "شعر ہی اچھا ہے۔ اور کوئی شعر پڑھئے۔"

میں: "اس طرح میں میری غزل نہیں۔ یہ دو شعر ابھی کہے ہیں۔"

نواب: "یہ اور طرہ ہوا۔ فی البدیہہ اور ایسے شعر۔ اچھا اور کسی غزل کے شعر پڑھئے۔"

میں: "اب آپ ارشاد کیجئے۔ اس لئے میں نے سبقت کی تھی۔"

نواب: "میں پڑھے دیتا ہوں۔ مگر آپ کو غزل پڑھنا ہوگی۔"

اتنے میں کمرے کا دروازہ دھڑاک سے کھلا اور ایک صاحب، پچاس پچپن برس کا سن، سیاہ رنگت، بڑی داڑھی، ترچھی پگڑی باندھے، کمر بندھی ہوئی، تلوار لگی ہوئی کمرے کے اندر گھس آئے اور آتے ہی نہایت بے تکلفی سے میرا زانو دبا کے بیٹھ گئے۔ نواب صاحب نے میری طرف دیکھا۔ میں نے سر جھکا لیا۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ کہاں تو نواب صاحب سے یہ اقرار تھا کہ بالکل تخلیہ ہوگا۔ کمرے میں کوئی نہ ہوگا۔ کس مزے کی گفتگو کیا سحر انداز تھا۔ کیا راز و نیاز ہو رہا تھا۔ کہاں یہ بلائے مہیب نازل ہوئی

سنگ آمد و سخت آمد ۔

ہائے کیا مزے کی صحبت تھی ۔ اس کمبخت نے کیسا مزے میں خلل ڈالا نواب ابھی غزل پڑھتے کہ یہ اس کے بعد میں کچھ کہتی ۔ نواب تعریفیں کرتے ۔ کیا دل خوش ہوتا ۔ آج ہی تو ایسا ایک قدر دان ملا تھا جسے مدتوں سے میرا دل ڈھونڈھتا تھا اور آج ہی اس آفت کا سامنا ہوا ۔ خدا اس موئے کو جلدی یہاں سے اُڑائے یہ خیالات میرے دل میں تھے اور وہ خونخوار صورت آنکھوں کے سامنے تھی جس کی طرف دیکھنے سے میرا دل لرزا جاتا تھا ۔ یہ تو میری جان کو گویا دلاور خاں ہو گیا ۔ مجھے بار بار اندیشہ تھا کہ کٹار جو اس کی کمر میں ہے یا میرے کلیجے کے پار ہو گی یا خدا نخواستہ نواب کو کچھ گزند پہنچائے گی دل ہی دل میں کوستی تھی ۔ خدا غارت کرے موا کہاں سے اس وقت آ گیا ۔

آخر مجھے اور تو کچھ نہ بن پڑا بوا حسینی کو آواز دی ۔ اُنھوں نے آ کے یہ ماجرا دیکھا سمجھ گئیں بوا حسینی کی باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ ان صاحب کو کچھ جانتی بھی تھیں ۔

بوا حسینی : " خاں صاحب ! مجھے کچھ آپ سے عرض کرنا ہے ۔ ادھر تشریف لائیے "

خاں صاحب : " جو کچھ کہنا ہے وہیں سے کہو ۔ ہم لوگ کہیں بیٹھ کے اٹھتے ہیں "

بوا حسینی : " تو خاں صاحب ! کوئی زبردستی ہے "

خانصاحب : " اس میں زبردستی کیا ۔ رنڈیوں کے مکان پر کسی . . . کا اجارہ نہیں اور اگر زبردستی ہی سہی ۔ ہم تو نہیں اٹھنے کے ۔ دیکھیں تو ہمیں کون . . . اٹھا دیتا ہے "

بوا حسینی : " اجارہ کیوں نہیں ۔ جو زر خرچے گا رنڈی اسی کی ہے پھر اور کوئی اس وقت نہیں آ سکتا "

خاں صاحب : " تو زر خرچنے کو ہم حاضر ہیں "

بوا حسینی : " اچھا اس وقت اس کا کوئی موقع نہیں اور کسی وقت تشریف لائیے گا ۔"

خانصاحب : " صورت کچھ وہی ہوئی ہے کہہ دیا ہم نہیں اٹھیں گے "

میں نے دیکھا کہ نواب کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہو گیا مگر ابھی تک چپکے بیٹھے رہے ۔ کچھ منہ سے نہیں بولتے ۔

بوا حسینی : " بیٹی ۔ اچھا تو اُٹھ کے ادھر چلی آ ۔ نواب صاحب آپ کے آرام کا وقت ہے کوٹھے پر تشریف لے جائیے "

میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو اس نگوڑمارے نے زور سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اب

کیا کروں ۔

نواب :- خاں صاحب رنڈی کا ہاتھ چھوڑ دیجئے ۔ اسی میں خیریت ہے آپ بہت کچھ زیادتیاں کر چکے ہیں ۔ میں خاموش بیٹھا رہا صرف اس خیال سے کہ رنڈی کے مکان پر ہتک کرنا اچھا نہیں ۔ مگر اب . . . .

خانصاحب :- مگر اب تم کیا کر سکتے ہو دیکھیں تو کون . . . رنڈی کا ہاتھ چھڑا لیتا ہے :

میں ۔ (زور سے ہاتھ جھٹک کر) اچھا تو ہاتھ چھوڑ دیجئے میں کہیں جاتی نہیں (واقعی میں نواب کو چھوڑ کے ہرگز نہ جاتی) :

خاں صاحب نے ہاتھ چھوڑ دیا ۔

نواب :- میں کہے دیتا ہوں کہ ذرا زبان سنبھال کے گفتگو کیجئے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے شریفوں کی صحبت نہیں اٹھائی ہے

خاں صاحب :- خیر تم نے تو شریفوں کی صحبت اٹھائی ہے جو کچھ ہو سکے کر لیتا :

نواب :- یہ تو معلوم ہوا کہ آپ لڑنے پر آمادہ ہیں ، مگر رنڈی کا مکان کوئی اکھاڑہ نہیں ہے نہ میدان ۔ بہتر ہے کہ اس کو کسی اور وقت پر موقوف رکھیے اور اب تشریف لے جائیے نہیں تو . . . .

خاں صاحب :- نہیں ، تو تم مجھے گھول کے پی جاؤ گے ۔ تشریف لے جائیے یہ ایک ہی کہی ۔ تمھیں نہیں چلے جاتے :

نواب :- خاں صاحب ! جناب امیر کی قسم میں بہت طرح دیتا ہوں اس لئے کہ مجھے کسی قدر اپنی عزت کا خیال ہے ۔ والدین ، عزیز دوست جو سنیں گے نام رکھیں گے ورنہ آپ کو ابھی ان گستاخیوں کا مزا چکھا دیتا ۔ پھر میں آپ سے کہتا ہوں کہ بے فائدہ حجت نہ کیجئے تشریف لے جائیے :

خاں صاحب :- رنڈی کے گھر پر تو آتے ہو اور اماں جان سے ڈرتے ہو گویا میں کیسی تمھارے باپ کا نوکر ہوں ۔ تم اپنے گھر کے رئیس زادے ہو تو ہوا کرو ۔ رنڈی کے مکان پر تم بھی بیٹھے ہو ہم بھی بیٹھے ہیں ۔ جب ہمارا جی چاہے گا جائیں گے ۔ تم خود بیکار حجت کرتے ہو کسی کو اٹھاتے نہیں بنتا :

نواب :- اٹھا دینا تو کچھ بھی مشکل نہیں ، خدمتگاروں کو آواز دیتا ہوں تو آپ کی

کی گردن میں ابھی ہاتھ دے کے نکالے دیتے ہیں۔"

خان صاحب: "خدمتگاروں کے بل پر نہ پھولنا۔ یہ کٹار بھی دیکھا ہے۔"

نواب: "ایسے بہت کٹار دیکھے۔ جو وقت پر کام کرے وہ کٹار ہے۔ آپ کی کٹار میان سے نکلتی رہے گی یہاں تو ابھی آپ کی گردن ناپ دی جائے گی۔ پھر دیکھا جائے گا۔"

خاں صاحب: "میاں اب تمھیں گھر کو چلے جاؤ اماں جان یاد کرتی ہوں گی۔"

میں دیکھ رہی تھی کہ نواب کا چہرہ بالکل متغیر ہو گیا ہے۔ مارے غصے کے تھر تھر کانپ رہے ہیں مگر واہ ری شرافت اس پاجی نے کس قدر سخت سست کہا مگر یہ آپ ہی آپ کرکے بات کر رہے ہیں اس سے مجھے پہلے تو یہ خیال تھا کہ نواب ڈر گئے مگر یہ خیال میرا غلط نکلا۔ واقعی نواب کو اپنی عزت کا خیال تھا۔ اسی لئے طرح دے رہے تھے۔ چاہتے تھے کہ معاملہ سہولت سے رفع دفع ہو جائے۔ مگر اس پاجی کی بدزبانی بڑھتی جاتی تھی جس قدر نواب طرح دیتے تھے وہ اور شیر ہوتا جاتا تھا۔ آخر نواب نے کہا۔

نواب: "اچھا اٹھئے خاں صاحب ہم آپ دونوں یہاں سے چلے چلیں عیش باغ میں چل کے ہمارے آپ کے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔"

خاں صاحب۔ (قہقہہ مار کے) صاحبزادے! ابھی تم خود منہ چومنے کے لائق ہو اور مردوں سے خانہ جنگی کرنے کا حوصلہ کہیں کوئی چرکا کھا جاؤ گے تو اماں جان روتی پھریں گی۔"

نواب: "مردود! اب تیری بدزبانیاں حد کو پہنچ گئی ہیں دیکھ اب تجھے تیری گستاخی کی سزا دیتا ہوں۔"

یہ کہتے ہی کہتے نواب نے دولائی کے اندر سے ہاتھ نکالا۔ ہاتھ میں طپنچہ تھا۔ دن سے داغ دیا۔ خاں صاحب دھم سے گر پڑے۔ میں سن سے ہو گئی فرش پر خون ہی خون نظر آتا تھا۔ بوا حسینی جہاں کھڑی تھیں کھڑی رہ گئیں۔ طپنچہ کی آواز سن کے خانم صاحب مرزا صاحب، میر صاحب۔ خورشید۔ امیر جان، بسم اللہ جان خدمت گار، مہریاں۔ تو، میں سب دوڑے آئے۔ میرے کمرے میں بھیڑ ہو گئی۔ سب اپنی اپنی کہنے لگے۔ اتنے میں، شمشیر خاں۔ (ایک ادھیڑ سا آدمی نواب صاحب کا ملازم) نے لپک کے نواب کے ہاتھ سے طپنچہ لیا اور کہا "لے حضور اب گھر تشریف لے جائیے۔ میں سمجھ لوں گا۔"

نواب: "میں نہیں جاتا۔ اب جو کچھ ہوا ہوا۔ اور جو کچھ ہونا ہوگا ہو جائے گا۔"

شمشیر خاں: (کمر سے چھری نکال کے) جناب امیر علیہ السلام کی قسم ابھی اپنے کلیجے میں مار لونگا نہیں تو برائے خدا آپ چلے جائیے۔ آپ کا یہاں ٹھہرنا اچھا نہیں ہے۔"

اتنے میں لوگوں نے دیکھا۔ خاں صاحب کے گولی کہاں لگی ہے معلوم ہوا کہ جان کی خیریت ہے۔ بازو میں گولی لگی تھی۔

شمشیر خاں: "میں عرض کرتا ہوں کہ حضور تشریف لے جائیں۔ اس مردود کا ہوا ہی کیا ہے۔ آپ کیوں بدنام ہوتے ہیں۔"

بارے نواب صاحب بھی کچھ سمجھ کے اٹھے۔ ایک آدمی ہمارے یہاں سے ساتھ کیا گیا۔ گھر تشریف لے گئے۔ خانم نے اسی وقت مرزا علی رضا بیگ کو بلوا بھیجا وہ چوک ہی میں تھے فوراً چلے آئے۔ خانم نے علیحدہ لے جا کر نہیں معلوم کیا کان میں پھونکا۔ وہاں سے آئے تو یہ کہتے ہوئے آئے۔

مرزا: ہوگا پھینک دو مردود کو کمرے کے نیچے۔ سمجھ لیا جائیگا۔

خیر خاں صاحب کو کمرے کے نیچے تو نہیں پھینکا گیا۔ بازو پر پٹی باندھی ڈولی بلوائی گئی خاں صاحب کو بھی کسی قدر ہوش آگیا تھا۔ مکان کا پتہ پوچھا معلوم ہوا مرغ خانہ میں رہتے ہیں۔ ڈولی پر بٹھا کے ان کے گھر بھجوا دیا۔ کہاروں کو سمجھا دیا تھا۔ مکان کے قریب کہیں اتار کے چلے آنا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

سلطان صاحب کئی دن تک نہیں آئے نہ ان کا آدمی آیا۔ مجھے ان سے محبت سی ہوگئی تھی۔ یقین تھا کہ وہ اب نہیں آئیں گے اور واقعی ایسا تھا بھی۔ وضعدار آدمی تھے۔ پہلے ہی جب وہ آئے تھے۔ آدمی کی زبانی بیشتر بہت تاکید تخلیے کے لئے کر دی تھی۔ بوا حسینی نے اقرار کر لیا تھا کہ کوئی نہ آنے پائے گا مگر اتنی چوک ہوگئی کہ دروازے پر کسی کو نہ بٹھا دیا۔ خاں صاحب از غیبی ڈھیلا خدا جانے کہاں سے آن پڑے۔ سارا کھیل بگڑ گیا۔
اتفاق سے پانچ چار دن کے بعد ایک برات میں میرا مجرا آگیا تھا۔ وہاں سلطان صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ میرا پہلا مجرا نو بجے رات کو شروع ہوا تھا۔ محفل میں بات کرنا کیسا اشارے کنائے کا بھی موقع نہ تھا۔ ایک لڑکا گورا گورا کوئی نو برس کا سن بھاری کپڑے پہنے سلطان صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔ کسی ضرورت سے اٹھا۔ میرا مجرا ہو چکا علیحدہ کمرے میں پیشواز اتار رہی تھی۔ میں نے اسے اشارے سے بلایا۔ پاس بٹھایا

ایک پان لگا کے دیا۔ پوچھا۔

میں: "سلطان صاحب کو جانتے ہو؟"

لڑکا: "کون سلطان صاحب؟"

میں: "وہ جو دولہا کے برابر تمہارے پاس بیٹھے تھے۔"

لڑکا۔ (تیوری چڑھا کے) "واہ وہ ہمارے بڑے بھائی ہیں۔ انھیں ذرا سلطان صاحب نہ کہنا۔"

میں: "اچھا تو ہم کچھ دیں انھیں، دے دو گے؟"

لڑکا: "کہیں مجھ پر خفا نہ ہوں؟"

میں: "خفا نہیں ہوں گے۔"

لڑکا: "اور دو گی کیا، پان؟"

میں: "پان نہیں۔ پان تو ان کے خاصدان میں ہوں گے۔ ایسے تو یہ کاغذ دے دینا"

ایک پرچہ کاغذ کا کمرے میں فرش پر پڑا تھا۔ میں نے اس پر کوئلے سے یہ شعر لکھ دیا۔

مدتوں سے ہم ہیں محروم عتاب — بزم میں آج ان کو چھیڑا چاہیے

اور سمجھا دیا کہ یہ کاغذ ان کو آنکھ بچا کے سامنے رکھ دینا۔ ان کو معلوم بھی نہ ہو کہ لڑکے نے ایسا ہی کیا۔ میں کمرے کے پٹ کی آڑ سے جھانک رہی تھی۔ سلطان صاحب نے وہ کاغذ اٹھایا۔ پڑھا تو پہلے چہرے پر کچھ فکر کے آثار ظاہر ہوئے۔ پھر تھوڑی دیر تک پرچے کو غور سے دیکھتے رہے۔ اس کے بعد مسکرا کے جیب میں رکھ لیا۔

تمیز خاں کو اشارے سے بلایا۔ اس کے کان میں کچھ چپکے سے کہا۔ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد شمشیر خاں ہمارے پاس کمرے میں آیا۔

شمشیر خاں: "نواب صاحب نے کہا ہے کہ اس پرچے کا جواب ہم گھر پر جا کر لکھ بھیجیں گے"

دوسرا مجرا صبح کو ہوا تھا۔ اس وقت سلطان صاحب محفل میں نہ تھے۔ ان کے بغیر محفل مجھے سونی معلوم ہوتی تھی۔ گانے میں دل نہ لگتا تھا۔ آخر جوں توں مجرا ختم ہوا۔ میں گھر پر آئی۔ اس دن دن بھر شمشیر خاں کا انتظار رہا۔ بارے چراغ جلنے کے بعد وہ آیا۔ نواب کا رقعہ دیا۔ مضمون یہ تھا۔

"تمہارے شعر نے اس آگ کو جو میرے دل میں دبی ہوئی تھی کرید کر بھڑکا دیا۔ واقعی مجھے تم سے محبت ہے۔ مگر اپنی وضع سے مجبور ہوں۔ تمہارے مکان پر اب ہرگز نہ آؤں گا۔

میرے ایک بے تکلف دوست نواز گنج میں رہتے ہیں کل میں تمہیں وہاں بلوا بھیجوں گا بشرط فرصت چلی آنا۔ یہی ایک صورت ملنے کی ہے وہ بھی نو دس بجے رات تک۔

شب وصال کی کوتاہیوں کا شکوہ کیا / یہاں تو ایک نظر دیکھنے کے لالے ہیں

سلطان صاحب اس دن سے کبھی خانم کے مکان پر نہیں آئے۔ ہفتہ میں دو تین مرتبہ نواز گنج میں نواب بنے صاحب کے مکان پر بلوا بھیجتے تھے۔ عجب لطف کی صحبت رہتی تھی۔ کبھی شعر و سخن کا چرچا ہوا کبھی نواب صاحب طبلہ بجانے لگے۔ میں گانے لگی سلطان صاحب خود بھی گاتے تھے۔ تال سم سے تو کچھ ایسے واقف نہ تھے مگر اپنی غزلیں آپ خود گا لیتے تھے۔

کچھ اس طرح سے نظر بازیوں کی مشق بڑھی / میں ان کو اور وہ میری نظر بچا کر دیکھتے ہیں

جب یاد آتا ہے اس جلسے کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ گرمیوں کے دن شب مہتاب کا عالم صحن باغ میں تختوں کے چوکے پر سفید چاندنی کا فرش ہے۔ گاؤ تکیے لگے ہوئے سامان عیش و نشاط مہیا۔ باغ میں طرح طرح کے پھول کھلے ہوئے بیلے چنبیلی کی مہک سے دماغ معطر۔ خوشبودار گلوریاں بنی ہوئے حقے تخلیے کا جلسہ آپس کی چہلیں بے تکلفی کی باتیں ایسے ہی جلسوں میں بیٹھ کر دنیا و مافیہا کا تو ذکر کیا انسان خدا کو بھی بھول جاتا ہے اور اسی کی سزا ہے کہ ایسے جلسے بہت ہی جلد برہم ہو جاتے ہیں اور ان کا افسوس مرتے دم تک رہتا ہے بلکہ شاید مرنے کے بعد بھی۔

لذت صحبت عشق نہ پوچھو / خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی

واقعی سلطان صاحب کو مجھ سے اور مجھے ان سے محبت تھی۔ دونوں کے مزاج کچھ ایسے ملتے ہوئے تھے کہ اگر عمر بھر کا ساتھ ہوتا تو کبھی ملال نہ ہوتا۔ سلطان صاحب کو شعر و سخن کا شوق تھا اور مجھے بھی بچپن سے اس کی لت تھی۔ جیسے سلطان صاحب سے جیسا میرا دل ملا اور کسی سے نہیں ملا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بھی اسی سبب سے محبت کرتے تھے۔ بات بات میں شعر پڑھتے تھے۔ میں جواب دیتی تھی مگر افسوس فلک تفرقہ انداز نے وہ جلسہ صحبت کی بہت جلد برہم کر دیا۔

دل یہ کہتا ہے فراق یاد انجم دیکھ کر / ہائے کیا کیا صحبتیں راتوں کی برہم ہو گئیں

رسوا۔ اچھا وہ تو سب کچھ ہوا آپ کے قدم کی برکت سے ایسے ایسے بہت سے جلسے برہم ہو گئے ہوں گے۔

امراؤ: "واہ مرزا صاحب! تو کیا میرے دشمن کچھ پیرے ہیں؟ یہ آپ نے خوب کہی۔"

رسوا: "یہ تو میں نہیں کہہ سکتا۔ مگر سلامتی سے جہاں آپ تشریف لے گئیں صفائی ہو گئی۔"

امراؤ: "آپ جو چاہے کہیئے۔ اگر ایسا جانتی کہ آپ یہ کہیں گے تو اپنی روداد ہرگز نہ بیان کرتی۔ خیر۔ اب قصور ہوا۔"

رسوا: "قصور! ابی تو آپ نے زندگی بھر میں ایک کام کیا جس سے آپ کا نام دنیا میں رہ جائے گا۔ خواہ نیکنامی کے ساتھ خواہ بدنامی کے ساتھ اس کا میں ذمہ نہیں کرتا۔ اب اس بات کو یہیں تک رہنے دیجئے۔ ذرا اس غزل کے دو تین شعر اور یاد ہوں تو پڑھ دیجئے۔"

امراؤ: "آپ بھی آدمی کو خوب بناتے ہیں۔"

رسوا: "خیر، بگاڑتا نہیں۔ اچھا اب شعر پڑھیئے۔"

امراؤ: "اچھا سنیئے۔ ایک مطلع اور دو شعر اور یاد ہیں۔"

درد دل کی لذتیں صرف شب غم ہو گئیں — طول فرقت سے بہت بے تابیاں کم ہو گئیں
وہ جو بیٹھے سوگ میں زلف رسا کھولے ہوئے — حسرتیں میری شریک بزم ماتم ہو گئیں
ہمنشیں دیکھی نحوست داستان ہجر کی — صحبتیں جمنے نہ پائی تھیں کہ برہم ہو گئیں

اسی زمانے میں نواب جعفر علی خاں صاحب کی ملازم ہوئی۔ سن شریف کوئی ستر برس کے قریب تھا۔ منہ میں ایک دانت نہ تھا پشت خم ہو گئی تھی۔ سر میں ایک بال سیاہ نہ تھا مگر اب تک اپنے کو پیار کرنے کے لائق سمجھتے تھے۔ ہائے وہ انکا چکنی کا انگرکھا اور گلبدن کا پاجامہ لال نیفہ مصالحہ دار ٹوپی، کاکلیں بٹی ہوئی عمر بھر نہ بھولیں گے۔

آپ کہیئے گا اس عمر اور ایسی حالت میں رنڈی نوکر رکھنا کیا ضرور تھا؟ سنیئے مرزا صاحب اس زمانے کا فیشن یہی تھا۔ کوئی امیر رئیس ایسا بھی ہو گا جس کے پاس رنڈی نہ ہو۔ نواب صاحب کی سرکار میں جہاں اور سامان شان و شوکت کے تھے وہاں سلامتی منانے کے لئے جلوسیوں میں ایک رنڈی کا بھی اسم تھا۔ چھتر روپیہ ماہوار ملتے تھے۔ دو گھنٹے کے لئے مصاحبت کرنے جاتی تھی۔ اور تکلف سنیئے نواب بوڑھے ہو گئے تھے۔ مگر کیا مجال نو بجے کے بعد دیوان خانہ میں بیٹھ سکیں۔ اگر کسی دن اتفاق سے دیر ہو گئی کھلائی آ کے زبردستی اٹھا لے جاتی تھی۔ نواب کی والدہ زندہ تھیں ان سے ایسی طرح ڈرتے تھے جس طرح پانچ برس کا بچہ ڈرتا ہے۔ بیوی سے بھی انتہا کی محبت تھی۔ بچپن میں شادی ہوئی تھی۔ مگر سوائے عشرہ محرم اور شبرات کے

کسی دن علیحدہ سونے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔

آپ تو ہنستے ہوں گے مگر میرے دل سے پوچھئے بیشک پیار کرنے کے قابل تھے۔ اس بڑھاپے میں جب وقت سوز پڑھتے تھے دل لوٹ جاتا تھا۔

فن موسیقی میں ان کو کمال تھا۔ کیا مجال کوئی ان کے سامنے گا سکے۔ اچھے اچھے گویوں کو ٹوک دیا۔ سوزخوانی میں یکتا تھے۔ سند ی سوز میر علی صاحب کے ان کو پہنچے ہوئے تھے۔ ان کی ملازمت سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ سیکڑوں سوز یاد ہو گئے۔ دور دور میری شہرت ہو گئی

خانم کی تعزیہ داری تمام شہر کی رنڈیوں سے بڑھ چڑھ کے تھی۔ امام باڑہ میں ٹھیکے شیشہ آلات جو تھے نئے تھی نادر تھی۔ عشرۂ محرم میں دس تک روز مجلس ہوتی تھی۔ عاشورے کے دن سیکڑوں محتاج مومنین کی فاقہ شکنی کی جاتی تھی۔ چہلم تک ہر جمعرات کو مجلس ہوتی تھی۔

میری سوزخوانی مشہور تھی۔ ایسی ترکیبیں اور کسی کو کب یاد تھیں۔ بڑے بڑے سوزخوان میرے سامنے منھ نہ کھول سکتے تھے۔ اسی سوزخوانی کی بدولت نواب ملکہ کشور محل تک میری رسائی ہوئی جہاں پر خلافی کی تعریف کی سرکار شاہی سے مجھ کو بہت کچھ ہر محرم میں عطا ہوتا تھا۔

مرثیہ خوانوں میں میرا اہم تھا۔ شب کو امام باڑہ میں ماتم کر کے مجھے در دولت پر حاضر ہونا پڑتا تھا۔ کوئی ۲ بجے رات کو وہاں آتی تھی۔

جس زمانے میں بسم اللہ کی نسبت ہوئی تھی نواب محسن صاحب کے چچا کربلائے معلیٰ گئے ہوئے تھے۔ بسم اللہ کی نسبت کو کوئی چھ مہینے گذرے ہوں گے کہ وہ کربلا سے تشریف لائے ان کی لڑکی کی نواب کے ساتھ منگنی ہو گئی تھی انھوں نے آتے کے ساتھ ہی شادی پر زور دیا نواب صاحب بسم اللہ جان پر مرتے تھے۔ ادھر بسم اللہ نے گھر میں بیٹھ جانے کا وعدہ دے رکھا تھا۔ صاف انکار کر دیا مگر انکار چلتا کب تھا۔ شاہی زمانہ ان کی لڑکی پر گالی چڑھ چکی تھی۔ وہ کب مانتے تھے۔ ایک شب کو نواب کے مکان پر جلسہ ہے۔ مصاحبین جمع ہیں۔ بسم اللہ نواب کے پہلو میں بیٹھی ہے۔ اس رات کو بسم اللہ کے ساتھ میں بھی چلی گئی تھی۔

سامنے بیٹھی گا رہی ہوں۔ نواب صاحب طنبورہ چھیڑ رہے ہیں۔ نواب کے ایک مصاحب خاص دلبر حسین طبلہ بجا رہے ہیں۔ اتنے میں ایک خبردار نے خبر دی کہ بڑے نواب صاحب (نواب صاحب کے چچا) تشریف لاتے ہیں۔ نواب صاحب یہ سمجھے کہ آئے ہیں تو اندر محل میں بیگم صاحب (نواب صاحب کی والدہ) کے پاس جائیں گے۔ ہم سب کو بھی یہی خیال تھا مگر وہ درانہ دیوانخانے میں گھستے چلے آئے آ کے جو دیکھا تو یہ جلسہ ہے آگ بگولہ ہو گئے۔

خیر ان کے آنے کے ساتھ ہی گانا تو موقوف ہوا۔ نواب صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے۔

بڑے نواب: "خیر۔ اب تعظیم و تکریم کو رہنے دیجئے۔ مجھے ایک امر ضروری عرض کرنا ہے ورنہ آپ کے عیش میں خلل انداز نہ ہوتا۔"

نواب: "ارشاد۔"

بڑے نواب: "آپ بچے ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں میرے چھوٹے بھائی نواب احمد علی خاں مرحوم نے والدہ مرحومہ کے سامنے انتقال کیا تھا۔ اس وجہ سے آپ محجوب الارث ہیں۔ کوئی حق آپ کا اس جائداد میں نہیں ہے جس پر آپ قابض اور متصرف ہیں۔ بے شک والدۂ مرحومہ نے آپ کو پالا تھا اور مرتے وقت آپ کے نام وصیت بھی کر گئی ہیں مگر وہ کوئی چیز نہیں۔ صرف ایک ثلث جائداد بنا بر اس وصیت نامہ کے آپ کو مل سکتی ہے۔ لوگوں کے کہنے سننے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایک ثلث سے زیادہ صرف کر چکے ہیں۔ بقیہ ثلث کا مجھ کو دعویٰ نہیں اور زیادہ کی آپ سے بازپرس کی جائے گی۔ اس لئے کہ آپ میرے خون جگر ہیں۔" اس کے بعد بڑے نواب صاحب آبدیدہ ہو گئے۔ مگر پھر ضبط کر کے "آپ اس جائداد پر مدت تک قابض و متصرف رہے۔ میری ذاتی جائداد میرے خرچ کے لئے کفالت کرتی ہے اور اس جائداد کے بھی آپ ہی وارث ہوتے مگر آپ کی بد وضعی نے مجھ کو مجبور کیا کہ آپ کو اس جائداد موروثی سے بے دخل کر دوں۔ بزرگوں کی نیک کمائی حرام کاری میں اٹھانے کے لئے نہیں ہے۔ منتظم الدولہ کے آدمی میرے ہمراہ ہیں۔ اس وقت تمام گھر کا تخلیہ ہوگا۔ آپ فوراً مع ارباب نشاط یہاں سے تشریف لے جائیے۔"

نواب: "تو اس جائداد میں میرا کوئی حق نہیں؟"

بڑے نواب: "جی نہیں۔"

نواب: "اچھا ایک ثلث پانے کا مستحق ہوں۔"

بڑے نواب: "وہ آپ لے چکے اور اگر آپ کو کچھ دعویٰ ہے تو دردولت پر تشریف لے جائیے۔ میرے نزدیک آپ کا ایک حبّہ نہیں۔"

نواب: "تو اچھا اماں جان کو میں اپنے ساتھ لیتا جاؤں گا۔"

بڑے نواب: "وہ آپ سے دستبردار ہوتی ہیں وہ میرے ساتھ کربلا جائیں گی۔"

نواب: "اچھا میں کہاں جاؤں؟"

بڑے نواب: "یہ میں کیا جانوں۔ یہ اپنے مصاحبین اور ملازمین اور معشوقہ سے

دریافت کیجئے۔"

نواب: "اچھا تو میرے کپڑے، اسباب وغیرہ تو دیدیجئے۔"

بڑے نواب: "اس مکان میں آپ کا کوئی اسباب نہیں ہے۔ نہ آپ کے ذاتی بنوائے ہوئے کپڑے ہیں۔"

اس کے بعد منتظم الدولہ کے آدمی دیوان خانے میں چلے آئے۔ نواب صاحب کو مع مصاحبین و ارباب نشاط گھر سے باہر کیا۔

ہم لوگوں نے گھر سے نکلتے ہی ڈولیاں کرایہ کر لیں۔ چوک کا راستہ لیا۔ مصاحبین اور نواب صاحب خدا جانے کہاں گئے۔

سنا ہے کہ مصاحبین ایک ایک کر کے راستہ ہی سے رخصت ہو گئے۔ نواب صاحب کی والدہ کا ایک قدیم ملازم مخدوم بخش جس کو نواب صاحب نے بیکار سمجھ کر نوکری سے برطرف کر دیا تھا راستے میں ملا۔ اس نے حال دریافت کیا۔ ان کی بیکسی پر ترس کھا کے اپنے گھر لے آیا۔

نواب صاحب کے گھر سے آنے کے بعد شب کو بسم اللہ کے کمرے میں جلسہ ہے۔ میاں حسنو نواب صاحب کے خاص کارکن مثل صاحب دوست جہاں نواب کا پسینہ گرے وہاں اپنا خون گرانے والے تشریف رکھتے ہیں۔ آج ہی کچھ نہیں آ کے یہاں بیٹھے ہیں نواب کے چوری چھپے آیا کرتے تھے مگر آج کھلے خزانے ترے سے ٹھاٹھ سے بیٹھے ہیں۔ اس وقت آپ بسم اللہ جان پر گویا بے شرکت واحد سے و بسمہ مرزا حسنت غیرے قابض و متصرف ہیں۔ نوکری کی گفتگو ہو رہی ہے۔

حسنو: "دیکھو بسم اللہ جان! نواب سے تو اب کوئی امید نہ رکھو۔ میں جو کچھ ہو سکے دیدیا کروں۔ غریب آدمی ہوں زیادہ تو میری اوقات نہیں جو نواب صاحب دیتے تھے اس کا نصف بھی ممکن نہیں۔ مگر ہاں کسی نہ کسی طرح آپ کو خوش رکھوں گا۔"

بسم اللہ: "غریب آدمی ہو۔ یہ نہیں کہتے کہ نواب کی دولت لوٹ لوٹ کے گھر میں بھر لی اور پھر ہم سے غریبی بیان ہوتی ہے۔ ایسے غریبوں کو تاؤ تو نو من تیل بھی سے کم نہ نکلے۔"

حسنو: "ہیں ہیں! تم تو ایسا نہ کہو وہ نواب کے پاس تھا ہی کیا جو میں گھر بھر لیتا۔ کیا میری والدہ صاحبہ کے پاس کچھ کم تھا۔"

بسم اللہ: "آپ کی والدہ صاحبہ تو خجستہ نواب سرفراز محل کی خاص دائیوں میں

تھیں نہ ؟"

میر حسینو ۔ " (جھینپ کر) وہ جو کوئی ہوں ۔ جب مری ہیں تو کوئی چار ہزار کا زیور

چھوڑ کے مری ہیں "

بسم اللہ ۔ " وہ آپ کی بیوی ہے یار کے ساتھ نکل گئیں ۔ آپ کے پلے کیا پڑا میرے

آگے ذرا شیخی نہ بگھاریے مجھے رتی رتی آپ کا حال معلوم ہے "

حسنو ۔ " تو کیا والدہ کے پاس کچھ کم تھا ! "

بسم اللہ " والد آپ کے نواب محسن علی خاں کے چڑیماروں میں تھے "

حسنو " چڑیماروں میں ! "

بسم اللہ " اچھا وہ مرغ بازوں میں ہی "

حسنو " مرغ بازوں میں تھے ؟ "

بسم اللہ " اچھا وہ بٹیر باز ہی ۔ تھا تو چڑیمار کا کام "

حسنو ۔ " لیجئے ۔ آپ تو مذاق کرتی ہیں "

بسم اللہ ۔ " میں کھری کہتی ہوں اسی سے بری مشہور ہوں اور کہتی بھی نہ تمہارے

چھچھورے پن پر جی جل گیا ۔ یوں تم آتے تھے میں نے کبھی منع نہیں کیا آخر یہی تو نواب پر

یہ واردات گذری آج ہی آپ نے میرے منہ در منہ نوکری کا پیغام دیا ہوش کی دوا کرو ۔

تم کیا نوکر رکھو گے ۔ یہی نہ ایک مہینہ دو مہینہ ۔ تین مہینے سہی "

حسنو " چھ مہینے کی تنخواہ جمع کر دوں "

بسم اللہ " زبان سے "

حسنو " یہ لو (سونے کے جڑاؤ کڑے کمر سے نکال کے) تمہارے نزدیک کتنے کا

مال ہوگا ! "

بسم اللہ ۔ " میں دیکھوں (کڑے حسنو کے ہاتھ سے لیکے اپنے ہاتھوں میں پہن لئے)

کل چھنا مل کے لڑکے کو دکھاؤں گی نگ نہیں اچھے ہیں ۔ اچھا آپ تشریف لے جائیے اس

وقت تو مجھے چھٹن باجی نے بلا بھیجا ہے ۔ ٹھہر نہیں سکتی ۔ کل اسی وقت آیئے گا "

حسنو " تو کڑے اتار دیجئے "

بسم اللہ " دنیا اللہ ! کوئی چوروں سے بھوار ہے ۔ میں تمہارے کڑے کچھ کھا تو لوں گی

اس وقت میرے ہاتھ میں سادی پٹریاں پڑی ہوئی ہیں ۔ اماں جان سے چھپ کے جاتی ہوں

ان سے کپڑے مانگوں گی تو کہیں گی کیا کرو گی۔ اس لئے ذرا بقچہ میں ڈال لیئے صبح کو دے جانا۔"

حسنو۔ "کپڑے دیدیجئے برے نہیں ہیں، نہیں تو کیا بات تھی۔ تم پر سے صدقے کئے تھے۔"

بسم اللہ۔ "تو کیا آپ کی اماں کے ہیں۔ انھوں نے استعمال کیا پھر بھی آپ کا مال نہیں۔"

حسنو۔ "میں نے یوں ہی تھیں دکھلائے تھے، میرا مال نہیں ہے۔"

بسم اللہ: "جیسے میں پہچانتی نہیں۔ یہ وہی کپڑے ہیں جو نواب نے اُس دن میرے سامنے گروی کو دیئے تھے۔"

حسنو۔ "لو اور سنو! یہ کب؟"

بسم اللہ۔ "یہ جب کہ جس دن بہن امراؤ کے مجرے کی فرمائش ہوئی تھی۔ بہن امراؤ نے ضد کی کہ میں پورے سو لوں گی۔ نواب کے پاس خرچ نہ تھا۔ میرے سامنے صندوقچہ سے نکال کے کپڑے پھینک دیئے تھے (پھر میری طرف مخاطب ہو کے دیکھا) بہن امراؤ یہ وہی کپڑے ہیں نہ؟"

میں: "مجھ سے کیا پوچھتی ہو۔ کیا تم جھوٹ کہو گی؟"

بسم اللہ: "لے غضب خدا کا۔ اب یہ کپڑے آپ کو نہ دیئے جائیں گے۔ نواب کے کپڑے ہیں ہم نے پہچانے۔ اب ہم نہ دیں گے۔"

حسنو! "لو اچھی کہی۔ اور وہ روپئے جو ہم نے دیئے ہیں۔"

بسم اللہ: "روپئے تم کہاں سے لائے۔ وہ بھی نواب کا مال تھا۔"

حسنو۔ "جی نہیں۔ بھاوج سے بیاز دنہ (سودی) لاکے دیئے تھے۔"

بسم اللہ: "اچھا تو بھاوج کو بھیج دیجئے ہم اس کو روپئے دیدیں گے آپ ٹہلئے۔"

حسنو۔ "کپڑے تو میں لے جاؤں گا۔"

بسم اللہ: "میں تو نہ دوں گی۔"

حسنو۔ "تو کچھ زبردستی ہے؟"

بسم اللہ۔ "جی ہاں زبردستی ہے۔ اب چپکے سے کھسک جائیے نہیں تو . . ."

حسنو۔ "اچھا تو رہنے دیجئے کل دیکھ لیجئے گا۔"

بسم اللہ: "کل دیکھا جائے گا۔"

دیکھا جانے لگا۔ بسم اللہ نے اس پر تو صاف کہا کہ میاں حسنو کو چپکے سے اُٹھ کے چلے جانا ہی پڑا۔

بات یہ تھی کہ نواب صاحب جب سے لگے رہے تھے، چاہتے تھے کہ اسکو نوکر دل سے حساب بھی کی ہے۔ اس وقت جس قدر اسباب جس جس کی ضرورت تھا اس کو سود اور اصل کے روپے دے کے چھڑا لیا حسنو سے جب اس کڑے کی جوڑی کے بارے میں کہی تو صاف مکر گیا کہ میری معرفت گروی نہیں ہوئے۔

انہی سے میاں حسنو کی کور دبی تھی۔

بسم اللہ: اے ہے نگوڑے چلے جاتے ہیں، دیکھا آپ نے یہ بڑا تابر ہے نواب کا گھرانا ان موذیوں نے نس نس کیا۔ ... تک بیچ کھائی آج ہی آبرو داؤ پر لگا ہے۔ یہ کڑے بیچ اس کو کب دیتی ہوں۔ ... چودھری کا تو مال ہے۔

میں: وہ ہرگز نہ دوں گی۔ دنیا ہے تو نواب کو میرا احسان ہوگا۔

بسم اللہ: نواب تو کبھی نہ دوں گی۔ آپ گیارہ سو کی جوڑی ہے۔ ... سے سود ... زیادہ ... سود ... دس بیس سود لگے بھی۔

میں: بیٹھا رہا جی یوں کہوں وہ بیٹھ گئی۔

بسم اللہ: ... پیچھے نکلا اور جب بڑے نواب سے پوچھا تو صاف مکر گیا۔ اگر یہ کچھ زیادہ ٹیں ٹیں کریں گے تو ان کو کوتوالی کا چبوترہ دکھا دوں گی۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ نواب صاحب تشریف لائے۔ پاپیادہ اکیلے۔ چہرے پر اداسی چھائی ہوئی۔ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے۔ نہ وہ شان نہ وہ شوکت نہ وہ رعب نہ وہ آب نہ وہ بے تکلفی۔ چپکے سے آ کے بیٹھ رہے۔

سچ کہوں، میری تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے مگر میں نے اپنے کو روکا۔ مگر واہ ری بسم اللہ رنڈی ہو تو ایسی ہو۔ آتے کے ساتھ ہی کڑوں کا قصہ چھیڑ دیا۔

بسم اللہ: نواب، دیکھو یہ وہی کڑے کی جوڑی ہے جو تم نے اس دن حسنو کو گروی کرنے کو دی تھی۔

نواب: وہ تو مکر گیا تھا کہ میرے ہاتھوں گروی نہیں ہوئے۔

بسم اللہ: "کتنے برس گزرے ان کو مرے ہوئے؟"

نواب: "یہ تو یاد نہیں، شاید ڈھائی سو برس یا سوا دو سو کچھ ایسے ہی تھے۔"

بسم اللہ: "ارے سود کیا تھا؟"

نواب: "سود کا حساب ہی کس نے آج تک کیا۔ جو چیز گروی ہوئی پھر اس کے چھڑانے کی نوبت کبھی نہیں آئی، تو پھر سود کا حساب کیا جاتا؟"

بسم اللہ: "اچھا تو یہ کہیے جب سے لوٹ ہی؟"

نواب: "بے شک۔"

بسم اللہ: "کچھ کہو میاں، تم خود کو مرزا صاحب کے یہاں کچھ..."

نواب: "نہیں، میرے سر کی قسم ایسا نہ کیا کرتے ہیں۔"

بسم اللہ: "یہ سچ ہے اس کے باپ دادا تو بہت امیر تھے۔"

نواب: "خیر وہ تو اپنے منہ سے کہتا ہے۔"

میں اپنے دل میں نواب کی ہمت پر آفرین کرنے لگی۔ واہ ری ہمت کیا کہنا تھا رئیس ہیں نا۔

بسم اللہ کی بے مروتی دیکھیے، نواب صاحب سے بات بھی نہ کی، گھر جانے کا بہانہ کر کے ان کو سویرے سے رخصت کر دیا۔ نواب صاحب جانے کے بعد ... اس واقعہ کے دو دن بعد تیسرے دن کا ذکر ہے، میں شام کے وقت بیٹھی ہوئی تھی ... ایک بڑھیا عورت سی آئی، خانم صاحب کو جھک جھک کے سلام کیا۔ خانم نے بیٹھنے کا اشارہ کیا، سامنے بیٹھ گئی۔

خانم: "کہاں سے آئی ہو؟"

بڑھیا: "کیا بتاؤں کہاں سے آئی ہوں، کوئی ہے تو نہیں؟" ...

خانم: "بوا یہاں کون ہے؟ میں ہوں تم ہو اور یہ چھوکری۔ اس کو بات سمجھنے کی تمیز نہیں، کہو۔"

بڑھیا: "مجھے نواب فخر النسا بیگم نے بھیجا ہے۔"

خانم: "کون فخر النسا بیگم صاحبہ؟"

بڑھیا: "اے تم نہیں جانتیں نواب چھبن صاحب..."

خانم: "سمجھی، کہو۔"

بڑھیا: "بیگم صاحب نے مجھے بھیجا ہے۔ آپ بسم اللہ جان کی اماں ہیں نا؟"

خانم: "ہاں، بات کہو۔"

بڑھیا: "بیگم صاحب نے کہا ہے کہ چھبن صاحب میرا اکلوتا لڑکا ہے میں کبھی اس پر پروانہ ہوں اور اس کا باپ بھی پروانہ تھا۔ میرے نازوں کا پالا ہے اور اس کا چچا بھی دشمن نہیں ہے اپنی اولاد سے بڑھ کے سمجھتا ہے۔ اس کی بیٹی ایک اکلوتی لڑکی ہے چھبن کی منگیتر۔ لڑکی پر گالی چڑھ چکی ہے چھبن نے شادی سے انکار کر دیا ہے اسی پر چچا کو بُرا معلوم ہوا۔ میں نے دخل نہیں دیا۔ سب تنبیہہ کے لئے کیا گیا ہے۔ تمہاری لڑکی کا عمر بھر کا گھر ہے جو تنخواہ لڑکا دیتا تھا اس سے دس اوپر مجھ سے لینا مگر اتنا احسان مجھ پر کرو کہ شادی پر راضی کر دو۔ شادی کے بعد سب جائداد اسی کی ہے۔ سوا اس کے اور کون ہے میری اور چچا کی جان و مال کا مالک ہے۔ مگر۔ اتنا خیال رکھو کہ یہ گھر تباہ نہ ہونے پائے۔ اس میں تمہارا بھی بھلا ہے اور ہمارا بھی۔ آئندہ تم کو اختیار ہے۔"

خانم: "بیگم صاحب کو میری طرف سے آداب تسلیمات کہنا اور عرض کرنا کہ جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا ہے خدا چاہے تو وہی ہوگا۔ میں آپ کی عمر بھر کی لونڈی ہوں مجھ سے کوئی امر خلاف نہ ہوگا۔ خاطر جمع رکھیئے۔"

بڑھیا: "مگر بیگم صاحب نے کہا ہے کہ چھبن کو اس کی خبر نہ ہونے پائے بڑا ضدی لڑکا ہے۔ اگر کہیں معلوم ہوگا تو ہرگز نہ مانے گا۔"

خانم۔ (ماما سے) کیا مجال (مجھ سے) دیکھ چھوکری کہیں کسی سے یہ قصہ نہ لے بیٹھنا۔"

میں۔ "جی نہیں۔"

اس کے بعد بڑھیا نے علیحدہ سے جا کے خانم سے چپکے چپکے باتیں کیں وہ میں نے نہیں سُنیں۔ ماما کے رخصت کے وقت خانم کو اتنا کہتے سنا:

خانم: "میری طرف سے عرض کرنا اس کی کیا ضرورت تھی۔ ہم لوگ تو قدیمی نمک خوار ہیں۔"

بڑھیا کے جانے کے بعد خانم نے بسم اللہ کو بلا بھیجا اور کچھ ایسے دو ایک حرف کان میں پھونک دیئے کہ اب جو نواب صاحب آئے تو وہ آؤ بھگت ہوتی کہ شرافت کے زمانے میں بھی کبھی نہ ہوئی تھی۔

نواب صاحب بیٹھے ہیں۔ بسم اللہ سے اختلاط کی باتیں ہو رہی ہیں۔ میں بھی موجود ہوں کہ اتنے میں خانم صاحب بسم اللہ کے کمرے کے دروازے پر جا کے کھڑی ہوئیں۔

خانم:- "اے لوگو! ہم بھی آدمی ہیں؟"

بسم اللہ:- "(نواب سے) ذرا سرک بیٹھو اماں آتی ہیں (خانم سے) آئیے۔"

خانم نے سامنے آتے ہی نواب کو تین تسلیمیں کیں۔ میں نے آج کے دن کے سوا خانم کو اس طرح مودب ہو کر سلام کرتے نہ دیکھا تھا۔

خانم:- "(نواب سے) حضور کا مزاج کیسا ہے؟"

نواب:- "(گردن جھکا کے) الحمدللہ"

خانم۔ خدا خوش رکھے۔ ہم لوگ تو دعا گو ہیں ہزار پڑھ جائیں مگر پھر بھی وہی ٹکے کی مالزادی آپ کے ہاتھ کے دیکھنے والے۔ آپ کو خدا نے رئیس کیا ہے۔

اس وقت ایک عرض لے کے حاضر ہوئی ہوں۔ یوں تو بسم اللہ خدا رکھے سال بھر سے آپ کی خدمت میں ہے مگر میں نے کبھی آپ کو تکلیف نہیں دی بلکہ حضور کے سلام کو بہت کم حاضر ہونے کا اتفاق ہوا ہوگا۔ اس وقت ایسی ہی ضرورت تھی جو چلی آئی۔

خانم تو یہ باتیں کر رہی ہیں۔ بسم اللہ ان کا منہ دیکھ رہی ہیں کہ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں کسی قدر بات کا پہلو سمجھے ہوئے تھی۔ نواب اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ نواب کا یہ حال ہے کہ چہرے سے ایک رنگ جاتا ہے اور ایک آتا ہے۔ آنکھیں جھپی جاتی ہیں مگر چپکے بیٹھے ہیں۔

خانم:- "تو پھر عرض کروں؟"

نواب:- "(بہت ہی مشکل سے) کہیئے۔"

خانم۔ "ذرا بوا حسینی کو بلا لینا"

میں گئی اور بوا حسینی کو بلا لائی۔

خانم:- "(بوا حسینی سے) بوا ذرا دوشالے کی جوڑی تو اٹھا لانا۔ وہی جو کل بکنے کو آگئی ہے"

"بکنے کو آئی ہے" ان لفظوں نے نواب پر ولی اثر کیا جیسے کسی پر دفعتہً بجلی گر پڑے۔ مگر بہت ضبط کر کے چپکے بیٹھے رہے۔ اتنے میں بوا حسینی دوشالے لے آئیں کیا بڑھیا متن زرکار دوشالہ کہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے"

خانم۔ (نواب کو دوشالہ دکھا کے) دیکھیئے یہ دوشالہ کل بکنے آیا ہے۔ سوداگر دو ہزار کہتا ہے۔ پندرہ سو تک لوگوں نے لگا دیئے ہیں وہ نہیں دیتا۔ میرے خیال میں سترہ بلکہ اٹھارہ تک

مہنگا نہیں ہے۔ اگر حضور پرورش کریں تو بھلا اس بڑھاپے میں آپ کی بدولت ایک دوشالہ تو اوڑھ لوں۔"

نواب خاموش بیٹھے رہے۔ بسم اللہ کچھ بولا ہی چاہتی تھیں کہ خانم نے نواب سے کہا۔

خانم: "میری لڑکی تو ہمارے بیچ میں نہ بولنا۔ تو تو آئے دن فرمائش کیا کرتی ہے۔ ایک فرمائش ہماری بھی سہی۔"

نواب پھر چپکے بیٹھے ہیں۔

خانم: "اوئی نواب ابھی سے سوچ بھلا جو جلدی دے جواب۔ کچھ تو ارشاد کیجئے۔ سکوت سے تو بندی کو تسکین نہ ہوگی۔ ہاں نہ سہی نہیں سہی کچھ تو کہہ دیجئے۔ میرے دل کا ارمان تو نکل جائے۔"

نواب اب بھی چپ ہیں۔

خانم: "اللہ حضور! جواب دیجئے۔ یوں تو میری حقیقت ہی کیا ہے موئی بازاری کسبی۔ مگر آپ ہی لوگوں کی عزت دی ہوئی ہے۔ برائے خدا ان چھوکریوں کے سامنے تو مجھ بڑھیا کو ذلیل نہ کیجئے۔"

نواب: (آب دیدہ ہوکر) خانم صاحب! اس دوشالے کی کوئی اصل نہیں ہے مگر تم کو شاید میرا حال معلوم نہیں۔ کیا بسم اللہ جان نے کچھ نہیں کہا اور امراؤ جان بھی تو اس دن تھیں۔"

خانم: "مجھ سے کسی نے بھی کچھ نہیں کہا۔ کیوں خیر تو ہے؟"

بسم اللہ کچھ بولنے کو تھیں کہ خانم نے آنکھ کا اشارہ کیا وہ چپ رہیں ٹال کے ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔ میں پہلے ہی سے بت بنی بیٹھی تھی۔

نواب: "اب ہم اس قابل نہیں رہے جو آپ کی فرمائشوں کو پورا کرسکیں۔"

خانم: "آپ کے دشمن اس لائق نہ رہے ہوں اور میں ایسی چھچھوری نہیں جو روز فرمائشیں کیا کروں۔ فرمائشیں کریں نہ کریں بسم اللہ کریں بھلا یہ تو کہئے آج تک میری فرمائشیں کیا اٹھا رکھا؟"

یہ کہہ کے خانم نے ایک آہ سرد بھری۔ "ہائے تقدیر! اب ہم اس لائق ہوگئے کہ ایسے ایسے رئیس ایک ذرا سے چیتھڑے کے لئے ہم سے منہ چھپاتے ہیں۔"

میں دیکھ رہی تھی کہ خانم کا ایک ایک فقرہ نواب کے دل پر نشتر کا کام دے رہا تھا۔

نواب: "خانم صاحب آپ سب لائق ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں اب میں، اس لائق نہیں رہا
رہا جو کسی کی فرمائش پوری کر دوں۔"

اس کے بعد نواب نے اپنی تباہی کا مختصر حال کہا۔

خانم: "خیر میاں! اس لائق تو آپ نہیں رہے کہ ایک ادنیٰ سی فرمائش پوری کریں۔ پھر تو رنڈی کے مکان پر آنا کیا فرض تھا حضور، کو نہیں معلوم کہ بیسوائیں چار پیسے کی میت ہوتی ہیں۔ کیا آپ نے یہ مثل نہیں سنی کہ رنڈی کس کی جورو؟ ہم لوگ مروت کریں تو کھائیں کیا۔ یوں آئیے آپ کا گھر ہے۔ میں منع نہیں کرتی مگر آپ کو اپنی عزت کا خود ہی خیال چاہیے۔"

یہ کہہ کے خانم فوراً کمرے سے چلی گئیں۔

نواب: "واقعی مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ اب انشاء اللہ نہ آؤں گا۔"

یہ کہہ کے وہ اٹھنے کو تھے کہ بسم اللہ نے دامن پکڑ کے بٹھا لیا۔

بسم اللہ: "اچھا تو اس کڑے کی جوڑی کے بارے میں کیا کہتے ہو؟"

نواب۔ (کسی قدر ترش ہو کے) "میں نہیں جانتا۔"

بسم اللہ: "اے وہ تو تم بالکل ہی خفا ہو گئے۔ جاتے کہاں ہو ٹھہرو۔"

نواب: "نہیں بسم اللہ جان اب مجھ کو جانے دو۔ اب میرا آنا بیکار ہے۔ جب خدا ہمارے دن پھیرے گا تو دیکھا جائے گا۔ اور اب کیا دن پھریں گے۔"

"میں تو نہ جانے دوں گی۔"

"تو کیا اپنی ماں سے جوتیاں کھلواؤ گی؟"

(مجھ سے) ہاں سچ تو ہے بہن امراؤ۔ آج یہ بڑی بی کو ہوا کیا تھا برسوں ہو گئے میرے کمرے میں آج تک جھانکی نہیں۔ آج آئیں بھی تو قیامت برپا کر گئیں۔ بھئی اماں جان چاہے خفا ہو جائیں چاہے خوش ہوں میں نواب سے رسم نہیں ترک کر سکتی۔ آج نہیں ہے، ان کے پاس نہ سہی۔ ایسی بھی کیا آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لینا چاہیے۔ آخر یہی نواب ہیں جن کی بدولت ہزاروں روپیے اماں جان نے پائے آج زمانہ ان سے پھر گیا تو کیا ہم بھی اوروں کی طرح آنکھیں پھیر لیں۔ گھر سے نکال دیں، یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اب اگر اماں نے زیادہ تنگ کریں گی تو بہن امراؤ میں سچ کہتی ہوں (نواب کا ہاتھ پکڑ کر) ہم کسی طرف کو نکل جاؤں گی میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

میں بسم اللہ کی باتیں بہت اچھی طرح سمجھ رہی تھی، ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔

بسم اللہ: "اچھا تو نواب تم کہاں رہتے ہو؟"

نواب: "کہاں بتاؤں؟"

بسم اللہ: "آخر کہیں تو۔"

نواب: "تحسین گنج میں مخدوم بخش کے مکان پر رہتا ہوں۔ افسوس میں نہ جانتا تھا کہ مخدوم ایسا نمک حلال آدمی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اس سے بہت ہی شرمندہ ہوں۔"

میں: "یہ وہی مخدوم بخش نا جو آپ کے والد کے وقت سے نوکر تھا جس کو آپ نے موقوف کر دیا تھا؟"

نواب: "ہاں وہی مخدوم بخش۔ کیا کہوں اس وقت وہ کیسا کام آیا۔ خیر اگر خدا نے چاہا۔۔۔۔"

اتنا کہہ کے نواب کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر پڑے۔ اس کے بعد نواب بسم اللہ کے ہاتھ سے دامن چھڑا کے کمرے کے باہر چلے گئے۔ میرا ارادہ تھا کہ نواب سے چلتے وقت کچھ باتیں کر لوں گی اور اسی لئے ان کے ساتھ ہی اٹھی تھی مگر وہ اس قدر جلد زینے سے اتر گئے کہ میں کچھ کہہ نہ سکی۔ نواب کے تیور اس وقت بہت برے تھے۔ خانم کی باتوں نے نواب کے دل پر سخت اثر کیا تھا۔ ان کی حالت بالکل مایوسی کی تھی، اگرچہ مجھے معلوم تھا کہ یہ سب باتیں خانم نے جو کی ہیں وہ سب اس فہمائش کی تمہید ہے جو اور کسی وقت پر موقوف رکھی گئی ہے۔ مگر مجھے بہت ہی تشویش تھی کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہو کچھ کھا کے سو رہیں تو اور غضب ہو۔

سر شام میں اور بسم اللہ دونوں سوار ہو کے تحسین گنج گئے۔ مخدوم بخش کا مکان بڑی مشکل سے ملا۔ کہاروں نے اس کے دروازے پر آواز دی ایک چھوٹی سی لڑکی اندر سے نکلی اس سے معلوم ہوا کہ مخدوم بخش گھر پر نہیں ہے نواب کو پوچھا اس نے کہا وہ صبح سے کہیں گئے ہوئے ہیں ابھی تک نہیں آئے۔ دو گھنٹہ تک انتظار کیا نہ نواب صاحب آئے نہ مخدوم بخش۔ آخر مایوس ہو کر گھر چلے آئے۔

دوسرے دن صبح کو مخدوم بخش نواب کو ڈھونڈھتا ہوا آیا معلوم ہوا کہ رات کو بھی اس کے مکان نہیں گئے۔ شام کو ان کی والدہ کی ماما وہی بڑھیا جو ایک دن خانم کے پاس

آئی کبھی روتی پیٹتی آئی۔ اس سے کبھی یہی خبر ملی کہ نواب کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ بیگم صاحب نے روتے روتے اپنا عجب حال کیا۔ بڑے نواب سخت متفکر ہیں۔

اس واقعہ کو کئی دن گذر گئے اور نواب چھبن صاحب کا کہیں پتہ نہیں ملا۔ اس واقعہ کے چوتھے یا پانچویں روز چھبن صاحب کی انگوٹھی نخاس میں بکتی ہوئی پکڑی گئی۔ بیچنے والے کو علی رضا بیگ کوتوال کے پاس لے گئے۔ اس نے کہا مجھے امام بخش ساقی کے لڑکے نے بیچنے کو دی ہے۔ امام بخش ساقی کا لڑکا تو نہ ملا خود امام بخش پکڑا بلایا گیا پہلے تو امام بخش صاف مکر گیا کہ اس انگوٹھی کو نہیں جانتا۔ آخر جب مرزا نے خوب ڈانٹا اور دھمکایا تو قبول دیا۔

امام بخش: حضور۔ میں لب دریا لوہے کے پل کے پاس سقہ پلاتا ہوں۔ جو لوگ دریا نہانے جاتے ہیں ان کے کپڑوں کی رکھوالی کرتا ہوں۔ پانچ دن کا ذکر ہے ایک شریف زادے کوئی بیس بائیس برس کی عمر ہوگی۔ گورے سے تھے۔ بہت خوبصورت نوجوان تھے۔ سر شام کے پُل پر نہانے آئے۔ کپڑے اتار کے میرے پاس رکھوا دے مجھ سے لنگ لے کے باندھی۔ خود دریا میں کود پڑے۔ تھوڑی دیر تک نہایا کئے۔ پھر میری نظروں سے اوجھل ہو گئے اور سب لوگ دریا سے نہا نہا کے نکلے۔ کپڑے پہن پہن کے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے وہ صاحب نہ آئے میں یہ سمجھا کہ کسی طرف تیرتے ہوئے نکل گئے ہوں گے بڑی دیر ہو گئی۔ میں اس آسرے میں کہ اب آتے ہیں اب آتے ہیں پہر رات گئے تک بیٹھا رہا۔ آخر کو مجھے یقین ہو گیا کہ ڈوب گئے۔ اب دل میں یہ سوچا کہ اگر کسی کو خبر کرتا ہوں تو جھگڑوں میں پھنس جاؤں گا۔ کھنچا کھنچا پھروں گا۔ اس سے بہتر ہے کہ چپ ہو رہوں۔ ان کے کپڑے اٹھا کے گھر لے آیا۔ جیب میں سے یہ انگوٹھی نکلی اور ایک اور انگوٹھی ہے اس میں خدا جانے کیا لکھا ہے۔ میں نے مارے ڈر کے آج تک کسی کو نہیں دکھائی۔ میں تو اس انگوٹھی کو بھی نہ بیچتا مگر میرا لڑکا شہدا ہو گیا ہے وہ چرا کے لے گیا۔

مرزا علی رضا بیگ نے دو سپاہی کوتوالی سے ساتھ کئے وہ انگوٹھی اور کپڑے اس کے گھر سے منگوائے۔ انگوٹھی مہر کی تھی مرزا علی رضا بیگ نے بڑے نواب کو اس سانحے کی خبر کی۔ کپڑے اور دونوں انگوٹھیاں گھر بھجوا دیں۔ امام بخش کو سزا ہو گئی۔

بسم اللہ۔ بابا آخر نواب چھبن صاحب ڈوب گئے نہ؟ میں تو یہ کہوں اماں جان کی گردن پر ان کا خون ہوا۔

میں : "افسوس! میں تو اسی دن دل میں کھٹک گئی تھی۔ اسی لئے اس دن اُن کے ساتھ اٹھی تھی کہ کچھ سمجھا دوں مگر وہ زینے سے اتر ہی گئے۔"

بسم اللہ: "اُن کے سر پر قضا سوار تھی۔ خدا غارت کرے بڑے نواب کو نہ اُن کو جائداد سے بے حق کرتے نہ وہ اپنی جان دیتے۔"

میں : "خدا جانے ماں کا کیا حال ہوا ہوگا۔"

بسم اللہ: "سنا ہے بیچاری دیوانی ہو گئی ہیں۔"

میں : "جو نہ ہو کم ہے۔ یہی تو ایک اللہ آمین لڑکا تھا۔ ایک تو بیچاری رانڈ بیوہ دوسرے یہ آفت اُنکے سر پر ٹوٹ پڑی۔ سچ پوچھو تو انکا گھر ہی تباہ ہو گیا۔"

رسوا: "تو نواب چھبن صاحب کو آپ نے ڈبو ہی دیا۔ اچھا اس موقع پر ایک بات اور مجھے پوچھ لینے دیجئے۔"

میں : "پوچھئے۔"

رسوا: "نواب صاحب پیرنا جانتے تھے یا نہیں؟"

میں : "کیا معلوم۔ یہ آپ کیوں پوچھتے ہیں؟"

رسوا: "اس لئے کہ مجھے میر مجھلی صاحب نے ایک نکتہ بتا دیا تھا کہ جو شخص پیرنا جانتا ہے وہ اپنے قصد سے نہیں ڈوب سکتا۔"

کچھ ان کو امتحان وفا سے غرض نہ تھی
اک زار و ناتواں کے ستانے سے کام تھا

مرزا رسوا صاحب! آپ کو کسی سے عشق بھی ہوا ہے؟"

رسوا: "جی نہیں، خدا نہ کرے۔ آپ کو تو سیکڑوں سے عشق ہوا ہوگا۔ آپ اپنا حال کہئے ایسی ہی باتیں سننے سے تو ہم مشتاق ہیں مگر آپ کہتی ہی نہیں۔"

امراؤ: "یہ تو میرا رنڈی کا پیشہ ہے۔ اور یہ ہم لوگوں کا چلتا ہوا فقرہ ہے جب کسی کو دام میں لانا چاہتے ہیں اُس پر مرنے لگتے ہیں۔ ہم سے زیادہ کسی کو مرنا نہیں آتا۔ ٹھنڈی سانسیں بھرنا، بات بات پہ رو دینا، دو دو دن کھانا نہ کھانا کنوئیں میں پیر لٹکا کے بیٹھ جانا سنکھیا کھا لینا۔ یہ سب ہنر کیا جاتا ہے۔ کیسا ہی سخت دل کا آدمی کیوں نہ ہو ہمارے فریب

میں آ ہی جاتا ہے۔ مگر آپ سے سچ کہتی ہوں کہ نہ مجھ سے کسی کو عشق ہوا اور نہ مجھ کو کسی سے۔ البتہ بسم اللہ جان کو عشق بازی میں بڑا ملکہ تھا۔ انسان تو انسان فرشتہ ان کے جال سے نہیں نکل سکتا تھا۔ ہزاروں اُن کے عاشق تھے اور وہ ہزاروں پر عاشق تھیں۔ سچے عاشقوں میں ایک مولوی صاحب قبلہ کا بھی چہرہ تھا۔ ایسے ویسے مولوی نہ تھے۔ عربی کی اونچی اونچی کتابوں کا درس دیتے تھے۔ دور دور سے لوگ ان سے پڑھنے آتے تھے۔ معقولات میں ان کا مثل و نظیر نہ تھا جس زمانے کا میں ذکر کرتی ہوں۔ سن شریف ستر سے کچھ کم ہی ہوگا۔ نورانی چہرہ سفید داڑھی سر منڈا ہوا اس پر عمامہ عبائے شریف۔ عصائے مبارک۔ ان کی صورت دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپ ایک چلتی ہوئی شوخ نوجوان رنڈی پر عاشق ہیں اور اس طرح عاشق ہیں۔

ایک دن کا واقعہ عرض کرتی ہوں۔ اس میں کسی طرح کا مبالغہ نہ سمجھئے بالکل صحیح صحیح ہے آپ کے دوست . . . میر صاحب قبلہ مرحوم جن کو دلبر جان سے تعلق تھا، خود شاعر تھے اور عمدہ اشعار پر دم دیتے تھے۔ اسی سلسلہ میں حسن پرستی کا بھی شوق تھا۔ مگر نہایت ہی معقولیت کے ساتھ، شہر کی وضعدار رنڈیوں میں کون ایسی تھی جہاں وہ نہ جاتے ہوں۔

رسوا: "جی ہاں کیئے میں خوب جانتا ہوں۔ خدا ان کے درجات عالی کرے۔"

امراؤ: "وہ بھی اس موقع پر موجود تھے۔ شاید آپ کو یاد ہو۔ بسم اللہ جان خانم سے لڑ کے کچھ دنوں کے لئے اس مکان میں جا کر رہی تھیں جو بزاز سے کے پچھواڑے تھا۔"

رسوا: "میں اُس مکان پر کبھی نہیں گیا۔"

امراؤ: "خیر۔ مگر بسم اللہ کے دیکھنے کے لئے اور اس غرض سے بھی کہ ماں بیٹیوں میں ملاپ کرا دوں میں اکثر جایا کرتی تھی۔ ایک دن قریب شام صحن میں تختوں کے چوکے پر گاؤ سے لگی بیٹھی ہیں۔ میر صاحب مرحوم ان کے قریب تشریف رکھتے ہیں۔ مولوی صاحب قبلہ سامنے دو زانو بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہر وقت اللہ بسی کی صورت بنے ہیں، نہ معلوم کیا زیر لب کچھ چپکے چپکے (شاید) یا حفیظ یا حفیظ پڑھ رہے ہیں میں جو گئی تو بسم اللہ نے ہاتھ پکڑ کے اپنے برابر بٹھا لیا۔ میں میر صاحب اور مولوی صاحب کو تسلیم کر کے بیٹھ گئی۔ بسم اللہ نے چپکے سے میرے کان میں کہا: "تماشہ دیکھو گی۔"

میں: "دیکھ (ان ہو کر) کیا تماشہ ہے۔"

بسم اللہ: "دیکھو۔" (یہ کہہ کے مولوی صاحب کی طرف متوجہ ہوئیں۔)

مکان کے صحن میں ایک بہت پرانا نیم کا درخت تھا۔ مولوی صاحب کو حکم ہوا اس

درخت پر چڑھ جاؤ۔

مولوی صاحب کے منھ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ تھر تھر کانپنے لگے۔ میں زمین پر گری جاتی تھی۔ میر صاحب منھ پھیر کے بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب بیچارے کبھی آسمان کو دیکھتے تھے کبھی بسم اللہ کی صورت کو۔ وہاں ایک حکم کر کے دوسرا حکم پہنچا اور فوراً تیسرا نادری حکم ''چڑھ جاؤ'' کہتی ہوں۔

اب میں نے دیکھا کہ مولوی صاحب بسم اللہ کہکے اٹھے۔ عبائے شریف کو تختوں کے چوکے پر چھوڑا۔ نیم کی جڑ کے پاس کھڑے ہوئے۔ پھر ایک مرتبہ بسم اللہ کی طرف دیکھا۔ اس نے اک ذرا چیں بجبیں ہو کے کہا ''ہوں''۔

مولوی صاحب پائجامہ چڑھا کے درخت پر چڑھنے لگے۔ تھوڑی دور جا کر بسم اللہ کی طرف دیکھا۔ اس دیکھنے کا شاید یہ مطلب تھا کہ بس، یا اور؟

بسم اللہ ''اور''

مولوی صاحب اور چڑھے پھر حکم کا انتظار کیا۔ پھر وہی ''اور'' اسی طرح درخت کی پھننگ کے پاس پہنچ گئے۔ اب اگر اور اوپر جاتے تو شاخیں اسقدر پتلی تھیں کہ ضرور ہی گر پڑتے اور جان بحق تسلیم ہو جاتے۔ بسم اللہ کی زبان سے ''اور'' نکلنے ہی کو تھا کہ میں قدموں پر گر پڑی۔ میر صاحب نے نہایت منت کے ساتھ سفارش کی۔ بارے حکم ہوا اتر آؤ۔ مولوی صاحب چڑھنے کو تو چڑھ گئے مگر اترنے میں بڑی دقت ہوئی۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب گرے اور جب گرے۔ مگر بخیر و عافیت اتر آئے۔ بیچارے پسینے پسینے ہو گئے۔ دم پھول گیا۔ قریب تھا کہ گر پڑیں۔ مگر اپنے کو سنبھال کے نعلین پہن کے تخت کے قریب آئے عبائے مبارک زیب دوش کیا چپکے بیٹھ گئے تسبیح پڑھنے لگے۔ بیٹھ تو گئے مگر کسی پہلو قرار نہ تھا چیونٹے ازار شریف میں گھس گئے تھے اس سے بہت پریشان تھے۔

رسوا۔ بھئی واللہ بسم اللہ بھی عجب دلگی باز رنڈی تھی۔

امراؤ۔ ''دلگی کا کیا ذکر ہے وہ بیدرد چنچل بیٹھی تھی۔ تبسم کا اثر بھی چہرے پر نہ تھا۔ میں اور میر صاحب دونوں دم بخود تھے۔ ایک عجیب عالم حیرت طاری تھا۔''

رہے گا کیوں کر کوئی طرز ستم باقی زمانے میں
مزا آتا ہے اس کافر کو الفت آزمانے میں

رسوا۔ یہ جملہ عمر بھر ہنسنے کے لئے کافی ہے۔ تصور شرط ہے۔ تم نے تو بیان کیا اور میری آنکھوں کے سامنے بسم اللہ۔ مولوی صاحب اور ان کی مقدس صورت میر صاحب، تم،

صحن، نیم کا درخت، ان سب کی تصویریں کھنچ گئیں۔ یہ تو کچھ ایسا واقعہ ہے کہ دفعتہً ہنسی بھی نہیں آتی۔ اچھا غور کروں تو ہنسوں۔ نا صاحب! مجھے ہنسی نہیں آتی۔ مولوی صاحب کی حماقت پر رونا آتا ہے۔ بیشک بسم اللہ قیامت کی رنڈی تھی پر ستر برس کا بڈھا۔ اس پر یہ حکم۔ درخت پر چڑھ جاؤ اور وہ بھی چڑھ گئے۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بڑا دقیق مسئلہ ہے۔"

امراؤ: "واقعی آپ نہیں سمجھ سکتے۔ اس میں قیامت کی باریکی ہے۔ آخر بیان ہی کرنا پڑا۔"

رسوا: "للہ بیان کیجئے۔ کیا ابھی کچھ اور فضیحت باقی ہے؟"

امراؤ: "ابھی بہت سی فضیحتیں باقی ہیں لے سنیئے۔"

مولوی صاحب کے جانے کے بعد میں نے بسم اللہ جان سے پوچھا تھا۔

میں: "بسم اللہ! یہ تجھ کو ہوا کیا تھا؟"

بسم اللہ: "کیا؟"

میں: "ستر برس کا بڈھا اور جو درخت پر سے گر پڑتا تو مفت میں خون ہوتا۔"

بسم اللہ: "ہماری بلا سے خون ہوتا۔ میں تو اس موئے بڈھے سے جلی ہوئی تھی کل میری دھنو کو اس زور سے دے پٹخا کہ ہڈی پسلی ٹوٹ گئی ہوتی۔"

بات یہ تھی کہ بسم اللہ جان نے ایک بندریا پالی تھی۔ اس کا بڑا گہرا سہاگ تھا ذرا اس کے ٹھاٹھ سن لیجئے۔ اطلس کی گھنگریا۔ کامدانی کی کرتی۔ جالی کی اوڑھنی چاندی کی چوڑیاں طوق گھونگھرو۔ سونے کی بالیاں۔ جلیبیاں، امرتیاں کھانے کو جب مول لی تھی تو موئی ذرا سی تھی۔ دو تین برس میں خوب کھا کھا کے موٹی ہو گئی تھی۔ جو لوگ جانتے تھے وہ تو خیر۔ اجنبی آدمی پر جا پڑے تو گھگھی بندھ جائے۔ زور بھی اتنا تھا کہ اچھے مرد کا ہاتھ پکڑ لے تو چھڑائے نہ چھوٹے۔

جس دن مولوی صاحب نیم پر چڑھائے گئے ہیں اس سے ایک دن پہلے کا ذکر ہے کہ آپ تشریف لائے۔ تختوں کے چوکے پر بیٹھے ہوئے تھے کہ بسم اللہ جان کو مسخرہ پن سوجھا۔ دھنو کو اشارہ کیا۔ وہ پشت سے چپکے آئی اور اچک کے مولوی صاحب کے کندھے پر جا بیٹھی۔ مولوی صاحب نے جو مڑ کے دیکھا بیچارے گھبرا گئے۔ زور سے جھٹک دیا۔ یہ تخت کے نیچے گر پڑی۔ یا میں تو جانتی ہوں خود چلی گئی ہو گی۔ مولوی صاحب پر کھوکھیانے لگی۔ مولوی صاحب نے لاٹھی دکھائی وہ ڈر کے بسم اللہ کی گود میں جا بیٹھی۔ بسم اللہ نے اُسے تو چمکار کر دوپٹے کا آنچل اڑھا دیا اور مولوی صاحب کو خوب دل کھول کر کوسا۔

گالیاں دیں۔ اس پر بھی صبر نہ آیا۔ دوسرے دن یہ سزا تجویز کی۔

رسوا: "سزا مناسب تھی۔"

امراؤ: "مناسبت میں تو کوئی شک نہیں۔ مولوی صاحب کو کھٹکے کا لنگور بنا دیا۔"

رسوا: "واقعی مولوی صاحب لائق تعزیر تو تھے۔ قیس نے تو سگ لیلیٰ کو پیار کر کے گود میں اٹھا لیا تھا اور مولوی صاحب نے بسم اللہ جان کی چہیتی بندریا کو اول تو جھٹک دیا پھر یہ بے ادبی کر آسے لاٹھی دکھائی۔ عشق کی شان سے بہت بعید تھا۔"

ایک دن رات کے آٹھ بجے بسم اللہ جان کے کمرے میں ہوں۔ بسم اللہ گا رہی ہیں۔ میں طنبورہ چھیڑ رہی ہوں۔ خلیفہ جی طبلہ بجا رہے ہیں۔

اتنے میں مولوی صاحب قبلہ تشریف لائے۔

بسم اللہ: "(دیکھتے ہی) آٹھ دن سے تم کہاں تھے؟"

مولوی صاحب: "کیا کہوں مجھے تو اب کی ایسی تپ شدید لاحق ہوئی تھی کہ بچنا محال تھا مگر تمھارا دیدار دیکھنا تھا اس لئے جانبر ہو گیا۔"

بسم اللہ: "تو یہ کہئیے وصال ہو گیا ہوتا۔"

اس فقرے نے مجھ کو اور خلیفہ جی کو پھڑکا دیا۔

مولوی صاحب: "جی ہاں آثار تو کچھ ایسے ہی تھے۔"

بسم اللہ: "واللہ اچھا ہوتا۔"

مولوی صاحب: "میرے مرنے سے آپ کو کیا نفع ہوتا؟"

بسم اللہ: "جی، آپ کے عرس میں ہر سال جایا کرتے۔ نہایت ناچتے لوگوں کو رجھاتے آپ کا نام روشن کرتے۔"

اسی طرح کی چند باتوں کے بعد پھر گانا شروع ہوا۔ بسم اللہ نے حسب موقع یہ غزل شروع کی:

مرتے مرتے نہ قضا یاد آئی — اسی کافر کی ادا یاد آئی

مولوی صاحب پر وجد کی حالت طاری تھی، آنسوؤں کا تار بندھا ہوا تھا۔ قطرے ریش مقدس سے ٹپک رہے تھے۔ اتنے میں سامنے والا دروازہ کھلا اور ایک صاحب گندمی رنگ گول چہرہ، سیاہ ڈاڑھی، میانہ قد، کسرتی بدن، جامدانی کا انگرکھا پھنسا پھنسا پہنے ہوئے، پانچوں کا پاجامہ مخملی جوتہ۔ نہایت عمدہ جالی کا چکن کا رومال اوڑھے

ہو گئے داخل ہوئے۔ بسم اللہ نے دیکھتے ہی کہا: ''واہ صاحب! اس دن کے گئے آج آپ آئے ہیں۔ اب سمجھے ہمیں ایسی آشنائی نہیں رکھتی اور وہ لال طاقی گرنٹ کے طاقے کہاں ہیں۔ اسی سے تو آپ نے منہ چھپایا۔''

وہ صاحب: ''(لجاجت کے لہجہ میں) نہیں سرکار! یہ بات نہیں ہے۔ اُس دن سے مجھے فرصت نہیں ملی۔ والد کی طبیعت بہت علیل تھی۔ میں ان کی تیمارداری میں تھا۔''

بسم اللہ: ''جی ہاں! آپ ویسے ہی سعادت مند ہیں مجھے یقین ہے۔ یہ نہیں کہتے کہ بین کی چھوکری پر آپ فریفتہ ہیں اور رات کو وہیں کی دربارداری ہوتی ہے۔ مجھے سب خبریں ملتی ہیں اور ہم سے فقرے ہوتے ہیں کہ والد کی طبیعت علیل تھی۔'' اس آواز کو سُن کے ایک مرتبہ مولوی صاحب نے پیچھے مڑ کے دیکھا ان کی اور اُن کی آنکھیں چار ہوئیں۔ مولوی صاحب نے فوراً منھ پھیر لیا۔

دوسرے صاحب کو جو دیکھتی ہوں تو چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں تھر تھر کانپنے لگے۔ جلدی سے دروازہ کھول کے کمرے کے نیچے تھے۔ بسم اللہ پکارتی کی پکارتی رہی انھوں نے جواب تک نہ دیا۔

بسم اللہ بھی کچھ سمجھ کے پہلے تو چپ سی ہو گئی، مگر پھر ایک ہی منہ تیوری چڑھا کے آپ ہی آپ، کہنے لگی: ''بھڑ باشد'' اتنا کہہ کے گانے میں مصروف ہو گئی۔

اس دن کے بعد میں نے ان کو کبھی بسم اللہ کے پاس آتے نہیں دیکھا مولوی صاحب برابر آیا کیے۔

رسوا: ''جی ہاں اگلے زمانے کے لوگ ایسے ہی وضعدار ہوتے تھے۔''

گانا ہو رہا تھا کہ گوہر مرزا شاید یہ سُن کے کہ میں یہاں ہوں، یہیں بیٹھ آئے۔ ان سے اور بسم اللہ سے بنتی ہوتی تھی۔ گالی گلوج سے لے کے گتھم گتھا تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ میرا مزاج ایسا چھچھورا نہ تھا کہ میں بُرا مانتی۔

گوہر مرزا میرے اور بسم اللہ کے بیچ میں بیٹھ گیا اور جب سے بسم اللہ کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا۔

گوہر مرزا: ''آج خوب گا رہی ہو جی چاہتا ہے۔ . . . .'' اب جو دیکھتی ہوں تو مولوی صاحب کے ماتھے کی جھریوں میں حرکت ہونے لگی۔ ایک ہی مرتبہ گوہر مرزا کی نگاہ مولوی صاحب پر جا پڑی۔ پہلے تو بغور صورت دیکھی۔ پھر اپنا کان زور سے پکڑا جھجک کے پیچھے ہٹا۔ یہ معلوم

ہوتا تھا کہ گویا آپ ڈر گئے۔ بسم اللہ اس حرکت پر بے تحاشا ہنس پڑی۔ خلیفہ جی مسکرانے لگے۔ میں نے منہ پر رومال رکھ لیا۔ مگر مولوی صاحب بہت ہی چیں بہ جبیں ہوئے بلکہ قریب تھا کہ اٹھ جائیں مگر بسم اللہ نے کہا "بیٹھو" بیچارے پھر بیٹھ گئے۔ بسم اللہ بھی کیا ہی شریر تھی مولوی صاحب پر یہ ظاہر کرنا منظور تھا کہ گوہر مرزا میرے آشنا ہیں تاکہ مولوی صاحب دیکھ کے جلیں۔ گوہر مرزا سے ہنسنا شروع کیا۔ بڑی دیر تک مولوی صاحب کو اس دھوکے میں رکھا اور ان کا وہ حال جیسے کوئی انگاروں پر لوٹ رہا ہو کھلے جاتے ہیں مارے ہنسی کے میرے پیٹ میں بل پڑے جاتے ہیں۔ آخر مولوی صاحب کی بے کسی پر مجھے رحم آیا۔ میں نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ اس میں بسم اللہ مجھ سے ناراض ہو گئیں۔ میں نے گوہر مرزا کی طرف متوجہ ہو کے کہا، "اے اب من چلاپن کر چکے چلو۔"

اب مولوی صاحب کو معلوم ہو گیا کہ گوہر مرزا سے مجھ سے رسم ہے۔ بسم اللہ سے کوئی واسطہ نہیں، بہت ہی خوش ہوئے۔ باچھیں کھل گئیں۔

رسوا: "مولوی صاحب کو تو پاک محبت تھی نہ؟"

امراؤ: "پاک محبت تھی۔"

رسوا: "پھر ان کو جلنا نہ چاہیئے تھا۔"

امراؤ: "واہ! کیا پاک محبت میں رشک نہیں ہوتا؟ ہوتا ہے۔"

رسوا: "تو پاک محبت نہ ہو گی۔"

امراؤ: "اب یہ ان کا ایمان جانے میں تو یہی سمجھتی تھی۔"

خانم کی نوچیوں میں یہ تو میرے سوا ہر ایک اچھی تھی، مگر خورشید کا جواب نہ تھا۔ پری کی صورت تھی، رنگ میدا شہاب۔ ناک نقشہ گویا صانع قدرت نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا آنکھوں میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ موتی کوٹ کوٹ کے بھر دیے ہیں۔ ہاتھ پاؤں سڈول نور کے سانچے میں ڈھلے ہوئے، بھرے بھرے بازو۔ گول کلائیاں۔ جامہ زیبی وہ قیامت کی کہ جو پہنا معلوم ہوا کہ یہ اسی کے لئے مناسب تھا۔ اداؤں میں وہ دلفریبی وہ بھولا پن جو ایک نظر دیکھے ہزار جان سے فریفتہ ہو جائے جس محفل میں جا کے بیٹھ گئی معلوم ہوا کہ ایک شمع روشن ہو گئی۔ بیسیوں رنڈیاں بیٹھی ہوں۔ نگاہ اسی پر پڑتی تھی، یہ سب کچھ تھا مگر تقدیر کی اچھی نہ تھی اور تقدیر کو بھی کیوں الزام دیجئے خود اپنے ہاتھوں عمر بھر خراب

رہی، حقیقت یہ ہے کہ وہ رنڈی بننے کے لائق نہ تھی۔ بیسواڑے کے ایک زمیندار کی لڑکی تھی۔ صورت سے شرافت ظاہر تھی۔ حسن خداداد تھا مگر اس حسن و جمال پر ضبط یہ تھا کہ کوئی مجھ پر عاشق ہو۔ یوں تو وہ خود ہی پیار کرنے کے لائق تھی۔ کون ایسا ہوگا جو اس پر فریفتہ نہ ہو جاتا۔ اول ہی اول پیارے صاحب کو محبت تھی۔ ہزاروں روپیہ کا سلوک کیا، واقعی جان دیتے تھے۔ خورشید نے بھی انھیں اچھی طرح کہا۔ جب اطمینان ہو گیا کہ میرا عاشق ہے خود جان دینے لگیں۔ دن دن بھر کھانا نہیں کھاتیں۔ اگر ان کو کسی دن آنے سے دیر ہو گئی، بیٹھی زار و قطار رو رہی ہے۔ ہم سب نے صلاح دی۔ "دیکھو خورشید ایسا نہ کرو، مردوے بے مروت ہوتے ہیں۔ تمھارے ان کے صرف آشنائی ہے۔ آشنائی کی بنیاد کیا۔ نکاح نہیں ہوا۔ بیاہ نہیں ہوا۔ اگر ایسا چاہو گی تو اپنا برا چاہو گی، پچھتاؤ گی" آخر ہمارا ہی کہا ہوا۔ پیارے صاحب نے جب دیکھا کہ رنڈی پیار کرتی ہے، لگے غمزے کرنے۔ یا تو آٹھوں پہر بیٹھے رہتے تھے یا اب یہ ہے کہ دو دو دن نہیں آتے۔ خورشید جان دیے دیتی ہیں۔ روتی ہے بیٹھی ہے۔ کھانا نہیں کھاتی۔ عجیب حال ہے۔ خانم کو صورت سے نفرت ہو گئی، یہاں تک کہ آنا جانا۔ کھانا پینا آدمیوں کی تنخواہ سب موقوف۔

میں نہیں سمجھ سکتی کہ اس حسن کے ساتھ عشق اس کے دل میں کس نے بھر دیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ کسی مرد آدمی کی جورو ہوتی تو خوب نباہ ہوتا۔ عمر بھر پاؤں دھو دھو کے پیتا۔ بشرطیکہ قدردان ہوتا۔ بسم اللہ خورشید کے نخروں کی برابری نہیں کر سکتی تھیں اس پہ وہ تمکنت وہ غرور، وہ غمزہ، وہ نکتور، اے خدا کی پناہ۔ مولوی صاحب یہ حال تو آپ سن ہی چکے ہیں، اور آشناؤں سے بھی اس کا سلوک کچھ اچھا نہ ہوتا۔ اصل تو یہ ہے کہ اس کو اپنی ماں کی دولت پر بڑا گھمنڈ تھا۔ واقعی دولت بھی لازوال تھی۔ اپنے آگے کسی کی ہستی ہی نہ سمجھتی تھی، خورشید کی ذات سے خانم کو بڑی امیدیں تھیں۔ واقعی، اگر ان میں رنڈی پن ہوتا تو لاکھوں ہی پیدا کرتی۔ اس حسن و خوبی پر آواز بالکل نہ تھی۔ ناچنے میں بھی بالکل پھوہڑ تھیں۔ صرف صورت ہی صورت تھی۔ اول اول مجرے بہت آئے۔ پیچھے آخر جب معلوم ہوا کہ گانے ناچنے میں تمیز نہیں لوگوں نے بلانا چھوڑ دیا۔ جو تھا وہ صورت کا مشتاق ہو کے آتا تھا۔ اچھے اچھے مرتے تھے مگر جب آ کے دیکھا منہ پھولا تھا، بیٹھی ہو اُن پر عشق سوار تھا، ہر ایک سے بے رخی، بے اعتنائی۔ یہ حالت دیکھ کے لوگوں نے بھی آنا چھوڑ دیا۔ اب پیارے صاحب ہی صرف رہ گئے۔ ادھر [illegible]

پھر اڈونارہ ادا!
بیٹے ناالدین پر عتاب شاہی نازل ہوا۔ گھر کی ضبطی ہو گئی جاگیر چھین لی گئی۔ بیچارے پریشان ہو گئے۔ یہ سب کچھ ہوا مگر خورشید کے عشق میں کمی نہ ہوئی۔ اب یہ ضد ہوئی کہ مجھے گھر میں بٹھا لو۔

پیارے صاحب نے پاس خاندان یا یوں کہو کہ باپ کے ڈر سے منظور نہ کیا خورشید کی آس ٹوٹ گئی۔

خورشید بہت ہی نیک عورت تھی، سیکڑوں روپیہ پھسلا پھسلا کے لوگ کھا گئے۔ فقیر فقیروں سے آپ کو بڑا اعتقاد تھا۔ ایک دن ایک شاہ صاحب تشریف لائے۔ وہ ایک کے دو کرتے تھے۔ خورشید نے اپنے کڑے اور کنگن کی جوڑیاں اتار دیں۔ شاہ صاحب نے ایک کوری ہانڈی منگوائی اُس میں سیاہ تل بھروائے کڑے کنگن ہانڈی میں رکھ کر بھی ڈھانک دی۔ شال باف کا ایک پرچہ گلے میں باندھ ناڑے سے باندھ دیا۔ شاہ صاحب روانہ ہو گئے۔ چلتے چلتے کہہ گئے کہ آج رکھو لنا کل صبح کو کھولنا۔ مرشد کے حکم سے ایک کے دو ہو جائیں گے۔ صبح کو ہانڈی کھولی گئی کالے تلوں کے سوا کچھ نہ ملا۔

ایک جوگی نے کالے ناگ کا پھن منہ سے نکال کے دکھایا کہ یہ تجھے برسوں آگے ڈس جائے گا۔ بی خورشید نے کانوں سے پتے بالیاں اتار کے حوالے کیں۔ خورشید کو کبھی غصہ آتا ہی نہ تھا۔ ایسی نیک دل اور نیک مزاج رنڈیاں بہو بیٹیوں میں کم ہوتی ہیں رنڈیوں کا کیا ذکر۔ مگر ہاں ایک دن غصہ آیا جس دن پیارے صاحب مانجھے کا جوڑا پہن کے آئے۔ اوّل تو چپکی بیٹھی رہی تھوڑی دیر کے بعد گالوں پر سرخی نمودار ہوئی۔ رفتہ رفتہ سرخ بھبھوکا ہو گئے اس کے بعد اٹھی مانجھے کے جوڑے کے پرزے پرزے کر ڈالے۔ اب رقت شروع ہوئی دو دن تک رویا کی تمام دنیا نے سمجھایا کچھ نہ مانا۔ آخر بخار آنے لگا۔ دو مہینے بیمار رہی لینے کے دینے پڑ گئے۔ حکیموں نے دق تجویز کی لیکن خدا کے فضل سے دو مہینے کے بعد مزاج خود بخود روبہ اصلاح ہو گیا۔ اب پیارے صاحب سے بظاہر جھٹم جھٹا ہو گئی۔ اس کے بعد اور لوگوں سے ملاقات ہوئی مگر کسی سے دل نہ لگا اور نہ کسی کا دل ان سے اس لئے کہ بے توجہی اور بے اعتنائی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی بظاہر ملتی تھیں مگر دل نہ ملتا تھا۔

ساون کا مہینہ ہے، سہ پہر کا وقت ہے، پانی برس کے کھل گیا ہے۔ چوک کے کوٹھوں

امراؤ جان ادا

اور بلند دیواروں پر جا بجا دھوپ ہے۔ ابر کے ٹکڑے آسمان پر ادھر ادھر نظر آتے ہیں۔ پچھم کی طرف رنگ رنگ کی شفق پھیلی ہوئی ہے چوک میں سفید پوشوں کا مجمع زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ آج زیادہ تر مجمع کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جمعہ کا دن ہے۔ لوگ عیش باغ کے میلے کو جلد جلد قدم اٹھائے چلے جاتے ہیں۔ خورشید، امیر جان، بسم اللہ میلے جانے کے لئے بن ٹھن رہی ہیں۔ دھانی دوپٹے ابھی رنگریز رنگ کے دے گیا ہے چنے جاتے ہیں۔ بالوں میں کنگھی ہو رہی ہے۔ پٹیاں گوندھی جاتی ہیں۔ زیور نکالے جاتے ہیں۔ خانم صاحب سامنے چوکے پر گاؤ تکیے سے لگی بیٹھی ہیں۔ ابھی پیچوان لگا کے پیچھے ہٹی ہیں۔ خانم صاحب کے سامنے میر صاحب بیٹھے ہیں۔ جانے پر اصرار کر رہے ہیں۔ وہ کہتی ہیں آج میری طبیعت سست ہے۔ میں نہیں جا... کی ہم لوگ دعائیں مانگ رہے ہیں خدا کرے نہ جائیں تو میلے کی بہار رہے۔

خورشید پر اس دن غضب کا جوبن ہے۔ گوری رنگت۔ ململ کے دھانی دو... سے پھوٹی نکلتی ہے۔ اودی گرنٹ کا پاجامہ بڑے بڑے پائنچوں کا سنبھالے سنبھلتا پھنسی پھنسی کرتی قیامت ڈھا رہی ہے۔ ہاتھ گلے میں ہلکا ہلکا زیور ہے۔ ناک میں ہیرے کی کیل کانوں میں سونے کی انتیاں۔ ہاتھ میں کڑے گلے میں موتیوں کا کنٹھا۔ سامنے کمرے میں قد آدم آئینہ لگا ہے۔ اپنی صورت دیکھ رہی ہیں۔ کیا کہوں کیا صورت ہے۔ اگر میری صورت ویسی ہوتی تو اپنے عکس کی آپ ہی بلائیں لے لیتی۔ مگر ان کو یہ غم ہے کہ اس صورت پر کوئی دیکھنے والا نہیں۔ پیارے صاحب سے بگاڑ ہی ہو چکا ہے۔ ... اداس ہے۔ ہائے وہ اداسی بھی غضب کر رہی ہے۔ اچھی صورت والوں کا سب ... اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت اس پری پیکر کی صورت دیکھنے سے دل بیٹھا جاتا ہے۔ اور تو کوئی مثال اپنے دل کی حالت کی سمجھ میں نہیں آتی یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی اچھے ... کا کوئی شعر درد آمیز سنا ہے اور دل اس کے مزے لے رہا ہے۔

بسم اللہ کی صورت ایسی بری نہ تھی۔ کھلتا ہوا سانولا رنگ۔ کتابی چہرہ۔ ستواں ناک۔ بڑی آنکھیں سیاہ پتلی چھریرا بدن۔ بوٹا سا قد۔ کارچوبی تلواں جوڑا۔ ... کابی کریب کا ... بنت ٹکی ہوئی۔ زرد گرنٹ کا پاجامہ۔ بیش قیمت زیور سر سے پاؤں تک گہنے میں لدی ہوئی۔ اس پر طرہ پھولوں کا گہنا۔ اپنے تئیں چوتھی کی دلھن معلوم ہوتی تھی۔ پھر اس پر بات میں شوخی و شرارت۔ میلے میں پہنچ کر کسی کو منہ چڑھا دیا۔ کسی سے آنکھ لڑائی

وہ منہ کھینچنے لگا تو ہم نے پیچھا لیا۔ ہاں یہ کہنا بھول گئی کہ ہم لوگ بناؤ سنگار کر کے میانوں میں سوار ہوئے میلے پہنچے۔

میلے میں وہ بھیڑیں تھیں کہ اگر تھالی پھینکو تو سر ہی سر جائے۔ جا بجا کھلونے والوں، مٹھائی والوں کی دکانیں۔ خوانچہ والے، میوہ فروش، ہار والے، تنبولی ساقنیں، غرضکہ جو کچھ میلوں میں ہوتا ہے سب کچھ تھا، مجھے تو اور کسی چیز سے کچھ کام نہیں۔ لوگوں کے چہرے دیکھنے کا ہمیشہ سے شوق ہے، خصوصاً میلے تماشوں میں خوش نا خوش، مفلس تونگر، بیوقوف عقلمند، عالم جاہل، شریف، رذیل، سخی بخیل، یہ سب حال چہرے سے کھل جاتا ہے۔ ایک صاحب ہیں کہ وہ اپنے ترتیب کے انگرکھے اور اودی صدری نکہ دار ٹوپی چست گھٹنے اور مخملی چڑھویں جوتے پر اترائے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ کوئی صاحب ہیں، صندلی رنگا ہوا دوپٹہ سر سے آڑا اپنا پہنے ہوئے رنڈیوں کو گھورتے پھرتے ہیں۔ ایک صاحب آئے تو ہیں میلہ دیکھنے مگر بہت ہی مکدر، چیں بہ جبیں۔ کچھ چپکے چپکے بڑبڑاتے بھی جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے بیوی سے لڑ کے آئے ہیں۔ جن باتوں کے جواب بروقت نہ سوجھے تھے انھیں اب یاد کر رہے ہیں۔ کوئی صاحب اپنے چھوٹے سے لڑکے کی انگلی پکڑے اس سے باتیں کرتے چلے آتے ہیں۔ ہر بات میں اماں کا نام آتا ہے۔ اماں کھانا پکاتی ہوں گی۔ اماں کا جی ماندہ ہے۔ اماں سو رہی ہوں گی۔ اماں جاگتی ہوں گی۔ بہت شوخی نہ کیا کرو نہیں تو اماں حکیم کے یہاں چلی جائیں گی۔ ایک صاحب ساتھ آٹھ برس کی لڑکی کو سرخ کپڑے پہنا کے لائے ہیں کندھے پر چڑھائے ہوئے ہیں۔ ناک میں ننھی سی نتھنی ہے۔ اونچی چوٹی گندھی ہوئی لال رتا لباف کا موباف پڑا ہے ہاتھوں میں چاندی کی چوڑیاں ہیں۔ معصوم کے دونوں ہاتھ زور سے پکڑے ہیں۔ کلائیاں دکھی جاتی ہیں۔ کوئی چوڑیاں نہ اتار لے۔ گہنے پہنا کے لانا ہی کیا ضرور تھا۔

لیجئے دوسرے صاحب ایک اور اُن کے یارِ غار بھی ساتھ ہیں۔ فرمائشی گالیاں چل رہی ہیں۔ اماں، پان تو کھلا دو کمبخت۔ ایک پیسہ تنبولی کی دکان پر پھینکا معلوم ہوا کہ آپ بڑے رنگیلے ہیں۔ پیسہ دو پیسہ آپ کے آگے کیا اصل ہے۔ فوراً ہی حقہ والے کو بھی آواز دیدی۔ کہیں ساقی ادھر آنا۔ حقہ سلگا ہوا ہے؟ ایک اور یار ان کے آموجود ہوئے معمولی گالی گلوچ کے بعد ملاقات سلام بندگی۔ مزاج پرسی بے تکلف۔ دوستوں میں ہوا

کرتی ہے۔ ابے پان تو کھلوا، لطف تو یہ کہ آپ مسلمان یا ہندی۔ جب تنبولی نے پان دیئے جھپ سے بڑھ کے لے لیئے۔ ارے یار بھول گئے۔ اب یہ کھسیانے ہوئے۔ ٹینٹ سے ایک پیسہ نکالا ارے بھئی۔ ہیں بھی دو۔ پان دینا۔ الائچی بھی چھوڑ دینا۔ چونا زیادہ نہ ہو۔ دوست سے اچھا تو چلم تو پلواؤ گے۔ چلم حقے سے اتارتے ہی تھے کہ ساقی نے گھور کے دیکھا فوراً ہاتھ سے حقہ اور جیب سے پیسہ نکال کے دے دینا پڑا۔

گوہر مرزا نے موتی جھیل کے کنارے فرش بچھوا دیا تھا وہیں جا کے ٹھہرے ادھر ادھر درختوں میں، پھرتے رہے۔ سر شام سے دو گھڑی رات گئے تک میلہ کی سیر کی پھر گھر چلنے کی ٹھہری۔ اپنے اپنے میانوں میں سوار ہوئے۔ اب جو دیکھتے ہیں تو خورشید جان کا میانہ خالی ہے۔ ان کا کہیں پتہ نہ ملا۔ آخر مایوس ہو کے گھر واپس آ گئے۔ خانم نے سنتے ہی سر پیٹ لیا۔ تمام گھر کو صدمہ ہوا۔ میں خود رات بھر رویا کی۔ پیارے صاحب کے مکان پر آدمی گیا وہ بچارے اسی وقت دوڑے ہوئے آئے۔ ہزاروں قسمیں کھائیں مجھے بالکل نہیں معلوم۔ میں میلہ میں بھی نہیں گیا۔ بیگم کی طبیعت علیل ہے جاتا تو کیونکر جاتا۔ پیارے صاحب پر یوں بیجا سا گمان تھا۔ ان کے قسمیں کھانے کے بعد کسی کو شبہہ نہ رہا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ شادی کے بعد بیوی کے ایسے پابند ہو گئے تھے کہ چوک کا آنا جانا انھوں نے بالکل موقوف کر دیا تھا۔ رات کو گھر سے نکلتے ہی نہ تھے خورشید کے گم ہونے کی خبر سن کے کچھ تو اگلی محبت کے خیال سے اور کچھ خانم کی مروت سے نہیں معلوم کس طرح سے چلے آئے تھے۔

خورشید کے گم ہونے کے ڈیڑھ مہینہ کے بعد ایک صاحب جن کی وضع شہر کے بانکوں کی ایسی تھی، سانولا رنگ چھریرا بدن، ایک دوشالہ کمر سے لپیٹے اور ایک کمر سے باندھے میرے کمرے میں درانہ چلے آئے اور آنے کے ساتھ ہی سامنے تالین کے کنارے بیٹھ گئے۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ طبیعت میں کسی قدر کمینہ پن ہے۔ یا ابھی ابھی رنڈیوں کے یہاں کم جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس وقت میں اکیلی بیٹھی تھی۔ میں نے بوا حسینی کو آواز دی۔ وہ کمرے میں آئیں ان کے آتے ہی وہ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور کسی قدر بے تکلفی کے ساتھ بوا حسینی کا ہاتھ پکڑ لیا علیحدہ لے جا کر کچھ باتیں کیں جن میں بعضی میں نے سنیں کچھ نہیں سنیں۔ اس کے بعد بوا حسینی خانم

کے پاس گئیں وہاں سے آ کے پھر باتیں ہوئیں۔ آخر کلام یہ تھا کہ آپ کو ایک مہینہ کی تنخواہ پیشگی دینا ہو گی۔ ان صاحب نے کوٹ سے بنیٹڑ روپیوں کی نکالی۔ بوا حسینی نے گود پھیلائی۔ انھوں نے گن سے روپے پھینک دے۔

بوا حسینی: "یہ کتنے ہیں؟"

وہ صاحب: "نہیں معلوم گن لیجئے۔"

بوا حسینی: "اسے نہ مجھے تو نگوڑا گنا بھی نہیں آتا۔"

وہ صاحب: "میں جانتا ہوں پچھتر روپے ہوں گے شاید۔ ایک دو کم ہوں یا زیادہ۔"

بوا حسینی: "میاں پچھتر کسے کہتے ہیں؟"

وہ صاحب: "تین بیسی اور پندرہ۔ پچیس کم سو۔"

بوا حسینی: "پچیس کم سو۔ تو یہ کتنے دن کی تنخواہ ہوئی؟"

وہ صاحب: "پندرہ دن کی۔ کل وہ بھی پندرہ دن کی دے دوں گا۔ پورے ڈیڑھ سو روپے آپ کو پہنچ جائیں۔"

یہ تخریجے کی شان سے مجھے بہت ہی برا معلوم ہوا۔ اب تو بالکل ہی یقین ہو گیا کہ یہ ایسے ہی ویسے ہوں گے۔ مگر مجبوراً رنڈی کا پیشہ۔ دوسرے پرائے بس میں۔ کرتی تو کیا کرتی۔

بوا حسینی روپے لے کے خانم کے پاس گئیں۔ خانم اس وقت نہیں معلوم کس نیکی کے دم میں تھیں کہ فوراً منظور کر لیا۔ بلکہ تعجب ہوا اس لئے کہ بڑے بڑے رئیسوں سے روپے کے بارے میں ایک دم کے لئے مروت نہیں کرتی تھیں یا اس وقت ایک دن کا وعدہ مان لیا۔

اس معاملہ کے طے ہونے کے بعد وہ صاحب میرے ہی کمرے میں شب باش ہوئے۔ کوئی گھڑی رات باقی رہی ہوگی مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے کمرے کے نیچے آ کے دستک دی۔ وہ صاحب فوراً اٹھ بیٹھے اور کہا تو اب میں جاتا ہوں۔ کل شب کو پھر آؤں گا۔ اسی وقت پانچ اشرفیاں اور تین انگوٹھیاں ایک سونے کی، یاقوت کا نگینہ ایک فیروزے کی ایک ہیرے کی مجھ کو دیں اور کہا یہ تم اپنے پاس رکھنا۔ خانم کو نہ دینا۔ میں نے خوشی خوشی ہاتھ میں لے لیں اور اپنی انگلیوں کو دیکھنے لگی۔ مجھے بہت ہی خوبصورت معلوم ہوتی تھیں۔ پھر صندوقچہ کھولا۔ اشرفیوں کو اور انگوٹھیوں کو چور خانہ میں رکھ دیا۔

دوسرے دن شب کو پھر وہی صاحب آئے۔ اس وقت میں تعلیم لے رہی تھی وہ ایک کنارے آ کر بیٹھ گئے۔ گانا ہوا کیا۔ پانچ روپے سازندوں کو دیے۔ استاد جی اور سازندے خوشامد کی باتیں کرنے لگے۔ استاد جی نے گردن پر جو دوشالہ بندھا ہوا تھا اس کے اینٹھنے کی فکر کی۔ پھر منہ پھوڑ کے مانگا۔ مگر وار خالی گیا۔ انھوں نے نہ دیا۔

وہ صاحب: "استاد جی، روپیہ پیسہ اور جس چیز کو کہیے ہو۔ حاضر ہے، یہ دوشالہ میں نہیں دے سکتا۔ ایک دوست کی نشانی ہے۔"

استاد جی اپنا سا منہ لے کے چپ ہو رہے۔

اس کے بعد تعلیم ختم ہوئی۔ بوا حسینی کو باقی چپیتر گن دیے گئے۔ بارہ روپیہ بوا حسینی کو اپنی طرف سے دیے اور رخصت ہوئے۔ جب وہ اور میں صرف دو آدمی کمرے میں رہ گئے۔ میں نے پوچھا: "آپ نے مجھ کو کہاں دیکھا تھا جو یہ عنایت کی۔"

وہ: "دو مہینے ہوئے عیش باغ کے میلے میں۔"

میں: "اور پھر آئے دو مہینے کے بعد؟"

وہ: "میں باہر چلا گیا تھا اور اب پھر جانے والا ہوں۔"

اب میں نے زندگی بھر کی لگاوٹ شروع کی۔

میں: "تو ہمیں چھوڑ کے چلے جاؤ گے؟"

وہ: "نہیں پھر بہت جلد چلا آؤں گا۔"

میں: "اور تمھارا مکان کہاں ہے؟"

وہ: "مکان تو فرخ آباد میں ہے مگر یہاں بہت کم رہتا ہے بلکہ رہتا ہی نہیں ہوں۔ کچھ دنوں کے لیے باہر چلا جاتا ہوں۔ پھر چلا آتا ہوں۔"

میں: "اور یہ دوشالہ کس کی نشانی ہے؟"

وہ: "کسی کی نہیں۔"

میں: "واہ میں سمجھ گئی یہ تمھاری کسی آشنا کی نشانی ہے۔"

وہ: "نہیں تمھارے سر کی قسم میری کوئی آشنا نہیں ہے۔ بس تمھیں ہو جو کچھ ہو۔"

میں: "تو پھر مجھے دے دو۔"

وہ: "میں نہیں دے سکتا۔"

یہ بات مجھے بہت ناگوار ہوئی۔ اتنے میں انھوں نے بڑے بڑے موتیوں کا مالا

جس میں زمرد کا بڑا نگ لگا ہوا تھا نکال کر دیا۔ جوڑی ہیرے کے کڑے کی اور دو انگوٹھیاں سونے کی ہیرے کی آگے رکھ دیں۔ یہ سب تو میں نے خوشی خوشی اٹھا لیا۔ صندوقچہ کھول کے بند کرنے لگی مگر مجھے تعجب ہوا کہ یہ ہزاروں کی رقم تو یوں مجھ کو دیے دیتے ہیں، مگر یہ دوشالہ زیادہ سے زیادہ سو یا پچاس کا ہوگا۔ اس سے کیوں انکار کیا۔ واقعی مجھ کو یہ دوشالہ پسند نہ تھا ورنہ اصرار کرتی۔ اپنے کام سے کام تھا۔

ان صاحب کا نام فیض علی تھا۔ پہر ڈیڑھ پہر رات گئے آتے تھے اور کبھی آدھی رات، کبھی پچھلے پہر سے اٹھ کے چلے جاتے تھے۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ میں کئی مرتبہ دستک یا سیٹی کی آواز میں نے سنی اور فوراً ہی فیض علی اٹھ کر روانہ ہو گئے۔ فیض علی سے رسم ہوئے کوئی ڈیڑھ مہینہ گزرا ہوگا کہ میرا صندوقچہ سادے اور جڑاؤ گہنے سے بھر گیا۔ اشرفیوں اور روپیوں کا شمار نہیں۔ اب میرے پاس خانم اور بوا حسینی سے چھپا ہوا دس بارہ ہزار کا مال ہو گیا تھا۔

فیض علی سے اگر مجھ کو محبت نہ تھی تو نفرت بھی نہ تھی اور نفرت ہونے کی کیا وجہ۔ اول تو وہ کچھ بدصورت بھی نہ تھے، دوسرے لینا دینا عجیب چیز ہے۔ میں سچ کہتی ہوں جب تک وہ نہ آتے تھے میری آنکھیں دروازے کی طرف لگی رہتی تھیں۔ گوہر مرزا کی آمدورفت ان دنوں صرف دن کی رہ گئی تھی۔ شب کے آنے والوں میں سے بھی اکثر لوگ سمجھ گئے تھے کہ میں کسی کی پابند ہو گئی ہوں۔ اس لیے سویرے سے کھسک جاتے تھے اور جو صاحب جم کے بیٹھتے تھے ان کو میں کسی حیلے سے ٹال دیتی تھی۔ خورشید کی تلاش بہت کچھ ہوئی مگر کہیں سراغ نہ ملا۔ اس اثنا میں فیض علی کو مجھ سے بہت محبت تھی جس کا اظہار طرح طرح سے ہوتا تھا۔ اگر میرا دل ابتدا سے گوہر مرزا کی طرف مائل نہ ہو گیا ہوتا تو میں ضرور فیض علی سے محبت کرتی اور اسی کو دل دیتی۔ اس پر بھی میں نے ان کی دلجوئی اور ناز برداری میں کسی طرح کمی نہیں کی۔ میں نے فیض علی کو فریب دے رکھا تھا کہ مجھے تم سے محبت ہے اور وہ بیچارہ میرے دام میں پھنسا ہوا تھا۔ جو کچھ خفیہ اس نے مجھ کو دیا اس کی کسی کو کانوں کان خبر نہ تھی، خانم اور بوا حسینی کے کہنے سے مجھے فرمائشیں بھی کرنا پڑتی تھیں۔ ان کی بجا آوری کو بھی وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس کو روپیہ پیسہ کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ ایسا دل چلا آدمی تو میں نے رئیسوں میں دیکھا نہ شہزادوں میں۔

رسوا: "جی ہاں کیوں نہیں۔ مال مفت دل بے رحم۔ بھلا اس کے برابر کس کا دل ہو سکتا تھا۔"
امراؤ: "مال مفت کیوں؟"

رسوا: "نہیں تو اپنی امان جان کا زیور آپ کو اتار کے لا دیا کرتا تھا۔"

امراؤ: "نہیں کیا معلوم تھا۔"

شب کے آنے والوں میں ایک پنا مل چودھری تھے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کے چلے جاتے تھے۔ ان کو چار آدمیوں میں بیٹھنے کا مزا تھا۔ اگر ان کی خاطرداری ہوتی رہے تو اور کسی کے آنے جانے سے انھیں کچھ غرض نہ تھی مہینے میں دو سو روپیہ کا نقد سلوک، اور فرمائشوں کا ذکر نہیں۔ فیض علی کی ملاقات کے زمانے میں ان کی آمد و رفت بھی کم ہو گئی تھی۔ یا تو ہر روز آیا کرتے تھے یا تیسرے تیسرے دن آنے لگے۔ پھر ایک مرتبہ پندرہ دن کا خوطہ لگایا۔ اب جو آئے تو اداس اداس۔ معمولی باتوں کا جواب دیتے ہیں اور خاموش ہو جاتے ہیں۔

پنا مل: "کیا تم نے سنا نہ ہوگا؟"

میں: "کیا؟"

پنا مل: "ہم تو تباہ ہو گئے۔ گھر میں چوری ہو گئی پشتینیوں کا اثاثہ اٹھ گیا۔"

میں: (چونک کر) "خدا بخش! چوری ہو گئی۔ کتنے کا مال گیا؟"

پنا مل: "سب اٹھ گیا۔ رہا کیا۔ دو لاکھ کا جواہر اٹھ گیا۔"

میں دل میں تو ہنسی۔ ہنسی اس بات پر کہ ان کے باپ چھنا مل تو کروڑپتی مشہور تھے اس میں کچھ شک نہیں کہ دو لاکھ بہت بڑی رقم ہے مگر ان کے نزدیک کیا اصل ہے۔ بظاہر منہ بنا کے بہت افسوس کیا۔

پنا مل: "جی ہاں۔ آجکل شہر میں چوریاں بہت ہوتی ہیں۔ نواب ملکہ عالم کے یہاں چوری ہوئی۔ لالہ ہر پرشاد کے ہاں چوری ہوئی۔ اندھیر ہے۔ سنا ہے باہر سے چور آئے ہوئے ہیں مرزا علی بیگ بیچارے حیران ہیں۔ شہر کے چور سب طلب ہو گئے تھے کسی سے کچھ پتہ نہیں ملا۔ وہ لوگ کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں کہ یہ ہمارا کام نہیں ہے۔"

پنا مل کے آنے کے دوسرے دن میں اپنے کمرے میں بیٹھی ہوں کہ چوک میں ایک شور ہوا۔ میں بھی چلمن کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اب جو دیکھتی ہوں، تو خلائق کا انبوہ ہے۔

ایک: "آخر گرفتار ہو گئے نا۔"

دوسرا: "واہ مرزا کیا کہنا۔ کوتوال ہو تو ایسا ہو۔"

تیسرا: "دیکھیں بھئی کچھ مال کا بھی پتہ لگا؟"

جو تھا۔ بہت کچھ برآمد ہوا، مگر ابھی بہت سا باقی ہے۔

پانچواں: ”میاں فیضو بھی گرفتار ہوئے؟“

چھٹا۔ ”وہ کیا آتے ہیں۔“

میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ میاں فیضو بندھے چلے آتے ہیں۔ سپاہیوں کا گارد ساتھ ہے۔ گرد خلائق کا انبوہ ہے۔ میاں فیضو منہ پر دو بڑے ڈالے ہوئے ہیں انکی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ دوپہر سے پہلے کا واقعہ ہے۔

حسب معمول فیض علی کوئی پہر رات گئے تشریف لائے۔ کمرے میں میں ہوں اور وہ ہیں۔ آتے ہی کہا: ”آج ہم باہر جاتے ہیں پرسوں آئیں گے۔ دیکھو امراؤ جان جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے اس کو کسی پر ظاہر نہ کرنا۔ بوا حسینی کو نہ دینا نہ خانم کو دکھانا تمہارے کام آئیگا ہم پرسوں ضرور آئیں گے۔ اچھا یہ کہو کہ ہمارے ساتھ تھوڑے دنوں کے لئے باہر چل سکتی ہو؟“

میں: ”تم جانتے ہو کہ میں اپنے بس میں نہیں۔ خانم صاحب کو اختیار ہے تم اُن سے کہو اگر وہ راضی ہوں تو مجھے کیا عذر ہے۔“

فیض علی: ”سچ ہے کہ تم لوگ بڑے بیوفا ہوتے ہو۔ ہم تو تم پر جان دیتے ہیں اور تم ایسا خشک جواب دیتی ہو۔ اچھا بوا حسینی کو بلواؤ۔“

میں نے بوا حسینی کو آواز دی وہ آئیں۔

فیض علی۔ (میری طرف اشارہ کر کے) بھلا یہ کچھ دنوں کے لئے باہر بھی جا سکتی ہیں۔

حسینی: ”کہاں؟“

فیض علی: ”فرخ آباد۔ میں کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں ہوں۔ میری وہاں ریاست ہے بالفعل میں دو مہینے کے لئے وہاں جاتا ہوں۔ اگر خانم صاحب منظور کریں تو دو مہینے کی تنخواہ پیشگی بلکہ اس کے علاوہ جو کچھ کہیں میں دینے کو تیار ہوں۔“

بوا حسینی: ”مجھے تو نہیں یقین کہ خانم منظور کریں گی۔“

فیض علی: ”اچھا تم پوچھو تو۔“

بوا حسینی خانم صاحب کے پاس گئیں۔

میرے نزدیک بوا حسینی کو خانم کے پاس بھیجنا بیکار تھا اس لئے کہ مجھے یقین تھا کہ وہ ہرگز منظور نہ کریں گی۔

فیض علی نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا تھا کہ اگر میں اپنے اختیار میں ہوتی تو مجھے اُن کے ساتھ جانے میں کچھ عذر بھی نہ ہوتا۔ میں یہ خیال کرتی تھی کہ جب اس شخص نے گھر بیٹھے اتنا سلوک کیا تو وطن جا کر تو نہال کر دے گا۔ میں اس خیال میں تھی کہ اتنے میں بوا حسینی نے آ کر صاف جواب دیا۔ ان کا باہر جانا کسی طرح نہیں ہو سکتا۔

فیض علی: "دو گنی تنخواہ پر سہی۔"

بوا حسینی: "چوگنی تنخواہ پر بھی نہیں ممکن۔ ہم لوگ باہر نہیں جانے دیتے۔"

فیض علی: "خیر، جانے دو۔۔۔۔۔"

بوا حسینی چلی گئیں میں نے دیکھا کہ فیض علی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ یہ حال دیکھ کے مجھے بہت ہی ترس معلوم ہوا۔

معشوقوں کی بے وفائیوں کا تذکرہ قصہ کہانیوں میں جب سنتی تھی تو مجھے افسوس ہوتا تھا برا لگتی تھی۔ مجھے یہ خیال آیا اگر اس کا ساتھ نہ دیا تو میری بیوفائی اور احسان فراموشی میں کوئی شبہ نہیں۔

میں نے دل میں ٹھان لیا کہ اس شخص کا ضرور ساتھ دوں گی۔

میں: "اچھا تو میں چلوں گی۔"

فیض علی: "چلو گی؟"

میں: "ہاں، کوئی جانے دے یا نہ جانے دے۔ میں ضرور چلوں گی۔"

فیض علی: "کیونکر؟"

میں: "چھپ کے۔"

فیض علی: "اچھا تو پرسوں رات کو ہم آئیں گے۔ پہر رات رہے تمھیں یہاں سے نکال لے چلیں گے۔ دیکھو دغا نہ دینا ورنہ اچھا نہ ہوگا۔"

میں: "میں اپنی خوشی سے چلنے کو کہتی ہوں۔ تم سے وعدہ کر چکی ہوں۔ میرے وعدے کو بھی دیکھنا۔"

فیض علی: "بہت اچھا، دیکھا جائے گا۔"

اس رات کو فیض علی کوئی ڈیڑھ پہر رات رہے میرے پاس سے اُٹھ کے چلے گئے ان کے جانے کے بعد میں دل میں غور کرنے لگی۔ وعدہ تو کر لیا۔ مگر دیکھئے کیا ہوتا ہے جاؤں یا نہ جاؤں۔"

جب فیض علی کی محبت اور اپنے وعدے کا خیال آتا تھا تو دل کہتا تھا جانا چاہیئے مگر جیسے کوئی منع کرتا تھا کہ نہ جاؤ خدا جانے کیا ہو۔

اسی ادھیڑ بن میں صبح ہو گئی کوئی بات طے نہ ہوئی۔ دن بھر یہی باتیں دل سے رہیں رات کو اتفاق سے کوئی میرے پاس نہیں آیا۔ کمرے میں اکیلی اسی فکر میں رہی آخر نیند آ گئی۔ صبح کو ذرا دن چڑھے سو یا کی۔ گوہر مرزا نے کچی نیند میں آکر جھنجھوڑ کے اٹھا دیا مجھے بہت ہی برا معلوم ہوا۔ دن بھر نشے کا سا خمار رہا۔ نہیں معلوم کس بات پر بوا حسینی سے الجھن ہو گئی۔ ہاں خوب یاد آیا۔ بات یہ تھی کہ کہیں باہر سے مجرا آیا تھا۔ بوا حسینی نے مجھ سے کہا "جاؤ گی؟" اس وقت میرے سر میں درد ہو رہا تھا۔ میں نے صاف انکار کر دیا بوا حسینی نے کہا "واہ جب نہ تب انکار کر دیتی ہو۔ آخر اس پیشے میں ہو کر کرو گی کیا؟" میں نے کہا "میں تو نہ جاؤں گی"۔ بوا حسینی نے کہا "نہیں جانا ہو گا۔ خاص تمھاری فرمائش ہے اور خانم صاحب نے وعدہ کر لیا ہے، روپیہ بھی لے لیا ہے۔"

میں نے کہا "بوا! میں نہیں جانے کی۔ روپیہ پھیر دو۔"

بوا حسینی: "بھلا تم جانتی ہو۔ خانم صاحب روپیہ لے کے کبھی پھیرتی ہیں؟"

میں: "چاہے کسی کی طبیعت اچھی ہو چاہے نہ اچھی ہو۔ اگر خانم صاحب روپیہ نہ پھیریں گی تو میں اپنے پاس سے پھیر دوں گی۔"

بوا حسینی: "آہا ہا! اب تم بڑی روپیہ والی ہو گئی ہو لاؤ پھیر دو۔"

میں: "کتنا روپیہ ہے؟"

بوا حسینی: "سو روپیہ ہے۔"

میں: "سو روپیہ لو گی یا کسی کی جان؟"

بوا حسینی کو بھی اس دن خدا جانے کہاں کی ضد چڑھ گئی تھی۔

بوا حسینی: "بڑی کھری ہو تو دے دو۔"

میں: "شام کو دے دوں گی۔"

بوا حسینی: "وہاں باہر کے آدمی بیٹھے ہوئے ہیں وہ شام تک کے لئے کیوں مانیں گے؟"

بوا حسینی اپنے دل میں یہ سمجھی تھیں کہ اس کے پاس روپیہ کہاں سے آیا۔ اگر اس وقت اس حیلے سے تنگ کی جائے گی تو خواہ مخواہ مجرے پر راضی ہو جائے گی۔ میرے صندوقچہ میں اس وقت کچھ نہ ہو گے تو ہزار ڈیڑھ ہزار کی تو اشرفیاں تھیں۔ زیور کا ذکر نہیں

مگر اس وقت بوا حسینی کے سامنے صندوقچہ کھولنا مناسب نہ تھا۔

میں: "جاؤ گھنٹہ بھر میں دے جانا۔"

بوا حسینی: "گھنٹہ بھر میں کیا موکل دے جائیں گے؟"

میں: "ہاں دے جائیں گے۔ جاؤ بھی مجھے اس وقت دق نہ کرو۔ میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔"

بوا حسینی: "آخر کچھ کہو تو لڑکی کیا ہوا؟"

میں: "مجھے بخار کی سی حرارت ہے اور سر میں شدت سے درد ہو رہا ہے۔"

بوا حسینی۔ (ماتھے پر ہاتھ رکھ کے دیکھا) ہاں گرم تو ہے۔ نزلہ ٹپکا ہے۔ مگر مجرے کو تو کہیں پرسوں جانا ہوگا۔ جب تک خدا نہ کرے کیا طبیعت کا یہی حال رہے گا؟" روپے کیوں پھیرے جائیں؟"

میں اس بات کا کچھ جواب نہ دینے پائی تھی کہ بوا حسینی جلدی سے اٹھ کر چل دیں۔ بوا حسینی کی اس ہماہمی سے مجھے بہت ہی غصہ معلوم ہوا۔ اسی وقت دل میں بدی آگئی۔ دل نے کہا واہ جی! جب ان لوگوں کو ہمارے دکھ بیماری کا خیال نہیں، اپنے مطلب سے مطلب ہے تو ان کے ساتھ رہنا بیکار ہے۔

رسوا: "کبھی پہلے بھی یہ خیال آپ کے دل میں آیا تھا؟"

امراؤ: "کبھی نہیں۔ مگر آپ یہ کیوں پوچھتے ہیں؟"

رسوا: "اس لئے کہ فیض علی نے جو وہ سہارا دیا تھا اسی سے آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا۔"

امراؤ: "یہ تو کھلی ہوئی بات ہے۔"

رسوا: "کھلی ہوئی بات تو ہے مگر اس میں ایک باریکی بھی ہے۔"

امراؤ: "وہ باریکی کیا ہے؟ خدا کے لئے جلدی کہئے۔"

رسوا۔ فیض علی کے ساتھ نکل جانا وعدہ کرنے سے پہلے آپ کے دل میں ٹھن گیا تھا۔ اب دل بہانے ڈھونڈھ رہا تھا کہ کیونکر نکل چلوں۔"

امراؤ: "نہیں یہ بات نہ تھی میں دو دلی ہو رہی تھی کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ گوہر مرزا کے بے وقت چھیڑنے اور بوا حسینی کی زبردستی سے میں نے جانے کا قصد کر لیا تھا بلکہ اس وقت تک کچھ یوں ہی سا ارادہ تھا۔ جب تک رات کو فیض علی آئے تھے ان کی صورت

اور مستعدی دیکھ کے پکا ارادہ ہو گیا تھا۔“

رسوا: ”جی نہیں پہلے ہی سے تصور مصمم ہو چکا تھا اسی لئے گوہر مرزا کا چھیڑنا اور بوا حسینی کی ضد آپ کو بری معلوم ہوتی ورنہ یہ معمولی باتیں تھیں۔ ایسا تو اکثر ہوا کرتا ہوگا۔

امراؤ: ”میں نے مانا کہ ایسا ہوگا۔ اچھا پھر وہ منع کرنے والا کون تھا۔ میں سچ کہتی ہوں کہ چلتے چلتے مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی کان میں کہہ رہا ہے ”امراؤ نہ جا“ کہاں ماں جس وقت دو تین زینے اتر چکی ہوں اس وقت تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کوئی ہاتھ پکڑ کے کھینچتا ہے کہ نہ جا مگر میں نے نہ مانا۔“

رسوا: ”یہ روکنے والا بڑا زبردست تھا۔ اسی کا حکم نہ ماننے کی تو آپ نے سزا بھگتی۔“

امراؤ: ”اچھا میں سمجھی، یہ وہ چیز ہے جو نیک کاموں کی ہدایت کرتی ہے اور برے کاموں سے روکتی ہے۔“

رسوا: ”جی نہیں یہ وہ نہیں تھی۔ خانم کے مکان پر رہنا کون سا اچھا کام تھا آپ کی باتوں سے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ بدکاری کو ہمیشہ برا سمجھتی رہی ہیں۔ اگرچہ آپ کی حالت نے آپ کو اس کے کرنے پر مجبور کیا ہو۔ پھر خانم کے مکان پر رہنے سے ایک شخص کا ساتھ دے کے اس کا پابند ہو جانا بدرجہا بہتر تھا۔

بات یہ تھی کہ فیض علی کے حسن سلوک نے آپ کو اس کے ساتھ نکل چلنے کی ترغیب دی تھی۔ قیافہ شناسی کے شوق اور اس میں کسی قدر ملکہ ہو جانے سے آپ اچھی خاصی مردم شناس ہو گئی تھیں۔

عیش باغ کے میلے میں لوگوں کے چہرے دیکھنے کا حال میں نے بڑے شوق سے سنا تھا فیض علی کے کرتوت آپ پر ظاہر نہ تھے مگر اس کی شکل و شمائل رفتار و گفتار سے آپ کے دل کو آگاہی ہو گئی تھی کہ اس کے ساتھ جانے میں کچھ نہ کچھ خطا ضرور ہے مگر اس کے فریب کی باتوں اور روپیہ کی لالچ نے آپ کی آنکھوں پر پردے ڈال دئے تھے۔ افسوس اگر آپ علم مردم شناسی کے اصول سے واقف ہوتیں تو کبھی اس کے دام میں نہ آتیں۔“

امراؤ: ”میں پڑھوں گی کسی کتاب کا نام لیجئے۔“

خانم کا مکان چوک میں بہت ہی محفوظ جگہ ہے۔ پچھم کی طرف بازار ہے اتر دکھن اونچی اونچی رنڈیوں کے کمرے ہیں۔ ایک طرف بیا جان کا مکان ہے دوسری طرف حسین باندی رہتی ہیں۔ پچھواڑے میر حسین علی صاحب کا دیوان خانہ ہے۔

غرضکہ کسی جانب سے چور کا لگاؤ نہیں ہے اس پر بھی تین پاسی نوکر تھے۔ جو رات بھر کوٹھے پر پھرتے تھے۔ جب سے فیض علی کی آمد و رفت شروع ہوئی مکا پاسی خاص میرے کمرے کے دروازہ پر رہتا تھا۔ کیونکہ فیض علی رات گئے آیا کرتے تھے اور پہر رات سے چلے جاتے تھے۔ دروازے بند کرنے اور قفل لگانے کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔

شب کو حسب وعدہ فیض علی آئے۔ تھوڑی دیر تک چپکے چپکے چل نکلنے کے مشورے ہوا کئے۔ اتنے میں مکا نے انگڑائی لی۔ معلوم ہوا کہ جاگ رہا ہے۔ فیض علی نے اسے کمرے میں بلایا "ایک روپیہ انعام لو۔ تم کو ہم نے کچھ نہیں دیا تھا۔ دروازہ بھیڑ دیتا ہم جاگ رہے ہیں۔ کوئی ڈر نہیں۔

مکا سلام کرکے کمرے کے باہر نکلا۔ فیض علی نے کہا۔ لو اب چلو۔ میں اٹھی دو جوڑے کپڑے دن ہی سے گٹھری میں باندھ رکھے تھے۔ زیور کا صندوقچہ میں نے پہلے ہی سے کھسکا دیا تھا۔ گٹھری بغل میں دبائی۔ اکبری دروازہ کی طرف کا راستہ لیا۔ نخاس میں بیل گاڑی پہلے ہی سے کھڑی کی گئی تھی۔ ہم دونوں سوار ہوئے اور بیل نکلنے ہنڈولے ناکے سے تھوڑی دور جاکے فیض علی کا سائیس گھوڑا لئے ہوئے ملا وہ بھی ہم کے ساتھ ہو لیا۔ صبح ہوتے ہوتے موہن لال گنج پہنچے۔ یہاں سرائے میں دوپہر تک قیام ہوا بھٹیاری سے کھانا پکوا کے کھایا۔

دال ارہر کی بے نمک پھیکی   مطلقاً جس میں بو نہ تھی گھی کی

تیسرے دن رائے بریلی میں داخل ہوئے۔ یہاں سفر کے مناسب کپڑا خریدا میرے دو جوڑے بنوائے۔ لکھنؤ سے جو کپڑے پہن کے آئی تھی اتار کے گٹھری میں باندھا۔

رائے بریلی سے بیل گاڑی کو جو لکھنؤ سے آئی تھی رخصت کیا۔ دوسری گاڑی کرایہ پر کی۔ لال گنج کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ قصبہ رائے بریلی سے کوئی نو دس کوس کے فاصلے پر ہے۔ شاموں شام پہنچ گئے۔ رات بھر سرائے میں رہے۔ فیض علی ضروری سودے سلف کو بازار گئے۔ جس کوٹھڑی میں ہم تھے اس کے پاس والی کوٹھڑی میں ایک دیہاتی رنڈی اتری ہوئی تھی۔ نصیبن نام تھا۔ گہنے پاتے سے درست تھی کپڑے بھی اچھے تھے۔ تھی تو دیہاتی مگر زبان بہت صاف تھی۔ لب و لہجہ قد باتوں کا ایسا تھا۔ میرے اس کے دیر تک باتیں ہوا کیں۔

نصیبن: "آپ کہاں سے آئی ہیں؟"

میں: "فیض آباد سے۔"

نصیبن: "فیض آباد میں تو میری بہن پیارن رہتی ہے۔ آپ ضرور جانتی ہونگی۔"

میں: "(آخر پہچان گئی نا کہ میں بھی رنڈی ہوں) میں کیا جانوں۔"

نصیبن: "فیض آباد میں کون ایسی بیتریا ہے جو ہم کو نہیں جانتی۔"

میں: "بہت دنوں سے ان کے گھر بیٹھ گئی ہوں۔ یہ لکھنؤ میں رہتے ہیں اسی لئے میں بھی اکثر وہیں رہتی ہوں۔"

نصیبن: "آخر پیدائش تو تمہاری فیض آباد کی ہے۔"

میں۔ "(یہ تو بالکل سچ کہتی ہے۔ اب کیا جواب دوں) ہاں پیدا تو وہاں ہوئی مگر بچپنے سے باہر رہی۔"

نصیبن: "تو فیض آباد میں کسی کو نہیں جانتیں؟"

میں: "کسی کو نہیں۔"

نصیبن: "یہاں کیونکر آنا ہوا؟"

میں: "ان کے ساتھ ہوں۔"

نصیبن: "اور جاؤگی کہاں؟"

میں: "اناؤ۔"

نصیبن: "لکھنؤ ہوتی ہوئی آئی ہو؟"

میں: "ہاں"

نصیبن: "پھر سیدھا راستہ چھوڑ کے ادھر پھیر میں کہاں آئی ہو؟ نواب گنج ہو کے اناؤ چلی گئی ہوتیں۔"

میں: "رائے بریلی میں ان کا کچھ کام تھا۔"

نصیبن: "میں نے اس لئے کہا کہ ادھر کا راستہ بہت خراب ہے۔ ڈاکوؤں کے مارے مسافروں کی آمد و رفت بند ہے۔ بلیہ کی بہیڑ میں سیکڑوں کو لوٹ لیا۔ اناؤ کا راستہ ادھر ہی سے ہو کے ہے۔ تم تین آدمی ہو جس میں دو مرد ایک عورت ذات تمہارے ہاتھ گلے میں گہنہ بھی ہے۔ بھلا تمہاری کیا حقیقت ہے وہاں تو براتیں لٹ جاتی ہیں۔"

میں ۔ "تن بہ تقدیر۔"

نصیبن "بڑی دل کی کڑی ہو۔"

میں "پھر کیا کروں؟"

اس کے بعد ادھر اُدھر کی باتیں ہوا کیں جن کا دہرانا کوئی ضرور نہیں اور نہ مجھے یاد ہیں۔ ہاں میں نے پوچھا۔

میں "تم کہاں جاؤ گی؟"

نصیبن "ہم تو گدائی کو نکلے ہیں۔"

میں "نہیں سمجھی۔"

نصیبن "اے لو گدائی نہیں جانتیں کیسی پتریا ہو۔"

میں "بہن میں کیا جانوں۔ گدائی تو بھیک مانگنے کو کہتے ہیں۔"

نصیبن "ہمارے دشمن بھیک مانگیں۔ اور سچ پوچھو تو میں کہوں۔ پتریا کی ذات تو بھیک منگنی ہے۔ اس میں ڈیرے دار ہو یا نہ ہو۔"

میں "ہاں سچ تو ہے۔ مگر مجھے نہیں معلوم تھا گدائی کسے کہتے ہیں؟"

نصیبن "سال میں ایک مرتبہ ہم لوگ گھر سے نکل کے گاؤں گاؤں پھرتے ہیں امیر رئیسوں کے مکان پر جا کے اترتے ہیں۔ جو کچھ جس کے مقدور میں ہوتا ہے ہمیں دیتا ہے کہیں مجرا ہوتا ہے کہیں نہیں ہوتا۔"

میں ۔ اچھا اس کو گدائی کہتے ہیں۔

نصیبن۔ "ہاں اب سمجھیں۔"

میں "یہاں کسی رئیس کے پاس آئی ہو؟"

نصیبن "یہاں سے تھوڑی دور پر ایک شمبھو دھیان سنگھ راجہ کی گڑھی ہے انھیں کے پاس گئی تھی۔ راجہ صاحب کو بادشاہی حکم پہنچا ہے۔ ڈاکوؤں کے بندوبست کو گئے ہوئے ہیں۔ کئی دن ٹھہری رہی۔ آخر دم گھبرایا یہاں چلی آئی یہاں سے دو کوس پر ایک گاؤں ہے سمر سیادہ گاؤں بالکل پتریوں کا ہے وہاں میری خالہ رہتی ہیں کل ان کے پاس جاؤں گی۔"

میں "پھر کہاں جاؤ گی؟"

نصیبن "میں ٹھہری رہوں گی جب راجہ صاحب آجائیں گے تو پھر گڑھی کو جاؤنگی

اور بہت سے ڈیرے بھی ان کے انتظار میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

میں: "کیا راجہ صاحب کو ناچ مجرے کا بھی شوق ہے؟"

نصیبن: "بہت شوق تھا۔"

میں: "کیوں اب کیا ہوا؟"

نصیبن: "جب سے ایک تریا لکھنؤ سے لائے ہیں ہم لوگوں کی کوئی قدر نہیں رہی۔"

میں: "اس تریا کا کیا نام ہے؟"

نصیبن: "نام تو مجھ کو یاد نہیں۔ عورت دیکھی ہے۔ گدری گدری سی ہے۔ ذرا چہرے مہرے کی اچھی ہے۔"

میں: "گاتی خوب ہوگی۔"

نصیبن: "خاک، گانا وانا نہیں آتا۔ ہاں ناچتی ذرا اچھا ہے۔ راجہ صاحب اسی پر لٹو ہیں۔"

میں: "کتنے دنوں سے وہ تریا آئی ہے؟"

نصیبن: "کوئی چھ مہینے ہوئے ہوں گے۔"

رات کو میں نے فیض علی سے راستہ کی خرابی کا حال بیان کیا۔ انھوں نے کہا خاطر جمع رکھو ہم نے بندوبست کر لیا ہے۔

دوسرے دن منہ اندھیرے موہن لال گنج کی سرا سے روانہ ہوئے۔ نصیبن کی گاڑی ہمارے پیچھے پیچھے تھی۔ فیض علی گھوڑے پر سوار تھے۔ ہم اور نصیبن باتیں کرتے جاتے تھے۔ تھوڑی دور چل کے سمت بہا ملا۔ نصیبن نے دور سے ہم کو وہ گاؤں دکھایا۔ سڑک کے کنارے کھیت تھے۔ ان میں کچھ گنواریاں پانی دے رہی تھیں۔ کچھ کھیت نرا رہی تھیں۔ کچھ پُرائی چلا رہی تھی۔ اس میں ایک مسٹنڈی عورت دھوتی باندھے بیل ہنکا رہی تھی۔ ایک چھومے رہی تھی۔ نصیبن نے کہا یہ سب تریا ہیں۔ میں نے دل میں کہا واہ پیشہ کیا ہے اس قدر محنت جو مردوں سے مشکل ہو۔ آخر ان کو تریا ہونا کیا ضرور تھا مگر ان کی صورتیں بھی ایسے ہی کاموں کے لائق ہیں۔ لکھنؤ میں جو کنڈے والیاں، وہی دائیاں، گھوسنیں آتی ہیں ان کی شکل بھی ایسی ہی ہوتی ہے۔ نصیبن یہاں سے رخصت ہوئی۔

کوئی دو کوس جا کے ایک نشیب ملا۔ جا بجا پیڑ، بڑے بڑے غار، سامنے ندی کا

کنارہ نظر آیا۔ دونوں طرف دور تک گنجان درختوں کی قطار تھی۔ جب ہم اس موقع پر پہنچے ہیں دھوپ اچھی طرح نکل چکی تھی۔ کوئی پہر بھر دن چڑھا ہوگا۔ اس سڑک پر سوا ہمارے اور کوئی راستہ چلتے دکھائی نہ دیتا تھا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ ندی کے پاس پہنچ کے فیض علی نے گھوڑا آگے بڑھایا۔ میں رکتی کی رکتی رہ گئی۔ یہ جا وہ جا بہت دور نکل گئے۔ تھوڑی دور تک گھوڑا نظروں سے غائب رہا پھر ندی کے اس پار رہا کے معلوم ہوا۔

ہماری گاڑی اسی طرح چلی جاتی تھی، گاڑی بان گاڑی ہانک رہا تھا۔ سائیس گھوڑے کے پیچھے دوڑا چلا گیا تھا۔ اب میں بجز اور دہ گاڑی بان ہے۔ اتنے میں دور سے دیکھا کہ دس پندرہ گنوار گاڑی کی طرف دوڑے چلے آتے ہیں۔ میں نے دل میں کہا خدا خیر کرے۔ تھوڑی دیر میں گنواروں نے آ کر گاڑی کو گھیر لیا۔ سب تلواریں باندھے ہوئے تھے۔ بندوقیں کندھے پر تھیں۔ توڑے سلگ رہے تھے۔

گنوار: ”گاڑی بان سے) گاڑی روک۔ کون ہے گاڑی میں؟“

گاڑی بان: ”یہ سواری بریلی سے آئی ہے۔ آنا ڈ کا بھاڑا کیا ہے؟“

گنوار: ”روک گاڑی۔“

گاڑی بان: ”گاڑی کیوں روکیں۔ خانصاحب کے یہاں کی زنانی سواری ہے؟“

گنوار: ”کوئی مرد ساتھ نہیں ہے؟“

گاڑی بان: ”مرد آگے بڑھ گئے ہیں، آتے ہوں گے۔“

گنوار: ”اترو بی گاڑی سے۔“

ایک: ”پردہ کھول کے کھینچ لو۔ سسری بتریا تو ہے۔ اس کا پردہ کون؟“

ایک گنوار آگے بڑھا۔ گاڑی کا پردہ الٹ کے مجھے گاڑی سے اتارا۔ تین آدمی مجھے گھیر کے کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں ندی کی طرف سے گرد اٹھی اور گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز آئی۔ جب گھوڑے قریب آئے میں نے دیکھا آگے فیض علی کا گھوڑا ہے پیچھے اور دس پندرہ سوار ہیں۔ گنواروں نے دیکھتے ہی بندوقوں کی ایک باڑھ ماری، ان میں دو سوار ادھر کے گر پڑے۔ پھر تلواریں میان سے نکلیں۔ سوار سر ہی پر آ گئے تھے، ادھر سے بھی تلواریں کھنچ گئیں۔ دو ایک ہاتھ چلے ہوں گے تین گنوار ادھر کے زخمی ہو کے گرے۔ ایک سوار ادھر کا گرا۔ گنوار بھاگ نکلے۔ اچھا کہاں جاؤ گے، دیکھو ندی اس پار کیا ہوتا ہے؟

گنواروں کے جانے کے بعد میں پھر گاڑی میں بیٹھی۔ جس سوار کے زخم آیا تھا اُس کے پٹیاں کسی گئیں وہ بھی گاڑی میں میرے ساتھ بٹھایا گیا۔ گاڑی روانہ ہوئی۔ اب دو سوار ہماری گاڑی کے ادھر اُدھر ہیں۔ کچھ سوار آگے آگے ہیں کچھ پیچھے ہیں۔"

فیض علی: "(اپنے ساتھی سے)" بھائی کسی طرح لکھنؤ سے نکلنا ہی نہیں ہوتا تھا بڑی مشکل سے جان چھڑا کے آیا ہوں۔"

فضل علی: "یہ نہیں کہتے عیش میں پڑے تھے!"

فیض علی: "ہاں یہ تو کہو گے۔"

فضل علی: "کہیں گے کیا تحفہ بھی تو ساتھ ساتھ ہے۔ ذرا بھابی صاحب کو ہم بھی تو دیکھیں۔"

فیض علی: "آپ سے کوئی پردہ ہے۔ دیکھیے۔"

فضل علی: "ڈیرے پر چل کے بامراد دیکھیں گے۔"

اتنے میں گاڑی ندی کے کنارے پہنچ گئی۔ کنارہ بہت اونچا تھا۔ مجھ کو گاڑی سے اُتر کے پیدل چلنا پڑا۔ بڑی مشکل سے گاڑی دوسرے کنارے تک پہنچی۔ جو زخمی سوار گاڑی میں تھا۔ اس کے زخم گاڑی کی تکان سے کھل گئے تھے۔ تمام گاڑی میں خون ہی خون تھا۔

ندی اس پار جا کے زخم پھر سے باندھے گئے، گاڑی دھوئی گئی۔ پھر میں گاڑی میں سوار ہوئی۔ اب قریب دوپہر کے دن آ چکا۔ مجھے شدت سے بھوک لگی ہوئی تھی۔ گاڑی اسی طرح چل رہی تھی۔ ان لوگوں کا ڈیرا کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ندی سے کوئی ۲ کوس پر جا کے ایک گاؤں کے پاس باغ تھا۔ اس میں چھولداریاں پڑی ہوئی تھیں۔ گھوڑے بندھے ہوئے تھے، لوگ ادھر اُدھر پھر رہے تھے۔ کچھ لوگ کھانا پکا رہے تھے۔ یہاں آکر ہماری گاڑی رکی۔ ہمارے ساتھ کے سواروں کو دیکھتے ہی ایک آدمی اس ڈیرے سے آگے بڑھا، اس نے کچھ فضل علی کے کان میں کہا۔ فضل علی کے چہرے سے تشویش کے آثار ظاہر ہوتے تھے۔ وہ فیض علی کے پاس گھوڑا بڑھا کے آئے۔ فیض علی سے چپکے چپکے باتیں ہوئیں۔

فیض علی: "اچھا دیکھا جائے گا کھانا تو کھالو۔"

فضل علی: "کھانا کھانے کی مہلت نہیں ہے ایسے ہی نکل چلو۔"

فیض علی: "اچھا جب تک چھولداریاں اُکھاڑی جائیں گھوڑوں پر زیں کسے جائیں۔"

ہم لوگ کھانا کھالیں۔"

میں گاڑی سے اتری۔ آم کے درخت کے نیچے دری بچھا دی گئی۔ سالن کی پتیلیاں لاکے رکھی گئیں۔ گھی کی کھتی روٹیاں موٹی موٹی ٹوکریوں میں آئیں۔ میں فیض علی اور فضل علی تین آدمیوں نے مل کے کھانا کھایا۔ کھانا کھاتے وقت اگرچہ چہروں پر تشویش کے آثار تھے مگر ہنسی مذاق ہوتا جاتا تھا۔

جتنی دیر میں ہم لوگوں نے کھانا کھایا جھولداریاں اکھاڑ کے ٹٹوؤں پر لادی گئیں زین کسے گئے۔

آخر قافلہ چل نکلا۔

دو ہی تین کوس گئے ہوں گے کہ بہت سے سوار اور پیدلوں نے آکر گھیر لیا۔ ادھر بھی سب پہلے سے مستعد تھے، دونوں طرف گولیاں چلنے لگیں۔ اس لڑائی میں فیض علی میری گاڑی کے آس پاس رہے۔ میں گاڑی کے اندر بیٹھی دعائیں پڑھ رہی ہوں، کلیجہ ہاتھوں اچھل رہا ہے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی گاڑی کا پردہ کھول کے دیکھ لیتی ہوں یہ گرا وہ مرا۔ آخر دونوں طرف سے بہت سے زخمی ہوئے، ہمارے ساتھ پچاس ساٹھ آدمی تھے۔ راجہ دھیان سنگھ کے آدمی بہت سے تھے ایک پر دس ٹوٹ پڑے بہت سے زخمی ہوئے فضل علی اور فیض علی موقع پاکر نکل گئے۔ دس بارہ آدمی اور گرفتار ہوئے۔ انھیں گرفتاروں میں میں بھی تھی۔

ہم لوگوں کی گرفتاری کے بعد گاڑی بان نے منت سماجت کرکے رہائی حاصل کی۔ زخمی سوار کو میدان میں ڈال دیا جہاں اور لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ تو اپنی جان لے کر بریلی کی طرف راہی ہوا۔ مردوں کی مشکیں کسی گئیں۔ گڑھی کی طرف روانہ ہوئے۔ گڑھی وہاں سے کوئی چار پانچ کوس تھی، تھوڑی دور جاکے راجہ صاحب اور ان کے ساتھ کے اور لوگ ملے۔ راجہ صاحب خود گھوڑے پر سوار تھے۔ ہم لوگ سامنے گئے۔ میری طرف اشارہ کرکے پوچھا۔

راجہ۔ "یہی بی صاحبہ لکھنؤ سے آئی ہیں؟"

میں۔ (ہاتھ باندھ کے) "حضور قصوروار تو ہوں لیکن اگر غور کیجئے تو اتنا قصور بھی نہیں۔ عورت ذات چھل فریب سے آگاہ نہیں، میں کیا جانتی تھی۔"

راجہ: ''اب اپنی بے قصوری ثابت کرنے کی کوشش نہ کیجئے قصور آپ کا ثابت ہے۔ جو باتیں آپ سے پوچھی جائیں ان کا جواب دیجئے۔''

میں: ''جو حکم حاکم۔''

راجہ: ''لکھنؤ میں کہاں مکان ہے؟''

میں: ''ٹکسال میں۔''

راجہ: ''(آدمیوں کو اشارہ کر کے) دیکھو تمت کچہری سے ایک بیل گاڑی لے لو لکھنؤ کی رنڈیاں ہیں ہمارے دیس کی پتریاں نہیں ہیں کہ رات بھر محفل میں ناچیں اور برات کے ساتھ دس دس کوس تک ناچتی چلی جائیں۔''

میں: ''حضور کو خدا سلامت رکھے۔''

آدمی گئے۔ گڑھی سے گاڑی لے آئے۔ مجھے گاڑی پر بٹھایا اور لوگ اسی طرح مشکیں کسے ساتھ ساتھ تھے۔

گڑھی میں پہنچ کر وہ لوگ نہیں معلوم کہاں بھیج دیے گئے۔ میں کوٹ میں بلائی گئی۔ ستھرا مکان رہنے کو دیا گیا۔ دو آدمی خدمت کو مقرر ہوئے۔ پکا پکایا کھانا۔ پوریاں کچوریاں۔ مٹھائیاں۔ طرح طرح کے اچار کھانے کو۔ لکھنؤ کے چھوڑنے کے بعد آج رات کو کھانا سیر ہو کے کھایا۔ دوسرے دن صبح کو معلوم ہوا کہ اور قیدی لکھنؤ کو روانہ کر دیے گئے۔ مجھ کو رہائی کا حکم ہے۔ مگر ابھی راجہ صاحب رخصت نہیں کریں گے۔ پہر دن چڑھے راجہ صاحب نے بلا بھیجا۔

راجہ: ''اچھا ہم نے تم کو رہا کیا۔ فیضو اور فضل علی دونوں بدمعاش نکل گئے اور سب نابکار جو گرفتار ہوئے لکھنؤ میں پہنچ کر اپنی سزا کو پہنچیں گے۔ بیشک، تمہارا کوئی قصور نہیں ہے مگر آئندہ ایسے لوگوں سے نہ ملنا۔ اگر تمہارا جی چاہے دو چار دن یہاں رہو ہم نے تمہارے گانے کی بہت تعریف سنی ہے۔''

میں: (نصیبن کی وہ بات یاد آئی کہ راجہ صاحب کے پاس لکھنؤ کی کوئی رنڈی ہے۔ ہو نہ ہو اس نے میری تعریف کی ہوگی) ''حضور نے کس سے سنا؟''

راجہ: ''اچھا یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔''

تھوڑی دیر کے بعد لکھنؤ کی وہ رنڈی طلب ہوئی۔ لکھنؤ کی رنڈی کون؟ خورشید جان۔ خورشید دوڑ کے مجھ سے لپٹ گئی۔ دونوں مل کے رونے لگے۔ آخر راجہ صاحب نے

خوشی سے فوراً علیحدہ ہو کر سامنے مودب بیٹھ گئے۔ سازندے طلب ہوئے۔ رہائی کی خبر سن کے میں نے حسبِ حال ایک غزل کہہ لی تھی، بہت سے شعر تھے۔ جو شعر یاد آتے ہیں سنائے دیتی ہوں۔ ہر ایک شعر پر راجہ صاحب اور حاضرینِ جلسہ بہت ہی محظوظ ہوتے تھے بیخودی کا عالم تھا۔ غزل یہ ہے۔

قیدیِ الفتِ صیاد رہا ہوتے ہیں — خوش نوایانِ چمن زاد رہا ہوتے ہیں
تو کبھی چھوڑ دے تو تری زلف نہ چھوڑے ہم کو — کوئی ہم اسے ستم ایجاد رہا ہوتے ہیں
حسرت اے ذوقِ اسیری کہ خفا ہے صیاد — آج ہم با دلِ ناشاد رہا ہوتے ہیں
خاطرِ نازکِ صیاد کو برداشت نہیں — باعثِ نالہ و فریاد رہا ہوتے ہیں
غمِ دنیا نہ سہی اور ہزاروں غم ہیں — قیدِ ہستی سے کب آزاد رہا ہوتے ہیں
کیوں نہ رشک آئے ہمیں تازہ گرفتاروں پر — ہم تو اے لذتِ بیداد رہا ہوتے ہیں
اے ادا قیدِ محبت سے رہائی معلوم — کب اسیرِ غمِ صیاد رہا ہوتے ہیں

مقطع سن کے راجہ صاحب نے پوچھا "ادا کس کا تخلص ہے؟"

خورشید نے کہا "خود انھیں کی کہی ہوئی ہے۔" راجہ اور بھی خوش ہوئے۔

راجہ۔ "اگر ایسا جانتے تو ہم آپ کو ہرگز نہ رہا کرتے۔"

میں: "غزل سے حضور کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ اسی کا تو افسوس ہے مگر اب تو حضور حکم دے چکے اور لونڈی آزاد ہو چکی۔"

اس کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔ راجہ صاحب اندر رسوئی کھانے چلے گئے۔ خورشید سے مجھ سے خوب باتیں ہوئیں۔

خورشید۔ "دیکھو بہن! میرا کوئی قصور نہیں، خانم صاحب سے اور راجہ صاحب سے بہت دنوں سے لاگ ڈانٹ تھی راجہ صاحب نے کئی مرتبہ مجھ کو بلوایا انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ آخر عیش باغ کے میلے میں ان کے آدمی لگے ہوئے تھے مجھ کو زبردستی اٹھا لائے جب سے یہیں ہوں، ہر طرح کی میری خاطر ہوتی ہے سب طرح کا آرام ہے۔"

میں۔ "موئے گنواروں میں خوب تمھارا جی لگتا ہے۔"

خورشید۔ "یہ بات سچ ہے مگر تم میری طبیعت کو جانتی ہو روز ایک نئے شخص کے پاس جانا بالکل خلاف ہے وہاں یہی کرنا پڑتا تھا۔ خانم کو جانتی ہو۔ یہاں صرف راجہ صاحب سے سابقہ ہے اور سب میرے حکم کے تابع ہیں دوسرے یہ میرا وطن ہے یہاں کی ہر

چیز مجھے ابھی معلوم ہوتی ہے۔

میں: "تو تمھارا ارادہ لکھنؤ جانے کا نہیں ہے؟"

خورشید: "مجھے تو معاف کرو۔ یہاں اچھی طرح ہوں، بلکہ تم بھی یہیں رہو۔"

میں: "یہاں تو نہ رہوں گی۔ مجبوری کی اور بات ہے۔"

خورشید: "لکھنؤ جاؤ گی؟"

میں: "نہیں۔"

خورشید: "پھر کہاں؟"

میں: "جہاں خدا لے جائے۔"

خورشید: "ابھی کچھ دنوں رہو۔"

میں: "ہاں ابھی تو ہوں۔"

پندرہ بیس دن تک میں گڑھی میں رہی۔ خورشید سے روزانہ ملتی تھی۔ خورشید کا دل وہاں لگا ہوا تھا۔ میرا جی بہت گھبراتا تھا۔ آخر راجہ صاحب سے میں نے عرض کیا۔

میں: "حضور نے مجھے حکم رہائی دیا ہے؟"

راجہ: "ہاں۔ تو پھر کیا جانا چاہتی ہو؟"

میں: "جی ہاں۔ پھر لونڈی کو رخصت کیجئے۔ پھر حاضر ہوں گی۔"

راجہ: "یہ لکھنؤ فقرے ہیں۔ اچھا کہاں جاؤ گی؟"

میں: "کانپور۔"

راجہ: "لکھنؤ نہ جاؤ گی؟"

میں: "حضور لکھنؤ کیا منہ لے کے جاؤں گی۔ خانم سے کیسی شرمندگی ہوگی ساتھ والیاں کیا کیا ہنسیں گی۔"

اول تو میرا ارادہ لکھنؤ جانے کا نہ تھا۔ دوسرے یہ بھی خیال تھا کہ لکھنؤ جانے کو اگر راجہ صاحب سے کہوں گی تو شاید رہائی نہ ہوگی کیونکہ وہاں جانے سے خورشید کا حال کھل جاتا۔ شاید خانم کوئی آفت برپا کرتیں۔

راجہ صاحب، میرے اس ارادے سے بہت خوش ہوئے۔

راجہ: "تو لکھنؤ کبھی نہ جاؤ گی؟"

میں: "لکھنؤ میں میرا کون بیٹھا ہے۔ گانے بجانے کا پیشہ ہے جہاں رہ جاؤں گی کوئی منہ

نہ کوئی قدر دان نکل ہی آئے گا۔ رنڈی کی قید میں اب مجھے رہنا منظور نہیں اگر وہاں رہنا ہوتا تو نکل کیوں آتی۔"

میں نے راجہ صاحب کو یقین دلا دیا کہ میں لکھنؤ ہرگز نہ جاؤں گی۔

دوسرے دن راجہ نے مجھے رخصت کیا۔ دس اشرفیاں انعام دیں۔ ایک دو شالہ دیا، ایک رومال، ایک رتھ نئی بیل کے بنگلہ نما ڈیرہ دار تیار کروا دیا۔ ایک گاڑی بان اور دو آدمی میرے ساتھ کئے۔ اناؤ کو روانہ ہوئی۔ وہاں پہنچ کر سلارو بھٹیارے کے مکان میں ٹھہری۔ راجہ صاحب کے آدمیوں کو رخصت کیا صرف گاڑی بان رہ گیا۔

سر شام میں اپنی کوٹھری کے سامنے بیٹھی ہوں۔ مسافر آتے جاتے ہیں۔ بھٹیاریاں چلا رہی ہیں۔ میاں مسافر ادھر ادھر۔ مکان جھاڑا بہارا ہے۔ حقہ پانی کو آرام۔ کھانے پینے کا آرام گھوڑے ٹٹو کے لئے نیم کا سایہ ......

اتنے میں کیا دیکھتی ہوں کہ فیض علی کا سائیس چلا آتا ہے۔ سرا کے پھاٹک ہی سے اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ میری اس کی آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ میرے پاس چلا آیا۔ باتیں کرنے لگا۔ میرا حال پوچھا اس کے بعد میں نے فیض علی کا حال پوچھا اس نے کہا ان کو آپ کے اناؤ آنے کی خبر مل گئی ہے۔ آج رات کو پہر ڈیڑھ پہر رات گئے ضرور آجاویں گے۔

یہ سن کے میرا دل دھڑکنے لگا۔ وجہ یہ تھی کہ مجھے اب فیض علی کا ساتھ منظور نہ تھا تنت کھیڑے کے واقعہ کے بعد میں سمجھی تھی کہ اب گلو خلاصی ہوگئی۔ اناؤ میں فیض علی جان پر نازل ہوگئے۔ معمولی بات چیت کی اناؤ سے روانگی کا مشورہ ہونے لگا۔ بڑی دیر تک باتیں رہیں۔ آخر یہ صلاح ٹھہری کہ گاڑی بان کو رخصت کرو۔ سائیس گاڑی ہنکائے گا میں خود گھوڑے کو دیکھوں گا۔ پھر یہ ٹھہری کہ گاڑی سلارو بھٹیارے کے پاس چھوڑ دو راتوں رات گنگا اس پار اتر چلو۔ اب کیا کر سکتی تھی فیض علی کے بس میں تھی جو انھوں نے کہا مجھے چار و ناچار منظور کرنا پڑا۔ فیض علی نے سلارو کو پکارا۔ کنارے لے جا کر دیر تک باتیں کیں۔ کوئی آدھی رات گئے اپنے ساتھ مجھے گھوڑے پر بٹھایا۔ سرائے سے باہر ہوئے۔ پانچ چھ کوس زمین کا چلنا رات کا وقت میرا بند بند ٹوٹ گیا۔ مدتوں درد رہا آخر جوں توں کر کے گنگا کے کنارے پہنچے۔ بڑی مشکل سے ناؤ تلاش کی۔ اس پار اترے۔ فیض علی نے کہا، اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔ صبح ہوتے ہوتے کانپور پہنچ گئے فیض علی

نے مجھ کو لاٹھی محال میں اتارا خود مکان کی تلاش میں نکلے، تھوڑی دیر کے بعد آکے کہا یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں ہے۔ مکان ہم نے ٹھہرا لیا ہے۔ وہاں چلی چلو۔ ڈولی کرایہ کی کی تھوڑی دیر میں ڈولی ایک پختہ عالیشان مکان کے دروازے پر ٹھہری فیض علی نے ہم کو یہاں اتارا۔ مکان کے اندر گیا دیکھتی ہوں کہ ایک دالان میں دو ٹوٹی چارپائیاں پڑی ہیں۔ ایک چٹائی بچھی ہے اس پر ایک عجیب قطع کا حقہ رکھا ہوا ہے جسے دیکھتے ہی پینے سے مجھے نفرت ہو گئی۔ مکان کا قرینہ دیکھ کے دل کو وحشت ہونے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد فیض علی نے کہا اچھا تو میں بازار سے کچھ کھانے کو لے آؤں۔ میں نے کہا "بہتر ہے مگر ذرا جلدی آنا۔" فیض علی بازار کو گئے۔ میں اسی میں اکیلی بیٹھی ہوں۔

اب سنیئے فیض علی بازار کو جو گئے تو وہیں کے ہو رہے۔ نہ آج آتے ہیں نہ کل ایک گھڑی دو گھڑی۔ پہر دو پہر کہاں تک کہوں۔ دوپہر گذری۔ شام ہونے کو آئی اناؤ میں پہر شام کھانا کھایا تھا۔ رات کو گھوڑے پر چلنے کی تکان۔ نیند کا خمار۔ صبح سے منہ پر چلو پانی تک نہیں پڑا ٹکڑا تک نہیں کھایا۔ بھوک کے مارے دم نکلا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر میں سورج ڈوب گیا۔ اندھیرا ہونے لگا۔ آخر رات ہو گئی یا خدا اب کیا کروں۔ منہ کھول دیا۔ اٹھ بیٹھی۔ اتنا بڑا ڈھنڈار مکان بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔ بہاں خدا کی ذات اور میں اکیلی۔ یہ معلوم ہوتا تھا۔ اب اس کوٹھڑی سے کوئی نکلا۔ وہ سامنے والے دالان میں کوئی ٹہل رہا ہے۔ کوٹھے پر دھم دھم کی آواز آئی۔ زینے سے کوئی کھٹ کھٹ اترا چلا آتا ہے۔ دوپہر رات ہو گئی اب تک انگنائی اور دیواروں پر چاندنی تھی۔ اب چاند بھی چھپ گیا۔ بالکل اندھیرا گھپ ہو گیا۔ آخر میں دوشالے سے منہ لپیٹ کے پڑ رہی۔ پھر کچھ کھٹکا ہوا۔ رات پہاڑ ہو گئی۔ کاٹے نہیں کٹتی ہے۔ آخر جوں توں کر کے صبح ہوئی۔

دوسرے دن صبح کو تو عجیب ہی عالم تھا۔ اب لکھنؤ کی قدر ہوئی۔ دل میں کہتی تھی کہ خدا کس مصیبت میں جان پڑی۔ لکھنؤ کا عیش چین اور اپنا کمرا یاد آتا تھا ادھر ایک آواز دی ادھر آدمی مستعد۔ حقہ پان کھانا پانی۔ جو کچھ ہوا ادھر منہ کھولا ادھر سامنے موجود۔ خلاصہ یہ کہ آج بھی صبح سے دوپہر ہو گئی اور فیض علی نہ آئے۔ اس حالت میں اگر کوئی نیک بخت بی بی چار دیواری کی بیٹھنے والی ہوتی تو ضرور ہی گھٹ گھٹ کے مر جاتی۔ میرا بیاؤ کھلا ہوا تو نہ تھا مگر پھر بھی سیکڑوں، مردوں میں بیٹھ چکی تھی۔ کانپور نہ سہی لکھنؤ کے تو

اکثر گلی کوچوں سے واقف یہاں کی بھی سرا دیکھی تھی۔ بازار دیکھا تھا۔ اب میری بلا اُس خالی مکان میں بیٹھی رہتی چھپ سے کنڈی کھول گلی میں نکل کھڑی ہوئی۔ دس بیس قدم گھر سے گئی ہوں گی کہ دیکھتی کیا ہوں کہ ایک شخص سرکاری وردی پہنے گھوڑے پر سوار دس پندرہ برق انداز ساتھ ان کے حلقہ میں میاں فیض علی ٹنڈیاں کسی ہوئی سامنے سے چلے آتے ہیں۔ یہ ماجرا دیکھتے ہی میں سن سے ہو گئی۔ وہیں ٹھٹھک گئی۔ ایک پتلی سی گلی ملی۔ اسی گلی میں ایک مسجد تھی میں نے دل میں خیال کیا کہ سب سے بہتر خدا کا گھر ہے۔ تھوڑی دیر یہیں جا کے ٹھہرنا چاہیئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں دندناتی اندر چلی گئی۔ یہاں ایک مولوی صاحب سے سامنا ہوا۔ کالے سے تھے۔ سر منڈا ہوا تھا۔ ایک نیلی تہمد باندھے ہوئے دھوپ میں ٹہل رہے تھے۔ پہلے تو سمجھے میں طاق بھرنے آئی ہوں، بہت ہی خوش ہوئے جب میں جا کے چبوترے کے کنارے پاؤں لٹکا کے بیٹھ گئی تو قریب آ کے پوچھنے لگے "کیوں بی صاحب! آپ کا یہاں کیا کام ہے؟"

میں: "مسافر ہوں۔ خدا کا گھر سمجھ کے تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ گئی ہوں اگر آپ کو ناگوار ہو تو ابھی چلی جاؤں۔"

مولوی صاحب اگرچہ بہت ہی بے تکے تھے مگر میری لگاوٹ اور دلفریب تقریر نے جادو کا اثر کیا۔ بھلا جواب کیا منہ سے نکلتا۔ ہکا بکا ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ میں سمجھ گئی کہ دام فریب میں آ گئے۔

مولوی۔ (تھوڑی دیر بعد بہت سنبھل کے) اچھا تو آپ کا کہاں سے آنا ہوا؟"

میں: "جی کہیں سے آنا ہوا مگر بالفعل تو یہیں ٹھہرنے کا ارادہ ہے۔"

مولوی۔ (بہت ہی گھبرا کے) "مسجد میں؟"

میں۔ (جی نہیں بلکہ آپ کے حجرے میں۔"

مولوی: "لاحول ولا قوۃ۔"

میں: "اوئی۔ مولوی صاحب! مجھے تو آپ کے سوا اور کوئی نظر نہیں آتا۔"

مولوی: "جی ہاں۔ تو میں اکیلا رہتا ہوں۔ اسی سے تو میں نے کہا مسجد میں آپ کا کیا کام ہے؟"

میں: "یہ کیا . . . خاصیت ہے کہ جہاں آپ رہیں وہاں دوسرا نہیں رہ سکتا؟ مسجد میں ہمارا کچھ کام نہیں۔ یہ خوب کہی۔ آپ کا کیا کام ہے؟"

مولوی: "دریں تو رٹ کے پڑھاتا ہوں۔"

میں: "میں آپ کو سبق دوں گی۔"

مولوی: "لاحول ولاقوۃ۔"

میں: "لاحول ولاقوہ۔ یہ آپ ہر دفعہ لاحول کیوں پڑھتے ہیں۔ یہ کیا شیطان آپ کے پیچھے پھرتا ہے؟"

مولوی: "شیطان آدمی کا دشمن ہے اس سے ہر وقت ڈرنا چاہیئے۔"

میں: "خدا سے ڈرنا چاہیے موئے شیطان سے کیا ڈرنا۔ اور یہ کیا آپ نے کہا آدمی ہیں؟"

مولوی: "(ذرا بگڑ کے) جی ہاں اور کون ہوں؟"

میں: "مجھے تو آپ جن معلوم ہوتے ہیں۔ اکیلے اس مسجد میں رہتے ہیں۔ آپ کا دل بھی نہیں گھبراتا ہے۔"

مولوی: "پھر کیا کریں۔ ہمیں تو اکیلے کی عادت ہے۔"

میں: "اسی سے تو آپ کے چہرے پر وحشت برستی ہے وہ آپ نے نہیں سنا؟"

ع تنہا منشیں کہ ہم دیوانگی است

مولوی: "اجی وہ کچھ ہی جس حال میں ہم ہیں خوش ہیں۔ آپ اپنا مطلب کہیئے۔"

میں: "مطلب تو کتاب دیکھنے سے حل ہوگا یا نفعل زبانی مباحثہ ہے۔"

مولوی: "چہ خوش۔"

میں: "چہ انتہ باشد۔"

میں مولوی صاحب کو خوب جھنجھوڑیاں دیتی مگر اس وقت بھوک کے مارے منھ سے بات نہیں نکلتی تھی۔

رسوا: "مولوی صاحب سے اس قدر مذاق کی کیا ضرورت تھی؟"

امراؤ: "ایسے ہے۔ اس کا حال نہ پوچھو بعض آدمیوں کی صورت ہی ایسی ہوتی ہے کہ خواہ مخواہ چھیڑنے کو جی چاہتا ہے۔"

رسوا: "جی ہاں جیسے کسی کی منڈی ہوئی کھوپڑی دیکھ کر بعض آدمیوں کی ہتھیلی کھجلاتی ہے۔ چپت لگانے کو جی چاہتا ہے۔"

امراؤ: "بس یہی سمجھ لیجئے۔"

رسوا: "اچھا تو وہ مولوی صاحب میں ایسی کون سی بات تھی جس سے مذاق کرنے کو جی چاہتا تھا؟"

امراؤ: "کیا کہوں کچھ بیان نہیں ہو سکتا۔ جوان آدمی تھے۔ صورت بھی کچھ ایسی بری نہ تھی۔ سانولی رنگت تھی۔ چہرے پر حمق پن تھا۔ سر پر لمبے لمبے بال تھے منہ پر داڑھی تھی مگر کچھ بہت نکلے پن کی حد سے بھی زیادہ بڑھی ہوئی۔ مونچھوں کا بالکل صفایا تھا۔ تہمت بہت اونچی بندھی ہوئی تھی۔ سر پر چھینٹ کی بڑی سی ٹوپی تھی جو سر کی پوری چندیا کو ڈھانکے ہوئے تھی۔ بات کرنے کا عجیب انداز تھا۔ منہ جلدی سے کھلتا تھا پھر بند ہو جاتا تھا۔ نیچے کا ہونٹ کچھ عجیب انداز سے اوپر کو چڑھ جاتا تھا اور اس کے ساتھ ہی نکدار داڑھی کچھ عجیب انداز سے ہل جاتی تھی۔ اس کے بعد ناک سے کچھ ہونہ سا نکلتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ کھا رہے ہیں اور باتیں بھی کرتے جاتے ہیں احتیاطاً منہ جلدی سے بند کر لیتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کچھ نکل پڑے۔"

رسوا: "کیا واقعی کچھ کھا رہے تھے؟"

امراؤ: "جی نہیں جگالی کر رہے تھے۔"

رسوا: "اکثر کٹ ملا کچھ ایسی ہی صورت بنا لیتے ہیں۔ جسے دیکھ کے بیوقوفوں کو ڈر لگتا ہے اور عقلمندوں کو ہنسی آتی ہے۔ مجھے ایسی صورتیں دیکھنے کا بہت شوق ہے۔"

امراؤ: "اور سنیئے۔ آپ کی گفتگو میں ایک وصف اور بھی تھا وہ یہ کہ اکثر منہ پھیر لیا کرتے کرتے تھے۔"

رسوا: "تو یہ عین تمیزداری ہے اس لئے کہ عندالتقریر آپ کے منہ سے تھوک اڑتا ہوگا۔"

امراؤ: "کچھ اور بھی عرض کروں؟"

رسوا: "بس اب معاف کیجئے یہاں تو صبح ہو گئی۔"

امراؤ: "القصہ میں نے جیب سے ایک روپیہ نکالا۔"

مولوی: "یہ سمجھ کے کہ مجھے نذر دیا جاتا ہے۔ جلدی سے ہاتھ تو بڑھا دیا اور منہ سے، اس کی کیا ضرورت تھی؟"

میں: "(مسکرا کے) اس کی اشد ضرورت تھی اس لئے کہ مجھے بھوک لگی ہے کچھ کھانے کو تو منگا دیجئے۔"

مولوی۔ (اب جھینپے تو یوں باتیں بنانے لگے) میں سمجھا (میں نے دل میں کہا سمجھے کیا خاک۔ سمجھتے تو بہتر کے ہو جاتے) اسی سے تو کہتا ہوں اس کی کیا ضرورت تھی۔ کیا کھانا یہاں ممکن نہیں ہے؟"

میں "امکان بالقوۃ یا بالفعل، بالذات یا بالغیر؟"

مولوی "بالفعل تو ممکن نہیں میرا ایک شاگرد کھانا لاتا ہوگا۔ آپ بھی کھا لیجئے گا۔"

میں "بالفعل تو ممکن نہیں بالذات کی آپ کو توفیق نہیں اور یہاں ضرورت نے اکل میت کو جواز کا حکم دے دیا ہے۔ لہذا بازار سے کچھ لا دیجئے۔"

مولوی "اک ذرا صبر کیجئے کھانا آتا ہی ہوگا۔"

میں "اب صبر کرنا تکلیف مالایطاق ہے اور دوسرے میں نے باتحقیق سنا ہے کہ رمضان شریف صاحب ایک مہینے تمام دنیا میں سیر کرتے ہیں اور گیارہ مہینے اسی مسجد میں معتکف رہتے ہیں۔"

مولوی "اس وقت تو فی نفس الامر کچھ نہیں ہے مگر میرا ایک شاگرد کھانا لے کے آتا ہوگا۔"

میں "اور بفرض و التسلیم لو کان محالاً اگر کھانا آیا بھی تو وہ آپ کی قوت لایموت کے لئے بھی کافی نہ ہوگا۔ میری شرکت اس میں یعنی چہ اور من وجہ کفالت بھی کرے تو الانتظار اشد من الموت کا مصداق ہے۔ تا تریاق از عراق آوردہ شود۔۔۔۔"

مولوی (دق آ کر) "آپ تو بہت قابل معلوم ہوتی ہیں۔"

میں "مگر میرے زعم ناقص میں آپ کسی قابل نہیں۔"

مولوی "واقعی ایسا ہی ہے مگر۔۔۔۔"

میں "(بات کاٹ کر) اگر اس لئے کہ یہاں تو آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں اور آپ لاطائل تقریریں کر رہے ہیں۔"

مولوی "اچھا تو میں ابھی لایا۔"

میں "للہ۔ ذرا جلدی جائیے۔"

خدا خدا کر کے مولوی صاحب گئے اور کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد چار خمیری روٹیاں اور ایک مٹی کے پیالے میں تھوڑا سا نیلا شوربا لا کے میرے سامنے رکھ دیا دیکھ کے جان جل گئی۔ مولوی صاحب کی صورت دیکھنے لگی۔ مولوی صاحب اپنے دل

میں کچھ اور ہی سمجھے"

مولوی۔ "دفعۃً ساڑھے چودہ گنڈے پیسے اور کوئی دھیلے کی کوڑیاں چادر کے کونے سے کھول کے سامنے رکھ دیے) لیجئے صاحب چار پیسے کی روٹیاں ہیں پیسے کا سالن ہے۔ دھیلا بچا پانچ (روپیہ کا خوردہ) میں آگیا۔ آپ کی جمع آپ کے سامنے موجود ہے۔ پہلے گن لیجئے تو کھا لیجئے گا۔

میں نے پھر ایک دفعہ مولوی صاحب کی صورت دیکھی۔ مگر بھوک بڑی بلا ہے جلدی جلدی نوالے اٹھانے شروع کئے۔ جب دو چار نوالے کھا چکی تو مولوی کی طرف مخاطب ہوئی۔

میں۔ "میں نے کہا مولوی صاحب! کیا اس اُجڑے شہر میں یہی کھانے کو ملتا ہے؟"

مولوی: "تو کیا یہاں لکھنؤ کی طرح محمود کی دوکان ہے۔ جہاں پلاؤ زردہ آٹھ پہر تیار رہتا ہے"

میں: "حلوائی کی دوکان تو ہوگی؟"

مولوی: "حلوائی کی دکان؟ یہ تو مسجد کے نیچے ہے"

میں: "تو پھر چار کوس جانا کیا ضرور تھا۔ دوپہر کے بعد آئے اور لے کے کیا آئے سوکھے ٹکڑوں کا راتب"

مولوی: "ایسا تو نہ کہیئے آدمی کھاتے ہیں"

میں: "آپ ایسے آدمی کھاتے ہوں گے۔ باسی خمیری روٹیاں اور نیلا شوربا"

مولوی: "نیلا تو نہیں ہے ـــــ اچھا دہی لا دوں؟"

میں: "جی نہیں بس رہنے دیجئے۔ معاف کیجئے"

مولوی: "پیسے کا خیال نہ کیجئے میں اپنے پاس سے لائے دیتا ہوں"

میں کچھ جواب بھی نہ دینے پائی تھی کہ مولوی صاحب مسجد کے باہر چلے گئے اور ایک آبخورے میں خدا جانے کب کا سڑا کھٹا دہی اٹھا لائے اور اس طرح سامنے لا کے رکھ دیا گویا آپ نے حاتم کی قبر پر لات مار دی۔

بہر طور میں نے وہ چاروں روٹیاں نگل نگل کے کھائیں اور کوئی بدھنی بھر کے پانی پیا۔ وہ شوربا اور دہی چھوڑ کے یوں ہی اٹھ کھڑی ہوئی پیسے کوڑیاں بھی پڑے رہنے دیئے۔

میں ہاتھ دھونے کو اٹھی تھی۔ مولوی صاحب گئے مسجد سے دالان ملتی ہے۔

مولوی: "اور یہ پیسے اور کوڑیاں تو اٹھا لیجیے۔"

میں: "میری طرف سے مسجد میں چراغی چڑھا دیجیے۔"

منھ ہاتھ دھو کے اپنی جگہ پر آ بیٹھی۔ مولوی صاحب سے باتیں کرنے لگی۔ کانپور میں مولوی صاحب کی ذات سے مجھے بہت آرام ملا۔ انھیں کی معرفت ایک کمرہ کرایہ پر لیا۔ نواڑی پلنگ، دری چاندنی، چھت پردے۔ تانبے کے برتن اور سب ضرورت کا سامان خرید لیا۔ ایک ماما کھانا پکانے کو اور ایک اوپر کے کام کو۔ دو اور خدمت گار نوکر رکھ لئے۔ ٹھاٹھ سے رہنے لگی۔ اب سازندوں کی تلاش ہوئی۔ یوں تو بہت سے آئے مگر کسی کا ہاتھ پسند نہ آیا۔ آخر لکھنؤ کا ایک طبلیہ مل گیا۔ یہ خلیفہ جی کے خاندان کا شاگرد تھا۔ اس سے خوب برکت ملی۔ اسی کی معرفت دو سارنگئے کانپور کے ذرا اچھے دار بلوائے۔ طائفہ درست ہو گیا۔ شب کو پہر ڈیڑھ پہر رات گئے تک کمرہ پر گانے بجانے کا چرچا ہونے لگا۔ شہر میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ لکھنؤ سے کوئی رنڈی آئی ہے۔ اکثر مرد آنے لگے۔ شاعری بھی خوب چمکی۔ کوئی دن ایسا ہی کمبخت ہوگا جو کسی جلسہ میں جانا نہ ہوتا ہو۔ مجرے کثرت سے آتے تھے۔ تھوڑے ہی دنوں میں بہت سا روپیہ کما لیا۔ اگرچہ کانپور کے لوگوں کا راہ رویہ، بول چال پسند نہ تھی۔ بات بات پر لکھنؤ یاد آتا تھا مگر خود مختاری کی زندگی میں کچھ ایسا مزہ ہے کہ واپس جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں جانتی تھی کہ اگر لکھنؤ جاؤں گی تو پھر خانم کی نوچی بن کر رہنا پڑیگا کیونکہ اس پیشہ میں رہ کر خانم سے علیحدہ رہنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ ایک تو اس سبب سے کہ تمام رنڈیاں خانم کا دباؤ مانتی تھیں۔ اگر میں الگ ہو کے رہتی تو کوئی مجھ سے نہ ملتی۔ دوسرے عمدہ سازندوں کا ملنا دشوار تھا۔ ناچ مجرے کا ڈھنگ کیونکہ چل سکتا تھا۔ جن سرکاروں میں میری رسائی ہوئی تھی وہ بھی خانم کی وجہ سے تھی۔ اگرچہ میرا شمار اچھے گانے والیوں میں تھا مگر لکھنؤ میں اس کام کے کرنے والے بہت سے ہیں۔ اچھے برے کا امتیاز خاص لوگوں کو ہوتا ہے۔ عام لوگوں میں نام بکتا ہے۔ بڑے آدمیوں کی نگاہ اکثر اوپری کمروں پر جاتی ہے۔ اس حالت میں مجھے کون پوچھتا۔ کانپور میں میرے حوصلہ سے زیادہ میری قدردانی ہوتی تھی۔ کسی امیر رئیس کے یہاں کوئی تقریب شادی بیاہ کی نہ ہوتی تھی جس میں میرا بلانا باعث فخر نہ سمجھا جاتا ہو۔ باہر جا کر اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ

لکھنؤ کیا چیز ہے۔ یہاں ایک صاحب حضرت شارق لکھنوی بہت مشہور ہیں۔ استاد مسلم الثبوت سمجھے جاتے ہیں۔ سیکڑوں آپ کے شاگرد ہیں۔ لکھنؤ میں کوئی ان کا نام بھی نہ جانتا تھا۔ ایک دن کا تذکرہ سنیے۔ ایک صاحب میرے کمرے پر تشریف لائے۔ اثنائے گفتگو میں شعر و شاعری کا کچھ چرچا نکلا۔ پوچھتے پوچھتے انھوں نے پوچھا "آپ حضرت شارق لکھنوی کو جانتی ہیں؟" میں نے کہا "نہیں کون شارق؟" یہ صاحب ان کے شاگردوں میں تھے فوراً بگڑ گئے۔

وہ صاحب "میں تو سنتا تھا آپ لکھنؤ کی رہنے والی ہیں۔"

میں۔ "جی ہاں، غریب خانہ تو لکھنؤ ہی میں ہے۔"

وہ صاحب "بھلا کہیں ہو سکتا ہے کہ آپ لکھنؤ میں رہیں اور حضرت استاد کو نہ جانیں!"

میں "لکھنؤ کے مشہور شاعروں میں کون ایسا ہے جس کو میں نہ جانتی ہوں۔ استادوں کا تو ذکر ہی کیا ہے ان کے نام پر آور دہ شاگردوں میں سے بھی شاید کوئی ایسا ہوگا جس کا کلام میں نے نہ سنا ہو۔ ان کے نام نامی سے تو مطلع فرمائیے یہ تخلص تو میں نے کبھی نہیں سنا۔"

وہ صاحب۔ "جیسے یہ جانتی ہو گی نام لینے سے کیا فائدہ۔ تخلص شرق سے غرب اور شمال سے جنوب تک زبان زد خلائق ہے۔ ہاں ہوں۔ آپ نہیں جانتیں نہ جانیں۔"

میں "حضور معاف کیجئے گا میرے نزدیک تو یہ شاعرانہ تعلّی ہے۔ مگر آپ کے استاد ہیں آپ کو ایسا ہی کہنا چاہیے۔ اچھا نو نام نامی سے تو مطلع فرمائیے۔ ممکن ہے کہ میں نے تخلص نہ سنا ہو، نام سے واقف ہوں۔"

وہ صاحب "میر ہاشم علی صاحب شارق۔"

میں "اس نام سے تو بے شک کان آشنا ہیں۔" اتنا کہہ کے اب میں فکر کرنے لگی یا الٰہی! یہ کون میر ہاشم علی صاحب ہیں۔ آخر ایک صاحب پر اشتباہ ہوا۔ "آپ کے استاد مرثیہ خوانی بھی تو کرتے ہیں؟"

وہ صاحب "جی ہاں! مرثیہ خوانی میں بھی اُن کا مثل و نظیر نہیں۔"

میں "بجا ارشاد ہوا یعنی میر صاحب اور مرزا صاحب سے بھی بڑھے ہوئے ہیں؟"

وہ صاحب: "انھیں صاحبوں کے ہمعصر ہیں۔"

میں: "بھلا کس کا مرثیہ پڑھتے ہیں؟"

وہ صاحب: "کسی کا مرثیہ کیوں پڑھنے لگے۔ خود تصنیف فرماتے ہیں۔ ابھی ستائیسویں رجب کو نیا مرثیہ پڑھا تھا، عام شہرہ تھا۔"

میں: "تو آپ کو یاد ہوگا؟"

وہ صاحب: "مطلع تو نہیں، تلوار کی تعریف میں ایک بند پڑھا تھا۔ وہ مجھے کیا تمام شہر کی زبان زد ہے۔ قلم توڑ دیا ہے۔"

میں: "ذرا ارشاد کیجئے گا میں بھی مستفید ہوں۔"

وہ صاحب: "نکلی غلاف نور سے تفسیر جوہری۔"

میں: "سبحان اللہ اس بند کے تو دور دور شہرے ہیں۔ پانچ مصرعے مجھ سے سن لیجئے کیا کلام ہے۔"

وہ صاحب: "(بہت ہی خوش ہو کے) جی ہاں! آپ نے یہ مرثیہ لکھنؤ میں سنا ہوگا۔ وہی تو میں کہتا تھا کہ لکھنؤ کی رہنے والی اور پھر شعر و سخن کا شوق۔ حضرت شارق کو نہ جانتی ہوں۔ تعجب ہے۔ اچھا اب میں سمجھا یہ مذاق تھا۔"

میرے جی میں تو آیا کہہ دوں کہ آپ کے استاد مر کے بھی جیئں گے تو ایسا بند نہیں کہہ سکتے مرزا دبیر صاحب (مرحوم) کا کلام ہے۔ مگر پھر کچھ سمجھ کے چپ ہو رہی۔

رسوا: "واقعی آپ نے بڑی عقلمندی کی ورنہ بیچارے کی روزی میں خلل آتا۔ میر ہاشم علی صاحب شارق پر کیا موقوف ہے۔ اکثر صاحبان کا یہی شعار ہے۔ دوسروں کا کلام باہر جا کے اپنے نام سے پڑھتے ہیں۔ چند ہی روز کا ذکر ہے ایک صاحب میرے ایک دوست کی غزلوں کے مسودے چرا لے گئے۔ حیدرآباد دکن میں سناتے پھرے۔ بڑے بڑے لوگوں سے داد لی۔ مگر سمجھنے والے سمجھ ہی گئے۔ لکھنؤ میں خطوط آئے۔ اصل مصنف سے تذکرہ ہوا وہ ہنس کر چپ ہو رہے۔ اکثر صاحبوں نے لکھنؤ کو ایسا بدنام کیا ہے کہ اب لفظ لکھنوی اپنے نام یا تخلص کے ساتھ لکھتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ایسے ایسے بزرگ لکھنوی لکھتے ہیں جن کی ہفتاد پشت دیہات میں گذر گئی۔ خود لکھنؤ میں چند روز طالب علمی یا اور کسی سلسلے سے آ کے رہے۔ چلئے اچھے خاصے لکھنوی بن گئے۔ اگرچہ یہ کچھ ایسی فخر کی بات نہیں مگر جھوٹ

سے کیا فائدہ؟"

امراؤ: "جی ہاں۔ اکثر صاحب اسی طرح لکھنؤ فروشی کر کے اپنا بھلا کرتے ہیں کانپور میں میرا بھی ٹھیک یہی حال تھا۔"

اُس زمانے میں ریل تو تھی نہیں اور نہ لکھنؤ سے کوئی باہر جاتا تھا بلکہ ہر شہر کے کاملین تلاش معیشت میں یہیں آتے تھے۔ اپنے کمال کی حسب حیثیت داد پاتے تھے۔ دہلی اُجڑ کے لکھنؤ آباد ہوا تھا۔

رسوا: "فی زمانہ یہی حال دکن کا ہے لکھنؤ اجڑ کے دکن آباد ہوا۔ میں تو گیا نہیں مگر سُنا ہے کہ محلّے کے محلّے لکھنؤ والوں سے آباد ہیں۔"

امراؤ: "جو صاحب لکھنوی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اُن سے کہئے پہلے اپنی زبان کی لوچ نکالیں۔"

رسوا: "کیا خوب بات کہی ہے۔ واقعی روزمرہ تو کسی قدر آ بھی جاتا ہے مگر لہجہ نہیں آتا۔"

اتفاقات زمانہ سے یہ کچھ دور نہیں
یوں بھی ہوتا ہے کہ بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں

بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں اور پھر کب کے بچھڑے ہوئے۔ وہ جن کے ملنے کا سان گمان بھی نہ ہو۔ ایک دن کا واقعہ سنیے کانپور میں رہتے ہوئے کوئی چھ مہینے گزر گئے ہیں۔ اب شہرت کی یہ حد پہنچی ہے کہ بازاروں اور گلیوں میں میری گائی ہوئی غزلیں لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ شام تو میرے کمرے میں بہت اچھا مجمع رہتا ہے گرمیوں کا دن ہے۔ کوئی دو بجے کا وقت ہوگا میں اپنے پلنگ پر اکیلی لیٹی ہوں ماما باورچی خانے میں خراٹے لے رہی ہے ایک خدمتگار کمرے کے باہر بیٹھا پنکھے کی ڈوری کھینچ رہا ہے خس کی ٹٹیاں خشک ہو گئی ہیں۔ میں آدمی کو آواز دیا ہی چاہتی تھی کہ پانی چھڑک دے کہ اتنے میں کمرے کے نیچے کسی نے آ کر پوچھا: "لکھنؤ سے جو رنڈی آئی ہے اس کا کمرہ یہی ہے؟" درگا بنیا (جس کی دوکان نیچے تھی) نے جواب دیا "ہاں یہی ہے۔" پھر دریافت کیا "دروازہ کہاں ہے؟" اس نے بتا دیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک

بڑی بی کوئی ستر برس کا سن گزرا ہوگا۔ منہ پر جھریاں پڑی ہوئیں بال جیسے روئی کا گالا۔ کمر جھکی ہوئی سفید ململ کا دوپٹہ تنزیب کا کرتہ نینن سکھ کا پائجامہ بڑے بڑے پائچوں کا پہنے ہاتھوں میں چاندی کے موٹے موٹے کڑے انگلیوں میں انگوٹھیاں۔ ہاتھ میں۔ ہاتھی دانت کی بنی ہوئی آئیں اور سامنے فرش پر بیٹھ گئیں ایک کالا سا لڑکا کوئی دس بارہ برس کا ان کے ساتھ تھا وہ کھڑا رہا۔

بڑی بی: "لکھنؤ سے تمہیں آئی ہو؟"

میں: "جی ہاں۔"

اتنا کہہ کے میں پلنگ کے پیچھے اتر آئی پاندان آگے کھسکایا۔ آدمی کو حقے کے لئے آواز دی۔

بڑی بی: "ہماری بیگم نے تمہیں یاد کیا ہے۔ لڑکے کی سالگرہ ہے زنانہ جلسہ ہوگا تمہارا مجرا کیا ہے؟"

میں: "بیگم صاحبہ مجھ کو کیا جانیں؟"

بڑی بی: "اے تمام شہر میں تمہارے گانے کی دھوم ہے۔ دوسرے تمہارے بلانے کا یہ بھی ایک سبب ہے کہ بیگم صاحبہ خود بھی لکھنؤ کی رہنے والی ہیں۔"

میں: "اور آپ بھی تو لکھنؤ کی ہیں؟"

بڑی بی: "تم نے کیونکر جانا؟"

میں: "کہیں بات چیت کا قرینہ چھپا رہتا ہے؟"

بڑی بی: "ہاں میں بھی وہیں کی رہنے والی ہوں۔ اچھا تو اپنا مجرا تو بتاؤ ابھی بہت کام پڑا ہے۔ مجھے دیر ہوتی ہے۔"

میں: "مجرا تو میرا کھلا ہوا ہے سب جانتے ہیں پچاس روپیہ لیتی ہوں۔ مگر بیگم صاحبہ لکھنؤ کی رہنے والی ہیں اور انھوں نے قدر کرکے بلایا ہے تو اُن سے کچھ نہ لوں گی۔ جلسہ کب ہے؟"

بڑی بی: "آج شام کو۔ اچھا تو یہ روپیہ کچوڑی کا تو لو باقی وہاں آکے سمجھ لینا۔"

میں: (روپیہ لے لیا) اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مگر اس خیال سے کہ بیگم صاحب برا نہ مانیں روپیہ لئے لیتی ہوں۔ اچھا اب یہ کہئے کہ مکان کہاں ہے؟

بڑی بی: "مکان تو ذرا دور ہے۔ نواب گنج میں ہے۔ یہ لڑکا شام کو آئے گا

اسی کے ساتھ چلی آنا۔ مگر اتنا خیال رہے کہ کوئی مرد ذات تمہارے ملنے والوں میں سے تمہارے ساتھ نہ ہو۔

میں: "اور سازندے؟"

بڑی بی: "سازندے، خدمتگار۔ ان کی مناہی نہیں ہے کوئی اور نہ ہو۔"

میں: "جی نہیں۔ یہاں میرا کون ایسا ملاقاتی ہے جسے ساتھ لاؤں گی۔ خاطر جمع رکھئے۔"

اتنے میں خدمتگار نے حقہ تیار کیا۔ میں نے اشارہ کیا بڑی بی کے سامنے لگا دو۔ بڑی بی مزے سے لے کے حقہ پینے لگیں۔ میں ایک پان پر کتھا چونا لگا کے ذیدوں کا چورا ڈبیہ میں پڑا ہوا تھا ایک چٹکی اس کی اور الائچی کے دانے پاندان سے ڈھونڈ کے پر کچل کے گلوری بنا کے بڑی بی کو دینے لگی۔

بڑی بی: "ہائے بیٹا! دانت کہاں سے لاؤں جو پان کھاؤں۔"

میں: "آپ کھائیے تو۔ میں نے آپ ہی کے لائق پان بنایا ہے۔"

بڑی بی بیٹھ گئیں پان لے کے کھایا۔ بہت ہی خوش ہوئیں۔ ہائے ہمارے شہر کی تمیز داری۔ اتنا کہہ کے دعائیں دیتی ہوئی رخصت ہوئیں۔ چلتے چلتے کہہ گئیں "ذرا دن سے آجانا۔ گھڑی بھر دن رہے گرہ لگائی جائے گی۔"

میں: "اگرچہ مجرے کا دستور نہیں ہے مگر خیر بیگم صاحب نے یاد کیا ہے، تو میں سویرے سے حاضر ہو کر مبارکباد گاؤں گی۔"

واقعی وطن کی قدر باہر جا کے ہوتی ہے۔ کانپور میں سیکڑوں جگہ مجرے ہوئے مگر کہیں جانے کا ایسا اشتیاق ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ جلدی سے شام ہو جائے اور میں روانہ ہوں۔ گرمیوں کا دن پہاڑ ہوتا ہے۔ خدا خدا کر کے اتنا دن کٹا۔ پانچ بجتے بجتے رتھ آموجود ہوا۔ میں پہلے ہی سے بنی ٹھنی بیٹھی تھی۔ سازندوں کو بلوا رکھا تھا۔ لڑکے نے ان کے مکان کا پتہ بتا دیا۔ میں سوار ہو کے روانہ ہو گئی۔

بیگم کا مکان شہر سے کوئی گھنٹہ بھر کا راستہ تھا۔ ۶ بجے میں وہاں پہنچی۔ نہر کے کنارے ایک باغ تھا جس کے چاروں طرف مینڈ پر ناگ پھنی اور دوسرے خاردار درخت اس طرح برابر بٹھائے گئے تھے جس سے ایک دیوار سی بن گئی تھی۔ باغ کی قطع بالکل انگریزی تھی۔ تاڑ، کھجور اور طرح طرح کے خوبصورت درخت قرینے سے لگائے گئے تھے۔ روشوں پر سرخی کٹی ہوئی تھی۔ چاروں طرف سبزہ تھا۔ جا بجا

کنگروں کی پہاڑیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ ان پر انواع و اقسام کے پہاڑی درخت پتھروں کے اندر سے اُگے معلوم ہوتے تھے۔ پہاڑیوں کے گرد اگرد دوب جمائی گئی تھی۔ باغ میں ہر چہار طرف پکے بنے ہوئے تھے ان میں صاف سوتی سا پانی بہہ رہا تھا۔ مالی نلوں اور فواروں کے ذریعے سے پانی دے رہے تھے پتیوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ دن بھر کی دھوپ کھائے ہوئے پھولوں میں جواب پانی پہنچا تھا کیسے تر و تازہ اور شاداب تھے۔

سالگرہ کی رسم کوٹھی میں ادا ہوئی تھی۔ عورتوں کے گانے کی آواز آئی۔ باہر میں نے مبارکباد گائی۔ پھر آپ ہی آپ شیام کلیان کی ایک چیز شروع کر دی۔ کوئی سننے والا نہ تھا۔ آپ ہی آپ گایا کی پھر چپ ہو رہی۔ بیگم صاحب نے ایک اشرفی اور پانچ روپئے انعام کے بھیجے۔ تھوڑی دیر میں شام ہو گئی۔ چاند نکل آیا۔ چاندنی پھیل گئی۔ تالاب کے پانی میں ماہتاب کا عکس موجوں سے مل کر عجب کیفیت دکھا رہا تھا۔

باغ کے کنارے پر ایک بہت عالیشان کوٹھی تھی وسط باغ میں ایک پختہ تالاب بنا ہوا تھا۔ اس کے گرد ولایتی پھولوں کے نا ندے نہایت خوبصورتی سے سجے ہوئے تھے۔ اسی تالاب سے ملا ہوا ایک اونچا چبوترہ تھا اس کے درمیان ایک مختصر سا ہوادار چوبی بنگلہ تھا اس کے ستونوں پر رنگ آمیزی کی ہوئی تھی۔ اس تالاب میں نہر سے پانی گرتا تھا۔ پانی کے گرنے کی آواز سے دل میں ٹھنڈک پہنچتی تھی واقعی عجیب عالم تھا۔ شام کا سہانا وقت۔ ستھری ہوا رنگ رنگ کے پھولوں میں مہک۔ ایسی فضا میں نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ چبوترے پر سفید چاندنی کا فرش تھا مسند تکیہ لگا ہوا تھا۔ اسی کے سامنے ہم لوگ بٹھائے گئے۔ کوٹھی سے لے کر اس چبوترے تک گلاب کی بیلوں سے ایک چھتا سا بنا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ اسی کی راہ سے بیگم صاحبہ تشریف لاتی ہیں۔ سامنے طلئیں پڑی ہوئی تھیں۔ چبوترے پر سبز مرد نگیں روشن ہو گئیں۔ مجھے گانے کا حکم ہوا۔ میں نے کدارے کی ایک چیز شروع کر دی بڑی دیر تک گایا کی۔ اتنے میں ایک مہری ہاتھوں میں دو سبز کنول لئے ہوئے باہر نکلی مسند کے سامنے رکھ دیئے۔ سازندوں سے کہا تم لوگ وہ سامنے شاگرد پیشہ میں چلے جاؤ۔ کھانا بھیجد یا جائے گا۔ اب یہاں زنانہ ہوگا۔ جب وہ لوگ اٹھ گئے بیگم صاحب

برآمد ہوئیں۔ میں تعظیم کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ انھوں نے مجھ کو قریب بلایا۔ خود مسند پر بیٹھ گئیں۔ مجھے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں تسلیم کر کے بیٹھ گئی گانے کے لئے حکم کی منتظر تھی اور بیگم کی صورت غور سے دیکھ رہی تھی ؎

صورت وہ روبرو ہے کہ دیکھا کرے کوئی
حیرانی نگاہ تماشہ کرے کوئی

پہلے تو وہ باغ اور وہاں کی فضا دیکھ کے مجھے پرستان کا شبہ ہوا تھا۔ مگر اب یقین ہو گیا کہ پری میرے سامنے گاؤ سے لگی بیٹھی ہے۔ مانگ نکلی ہوئی ہے۔ چوٹی کمر تک پڑی ہوئی۔ سرخ و سفید رنگت او نچا ماتھا۔ کھنچی ہوئی بھویں بڑی بڑی آنکھیں جیسے گلاب کی پتیاں پھوئی ناک۔ چھوٹا سا دہانہ پتلے پتلے نازک ہونٹھ۔ نقشے بھر میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے بہتر میرے خیال میں کوئی چیز آ سکتی ہو۔ اس پر اعضا کا تناسب اور ابھار پن کس قدر خوشنما تھا۔ سیکڑوں عورتیں میری نظر سے گزر گئیں مگر میں نے اس بلا کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ خورشید سے بہت جھلک ملتی تھی۔ مگر کہاں۔ خورشید کہاں وہ۔ خورشید کی صورت میں پھر ڈومنی پنا تھا۔ اس میں یہ امیرانہ رعب یہ تمکنت یہ بھاری بھرکم پن کہاں دوسرے خورشید ان کے سامنے کسی قدر بھدی معلوم ہوتی تھی۔ ان کا کامنی سا نازک نازک چھریرا بدن اس نے کہاں پایا۔ دوسرے اس کی صورت پر آٹھ پہر اداسی برستی تھی جب دیکھو بروگن بنی تھی۔ بیگم صاحبہ بہت ہی خوش مزاج معلوم ہوتی ہیں۔ بات کرتی ہیں گویا منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ ہر بات پر خود بخود ہنسے دیتی ہیں۔ مگر کسی کو مجال کلام نہیں واقعی سادگی میں تکلف اور تمکنت کے ساتھ شوخی انھیں میں دیکھی۔ دولتمندوں کی خوشامد سب کرتے ہیں مگر میں عورت ذات ہو کے کہتی ہوں کہ رئیسوں کی خوشامد بھی اگر بے غرض کی جائے تو کوئی عیب نہیں۔ لباس اور زیور بھی اسی صورت کے لائق تھا۔ مہین لبنتی دوپٹہ کندھوں سے ڈھلکا ہوا ایجلی کا شلوکہ پھنسا پھنسا۔ سرخ گرنٹ کا پائجامہ۔ کانوں میں صرف یاقوت کے آویزے۔ ناک میں ہیرے کی کیل۔ گلے میں سونے کا سادہ طوق۔ ہاتھ میں سونے کے کنگنیں۔ بازوؤں پر نورتن۔ پاؤں میں سونے کی بیڑیاں۔ چہرے کی خوبصورتی لباس کی سادگی اور زیور کی مناسبت یہ سب چیزیں میری آنکھوں کے سامنے تھیں اور میں نقش حیرت بنی بیٹھی تھی۔ بغور صورت دیکھ رہی تھی اور میری صورت تو جیسی کچھ ہے وہ اس وقت آپ کے سامنے ہے۔ مگر یقین ہی کیجئے گا۔ ان کی توجہ بھی کسی اور طرف نہ تھی مجھی کو دیکھ رہی تھیں دونوں طرف سے نگاہیں لڑی ہوئی تھیں۔ میرے دل میں بار بار

ایک خیال آتا تھا مگر اس کے اظہار کا موقع نہ تھا کہوں تو کیونکر کہوں۔ ایک پھری پس پشت کھڑی پنکھا جھل رہی تھی دو سامنے کھڑی تھیں۔ ایک کے ہاتھ میں چاندی کی لوٹیا دوسرے کے پاس خاصدان بڑی دیر تک نہ بیگم صاحبہ نے مجھ سے بات چیت کی اور نہ میں کچھ بول سکی۔ آخر انھوں نے سلسلۂ کلام اِس طرح سے شروع کیا۔

بیگم۔ ''تمھارا کیا نام ہے؟''

میں۔ ''(ہاتھ باندھ کے) امراؤ جان''

بیگم۔ ''خاص لکھنؤ میں مکان ہے؟''

(یہ سوال کچھ اس رخ سے کیا گیا تھا کہ مجھے جواب دینا مشکل ہوا۔ خصوصاً اس موقع پر اس لئے کہ اگر کہتی ہوں کہ لکھنؤ میں میرا مکان ہے تو ایک مطلب جو میرے دل میں تھا فوت ہوا جاتا ہے۔ فیض آباد بتاتی ہوں تو بے محل افشائے راز کا خیال ہے آخر بہت سوچ سمجھ کے)۔

میں۔ ''جی ہاں پرورش تو لکھنؤ میں پائی ہے''۔

جواب دینے کو تو دے دیا مگر اس کے ساتھ ہی خیال ہوا کہ اب جو سوال کیا جائیگا تو پھر وہی دقت پیش آئیگی۔ میرا خیال غلط نہ تھا اس لئے کہ فوراً بیگم صاحبہ نے پوچھا۔

بیگم۔ ''تو کیا پیدائش لکھنؤ کی نہیں ہے؟''

اب حیران ہوں کہ کیا جواب دوں۔ تھوڑی دیر سکوت کیا جیسے کچھ سنا ہی نہ تھا آخر اس بات کو ٹال کے۔

میں۔ ''حضور کا دولتخانہ لکھنؤ میں ہے؟''

بیگم۔ ''کبھی لکھنؤ میں تھا۔ اب تو کانپور وطن ہو گیا''۔

میں۔ ''میرا بھی یہی ارادہ ہے''۔

بیگم۔ ''یہ کیوں؟''

میں۔ (اس سوال کا جواب دینا بھی دشوار تھا کون قصہ بیان کرتا) اب کیا عرض کروں بیکار سمع خراشی ہوگی۔ حال ناگفتہ بہ ہے کچھ ایسے ہی اتفاقات پیش آئے کہ لکھنؤ جانے کو جی نہیں چاہتا۔

بیگم۔ ''چلو اچھا ہے تو ہمارے پاس کبھی کبھی چلی آیا کرو''۔

میں۔ آتا کیا۔ میرا تو ابھی سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔ اول تو آپ کی قدردانی دوسرے

یہ بات نہ یہ فضا ممکن ہے کہ کوئی ایک بار دیکھے اور دوبارہ دیکھنے کی ہوس نہ ہو خصوصاً ایسی خفقانی مزاج کی عورت کے لئے تو یہاں کی آب و ہوا اکسیر کا خواص رکھتی ہے۔"

بیگم: "اے ہے تمہیں یہ جنگل بہت پسند آیا۔ نہ آدمی نہ آدم ذات بہات خدا کی ذات شہر سے کوسوں دور چار پیسوں کا سودا منگاؤ تو آدمی صبح کا گیا ہوا شام کو آتا ہے چھائیں پھوئیں شیطان کے کان بہرے۔ کوئی بیمار ہو تو جب تک حکیم شہر سے آئیں آئیں یہاں آدمی کا کام تمام ہو جائے۔"

میں: "حضور اپنی اپنی طبیعت۔ مجھے تو پسند ہے۔ میں تو جانتی ہوں کہ اگر یہاں رہوں تو مجھے یہاں کسی چیز کی ضرورت ہی نہ ہو۔ دوسرے ایسے مقام پر بیمار ہونا کیا ضرور ہے۔"

بیگم: "جب میں پہلے پہل آئی تھی تو میرا بھی یہی خیال تھا۔ کچھ دنوں یہاں رہ کے معلوم ہوا کہ شہر کے رہنے والے ایسے مقام پر نہیں رہ سکتے۔ شہر میں ہزار طرح کا آرام ہے اور سب باتوں کو جانے دو جب سے نواب کلکتہ گئے ہیں راتوں کو ڈر کے مارے نیند نہیں آتی۔ یوں تو خدا کے دیے سپاہی۔ پاسی۔ خدمتگار اس وقت بھی دس بارہ مرد نوکر ہیں عورتوں کی گنتی نہیں مگر پھر بھی ڈر لگتا ہے۔ میں دو چار دن اور راہ دیکھتی ہوں اگر نواب جم جم آئے تو میں شہر میں کوئی مکان لے کے جا رہوں گی۔"

میں: "حضور معاف آپکا مزاج وہمی ہے۔ ایسے ایسے وسواس دل میں نہ لایا کیجئے۔ شہر میں جائیے گا تو قدر عافیت کھلے گی وہ گرمی ہے کہ آدمی پکے جاتے ہیں۔ دوسرے بیماریاں کہ خدا پناہ میں رکھے۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اتنے میں کھلائی بچے کو لے کے آئی۔ تین برس کا لڑکا تھا ماشا اللہ گورا گورا۔ خوبصورت۔ ایسی پیاری پیاری باتیں کرتا تھا جیسے مینا۔ بیگم نے کھلائی سے لے کے گود میں بٹھا لیا۔ تھوڑی دیر کھلا کودا کے پھر کھلائی کو دینے لگیں کہ میں نے ہاتھ بڑھا کر لے لیا۔ بڑی دیر تک لئے رہی اور پیار کیا کی۔ پھر کھلائی کو دیدیا۔

میں: "یوں تو شاید نہ آتی مگر میاں کو دیکھنے تو ضرور ہی آؤں گی۔"

بیگم: "(مسکرا کے) "اچھا کسی طرح ہو آنا ضرور۔"

میں: "ضرور ضرور حاضر ہوں گی۔ یہ آپ بار بار کیوں فرماتی ہیں۔ میں تو اس قدر حاضر ہونگی کہ حضور تو دق ہو جائیں گی۔"

اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ بیگم نے میرے گانے کی بہت تعریف

کی اسی اثنا میں خاصہ والی نے آ کے کہا کہ خاصہ تیار ہے۔ بیگم نے کہا "چلو کھانا تو کھا لو۔"

میں۔ "بہت خوب۔"

بیگم مسند سے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ میں بھی ساتھ ہی اُٹھی۔ میرا ہاتھ پکڑ لیا مہریوں کو اشارہ کیا "تم یہیں ٹھہرو ہم کھانا کھا کے یہیں بیٹھیں گے۔"

میں۔ "واقعی اس وقت کا سماں تو ایسا ہے کہ جانے کو جی نہیں چاہتا مگر حکم حاکم۔"

بیگم۔ "تو کیا کھانا یہیں منگوا لیا جائے؟"

میں۔ "جی نہیں۔ اچھا کھانا کھا کے چلے آئیں گے۔"

بیگم۔ "(ایک مہری سے) ان کے ساتھ کے آدمیوں کو کھانا دلوا دیا گیا؟"

مہری۔ "(ہاتھ باندھ کے) حضور دلوا دیا گیا۔"

بیگم۔ "اچھا انہیں رخصت کرو۔ ہم نے دوسرا مجرا معاف کیا۔ امراؤ جان کھانا کھا کے جاویں گی۔"

اس کے بعد بیگم اور ہم دونوں کوٹھی کی طرف چلے ایک مہری آگے آگے فانوس لئے جاتی تھی چپکے سے میرے کان میں کہا "مجھ کو تم سے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔ مگر آج اس کا موقع نہیں کل تو مجھے فرصت نہ ہوگی۔ پرسوں تم صبح آنا اور کھانا یہیں کھانا۔"

میں۔ "مجھے بھی کچھ عرض کرنا ہے۔"

بیگم۔ "اچھا تو آج کچھ نہ کہو چلو کھانا کھا لیں اس کے بعد تمہارا گانا سنیں گے۔"

میں۔ "پھر سازندوں کو تو حضور نے رخصت کر دیا!"

بیگم۔ "ہم کو مردوں کے ساتھ گانا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ میری ایک خواص خوب طبلہ بجاتی ہے۔ اس پر گانا۔"

میں۔ "بہت خوب۔"

اب ہم کوٹھی کے پاس پہنچ گئے بہت وسیع کوٹھی تھی اور اس طریقے سے سجی ہوئی تھی کہ شاہی کوٹھیوں کے دیکھنے کے بعد اگر کوئی کوٹھی دیکھی تو یہی دیکھی۔ پہلے برآمدہ ملا۔ اس کے بعد کئی کمروں سے ہو کے گزرے ہر ایک نئے طرز سے سجا ہوا تھا ہر کمرہ فرش فروش اور شیشہ آلات ایک سے نئے رنگ اور نئے طرز کا تھا آخر ہم اس کمرے میں پہنچے جہاں دسترخوان چنا ہوا تھا۔ دسترخوان پر دو عورتیں اور بھی منتظر تھیں۔ ان میں سے ایک حبشی نژاد تھی۔ ایک مصاحب۔ ان دونوں کا لباس بھی بہت ہی زرق برق تھا۔ صورتیں بھی اچھی تھیں۔

دسترخوان پر کئی قسم کے کھانے پلاؤ۔ بورانی۔ مزعفر۔ متنجن۔ سفیدہ۔ شیر برنج۔ باقرخانیاں کئی طرح کے سالن، کباب، اچار۔ مربے۔ مٹھائیاں دہی بالائی غرضکہ ہر قسم کی نعمت موجود تھی لکھنؤ سے نکلنے کے بعد آج کھانے کا مزہ آیا بیگم ہر طرح کی چیزیں میرے سامنے رکھتی جاتی تھیں۔ میں اگرچہ کسی قدر تکلف سے کھانا کھاتی تھی مگر ان کے اصرار نے ضرورت سے زیادہ کھلا دیا۔

بیسن دانی اور تسلہ آیا ہاتھ منہ دھو کے سب نے پان کھائے پھر اسی چبوترے پر جلسہ جما۔ اس جلسے میں صرف بیگم صاحبہ نہ تھیں۔ چٹھی نویس۔ مصاحبین۔ مغلانیاں۔ پیش خدمتیں مہریاں۔ مامائیں۔ سب ملا کے کوئی دس بارہ عورتیں تھیں۔

بیگم صاحبہ نے حکم دیا کہ طبلہ کی جوڑی اور ستار اٹھا لاؤ۔ ایک مصاحب جو طبلہ بجانے میں مشاق تھی طبلہ بجانے لگی۔ خود بیگم صاحبہ ستار چھیڑنے لگیں۔ مجھے گانے کا حکم دیا۔

کھاتے کھاتے دس گیارہ بج چکے تھے۔ جب ہم گانے کو بیٹھے ہیں ٹھیک بارہ بجے کا وقت تھا۔ اس وقت وہ باغ جس میں بہت سا روپیہ صرف کر کے جنگل اور پہاڑ کی گپھاؤں کے نمونے بنائے گئے تھے عجب وحشت ناک سماں دکھا رہا تھا۔ ایک طرف چاند اس عالیشان کوٹھی کے ایک گوشے سے تھوڑی دور پر گنجان درختوں کی شاخوں سے نظر آتا تھا مگر اب ڈوبنے ہی کو تھا۔ تاریکی روشنی پر چھائی جاتی تھی جس سے ہر چیز بھیانک معلوم ہونے لگی۔ درخت جتنے اونچے تھے اس سے کہیں بڑے نظر آتے تھے۔ ہوا سن سن چل رہی تھی سرو کے درخت سائیں سائیں کر رہے تھے اور تو ہر طرف خموشی کا عالم تھا مگر تالاب میں پانی گرنے کی آواز بلند ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی کوئی پرندہ اپنے آشیانے میں چونک کر ایک بانگ بول دیتا تھا یا شکاری جانوروں کے ہول سے چڑیاں اڑتی تھیں اس سے پتے کھڑک جاتے تھے یا کبھی کوئی مچھلی تالاب میں اچھل پڑتی تھی۔ مینڈک اپنا بے تکا راگ گا رہے تھے جھینگر جھانجھ دے رہے تھے۔ سوا اس چبوترے کے جہاں دس بارہ جوان جوان عورتیں رنگ رنگ کے لباس پہنے اور طرح طرح کے زیور سے آراستہ جلسہ جمائے بیٹھی تھیں اور کوئی آس پاس نہ تھا۔ ہوا کے جھونکوں سے کنول بجھ گئے تھے، صرف دو مردنگوں کی روشنی تھی ان کے بھی شیشے سبز۔ یا تاروں کا عکس جو تالاب کے پانی میں ہلکورے لے رہا تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ طلسمات کا عالم تھا۔ وقت اور مقام کی مناسبت سے میں نے سوہنی کی ایک چیز شروع کر دی۔ اس راگنی کے بھیانک

صرعوں نے دلوں پر اپنا پورا اثر کیا تھا۔ سب مبہوت بیٹھے تھے۔

مارے خوف کے باغ کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا۔ خصوصاً گنجان درختوں کے نیچے اندھیرا گھپ تھا۔ سب ایک دوسرے کی صورت دیکھ رہے تھے۔ گویا وہ جلسہ امن کی جگہ تھی۔ اور جدھر نگاہ اٹھا کے دیکھو ایک ہو کا عالم تھا۔ اوروں کا کیا ذکر خود میرا کلیجہ دھڑک رہا تھا۔ دل ہی دل میں کہتی تھی بیگم نے سچ کہا تھا۔ بے شک یہ جگہ رہنے کے لائق نہیں ہے۔ اس اثنا میں گیدڑ کے بولنے کی آواز آئی۔ اس نے اور بھی دلوں کو ہلا دیا۔ اس کے بعد کتے بھونکنے لگے اب تو مارے دہشت کے یہ حال تھا کہ کسی کے منھ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ اتنے میں بیگم نے گاؤ تکیہ سے ذرا اونچی ہو کے اپنے سامنے کچھ دیکھا اور زور سے ایک چیخ مار کے مسند پر گر پڑیں اور سب عورتیں بھی اسی طرف دیکھنے لگیں میں بھی مڑ کے دیکھنے لگی۔

بیگم صاحب کو میں سمجھی تھی کہ وہمی ہیں۔ مگر اب جو دیکھتی ہوں تو اُن کے وہم کی حقیقت نظر آنے لگی۔ سامنے سے دس پندرہ آدمی منھ پر ڈھاٹے باندھے۔ ننگی تلواریں ہاتھ میں دوڑتے چلے آتے ہیں۔ عورتوں کے چلانے سے بیگم کے نوکر چاکر خدمت گار سب اسی طرف کو چلے کوئی نہتا کسی کے ہاتھ میں لاٹھی، مگر ڈاکو زیادہ تھے اور یہاں آدمی کم تھے۔ کئی تو راستے سے فرار ہو گئے۔ پانچ چار آدمی چبوترے تک پہنچ ہی گئے انھوں نے آکر عورتوں کو بیچ میں کر لیا اور لڑنے مرنے پر آمادہ ہو کے کھڑے ہو گئے عورتوں میں سے کسی کو ہوش نہ تھا۔ سب غش کی حالت میں بیدم پڑی تھیں۔ ایک میں خدا جانے کیا پتھر کا دل تھا، کہ بیٹھی رہی۔ مارے ہول کے دم نکلا جاتا تھا۔ یا اللہ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔

بیگم کے آدمیوں میں سے جن کے پاس حربے تھے وہ آگے بڑھنے ہی کو تھے کہ سرفراز نامے ایک سپاہی نے روکا۔

سرفراز۔ (اپنے ساتھیوں سے) ٹھہرو۔ ابھی جلدی نہ کرو۔ پہلے ہمیں اِن لوگوں کا عندیہ معلوم کر لینے دو۔ (ڈاکوؤں سے) "تم لوگ کس ارادے سے آئے ہو؟"

ایک ڈاکو۔ "جس ارادے سے آئے ہیں تمھیں ابھی معلوم ہو جائے گا۔"

سرفراز۔ "وہی میں پوچھتا ہوں۔ جان کے خواہاں ہو یا مال کے؟"

دوسرا ڈاکو۔ "ہمیں جان سے کوئی غرض نہیں، کوئی باپ مارے کا بیر ہے؟ ہاں جس ارادے سے آئے ہیں اس میں تم مزاحم ہو گے تو دیکھا جائے گا۔"

سرفراز۔ (کسی قدر سخت ہو کے) تو کیا بہو بیٹیوں کی آبرو لوگے۔ اگر یہ مقصد ہو۔۔۔۔۔۔

سرفراز پوری بات بھی ختم نہ کرنے پایا تھا کسی نے ڈاکوؤں کی طرف سے کہا۔

کوئی ڈاکو: "نا صاحب کسی کی بہو بیٹیوں سے کیا واسطہ۔ کیا ہمارے بہو بیٹیاں نہیں ہیں؟ عورتوں کے کوئی ہاتھ لگا سکتا ہے"

اس آواز پر مجھے کچھ شبہ سا ہوا۔

سرفراز۔ (خوش ہو کے) تو پھر یہی تو میں پوچھتا ہوں۔ اچھا تو بھائیو! ہم ابھی تمھیں کوٹھی کے کمروں کی کنجیاں منگائے دیتے ہیں اور جو عورتیں وہاں ہیں انکو یہاں بلوائے لیتے ہیں۔ گھر کی مالک بیگم یہیں ہیں۔ تم شوق سے کوٹھی میں جاؤ جو جی چاہے اُٹھا لیجاؤ۔ رہا عورتوں کا زیور وہ بھی اتروا دیتے ہیں۔ ہمارا مالک کچھ اس سے غریب نہ ہو جائے گا خدا کے حکم سے لاکھوں روپیہ بنک گھر میں جمع ہے۔ علاقہ سے جو روپیہ آتا ہے اُس کا ذکر نہیں"

ڈاکو: "اس سے بہتر کیا ہے مگر دیکھو اس میں دغا نہ ہو"

سرفراز "سپاہی کے پوت دغا نہیں دیتے خاطر جمع رکھو"

وہی ڈاکو جس کی آواز میں نے پہچانی تھی آگے بڑھا "واہ کیا کہنا مردوں کا قول ہی تو ہے۔ اچھا کنجیاں؟"

اتنا کہنا تھا کہ میرے اس کے نگاہیں چار ہوئیں۔ میں نے تو پہچان لیا بولنے کا قصد کیا مگر دل میں ایسی دہشت سمائی ہوئی تھی کہ منھ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ کہ اتنے میں خود اس نے آگے بڑھ کے کہا۔

"بھابی! تم یہاں کہاں؟"

میں: "جب سے تمہارے بھائی قید ہو گئے یہیں ہوں۔

فضل علی "یہاں کس کے پاس؟"

میں۔ "رہتی تو شہر میں ہوں مگر یہاں میری ایک بہن بیگم صاحب کے پاس نوکر ہیں ان سے ملنے آئی تھی"

فضل علی: "تمھاری بہن کہاں ہیں؟"

میں: "وہ یہیں ہیں۔ جب سے تم لوگوں کے آنے کا ہنگامہ ہوا بیچاری غش میں پڑی ہیں میری طرح تو ہیں نہیں۔ بیچاری پردہ نشین ہیں"

میں یہ جوانی میں رانڈ ہوئی جب سے امیر رئیسوں کی نوکریاں کرتی پھرتی ہے"

فضل علی۔ (اپنے ساتھیوں سے) "یہاں سے ایک پیسہ کی چیز لینا تو میرے نزدیک حرام ہے اور نہ اس معاملہ میں تمھارے ساتھ ہوں۔"

ایک ڈاکو: "یہ کیا۔ پھر آئے کیوں تھے؟"

فضل علی: "جس ارادے سے آئے تھے تمھیں معلوم ہے مگر کسی کا کچھ خیال بھی ہے؟ مجھ سے تو نہیں ہو سکتا کہ فیضو بھائی کی آشنا اور اس کی بہن کا اسباب لوٹوں یا جس سرکار سے ان لوگوں کا توسل ہو وہاں دست درازی کروں۔ اگر وہ قید میں سنے گا تو کیا کہے گا؟"

اس بات پر ڈاکوؤں کے آپس میں بہت جھگڑا ہونے لگا۔ مگر سب فضل علی کا دباؤ مانتے تھے کوئی دم نہ مار سکتا تھا۔ پھر بھی خالی ہاتھ پھر جانا کچھ ایسی سہل بات نہ تھی۔ سب ڈاکو غل مچاتے تھے فاقوں مرتے ہیں ایک موقع ملا بھی تو اسے خاں صاحب چھوڑے دیتے ہیں۔ آخر پیٹ کہاں سے پالیں۔؟

جب فضل علی اپنے گروہ سے نکل کے الگ کھڑے ہوئے تو ان کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور سیاہ فام شخص یہ کہتا ہوا نکلا۔

وہ شخص: "کہاں صاحب! میں بھی تمھارے ساتھ ہوں۔"

غور سے جو دیکھتی ہوں معلوم ہوا کہ فیض علی کا سائیس ہے۔ میں نے اُسے بلایا علیحدہ لے جا کے باتیں کیں وہ اشرفی اور روپیہ جو بیگم صاحبہ نے انعام دئے تھے چپکے سے اُسے دیدیے۔

فضل علی۔ (سرفراز خاں سے) "بھائی میں تمھارے ساتھ ہوں اب تم جانو اور یہ لوگ۔"

سرفراز: "میں ان لوگوں کو ابھی راضی کئے دیتا ہوں مگر یہاں سے چلو عورتیں پریشان ہو رہی ہیں۔ سرکار غش میں پڑی ہیں۔ ذرا انکو ہوش میں آنے دو۔ ہم تم لوگوں کو خوش کر دیں گے۔"

ڈاکو وہاں سے چلے گئے۔ بیگم صاحبہ ابھی تک بیہوش پڑی تھیں۔ دانت بیٹھ گئے ہیں تالاب سے ہاتھ میں پانی لائی۔ ان کے منہ پر چھینٹے دیے۔ بڑی مشکل سے ہوش میں آئیں۔ میں نے کہا سنبھل کے بیٹھیے۔ خدا کے صدقے سے وہ آفت ٹل گئی خاطر جمع رکھئے اور عورتوں کو بھی پانی چھڑک کر اٹھایا۔ سب اُٹھ اُٹھ کے بیٹھیں جب اطمینان ہو گیا تو میں نے کل قصہ بیان کیا۔ بیگم صاحبہ بہت خوش ہوئیں۔

سرفراز خاں کو بلا بھیجا۔

سرفراز: "سرکار کچھ دیدیجئے۔ بغیر اس کے کام نہ چلے گا۔ اس وقت نہ امراؤ جان یہاں ہوتیں نہ یہ آفت ٹلتی۔"

میں نے اس بات کا جواب کچھ نہ دیا اس لئے کہ میں سمجھ گئی کہ اس وقت میں یہ راز کی بات ان کے منہ سے نکل گئی ہے۔ اس موقعہ پر ایسی باتوں کا اظہار ان کی شان کے خلاف ہے)

میں: "جی نہیں میں نے کیا کیا یہ بھی اتفاق تھا۔"

مختصر یہ کہ بیگم نے صندوقچہ منگایا پانچ سو نقد اور پانچ سو کا سونے چاندی کا زیور دے کے انھیں ٹالا۔ سب کی جان میں جان آئی۔ بیگم کا اس وقت کا کہنا مجھے آج تک یاد ہے۔

بیگم: "کیوں امراؤ جان! باغ میں رہنے کا مزہ دیکھا؟"

میں: "حضور سچ کہتی تھیں۔"

اب صبح کے تین بج گئے تھے۔ سب لوگ اٹھ اٹھ کے کوٹھی میں گئے۔ ان لوگوں کے ساتھ میں بھی اٹھی۔ کوٹھی کے برآمدے میں ایک پلنگ میرے لئے بچھوا دیا گیا نیند کیسے آتی ہے۔ رات بھر جاگ رہی صبح ہوتے سب سو گئے میری آنکھ بھی لگ گئی۔ ابھی نیند بھر کے سونے نہ پائی تھی کہ میرے خدمتگار سواری لے کے آ گئے مجھے جگوایا۔ میں آنکھیں ملتی ہوئی باہر گئی۔

خدمتگار۔ "آپ تو خوب یہاں آ گئیں۔ رات بھر ہم لوگ راہ دیکھا کئے۔"

میں "کیونکر آتی۔ سواری کو تو رخصت کر دیا تھا۔"

خدمتگار: "اچھا تو اب چلئے لکھنؤ سے لوگ آپ کے پاس آئے ہیں۔"

میں سمجھ گئی۔ ہوں نہ ہوں بوا حسینی اور گوہر مرزا ہوں گے آخر پتہ لگا لیا۔"

میں۔ "اچھا چلتی ہوں۔ سواری لائے ہو؟"

خدمتگار: "حاضر ہے۔"

جب میں نے جانے کا قصد کیا دو ایک عورتیں اور جاگ چکی تھیں۔ مجھ کو روکا کہ بیگم صاحبہ سے مل کے جایئے گا۔ میں نے کہا اس وقت کام ہے۔ بیگم صاحب خدا جانے کب سو کے اٹھیں گی۔ ایسا ہی ہے تو میں پھر آؤں گی۔

گھر پر جا کے دیکھتی ہوں بوا حسینی اور میاں گوہر مرزا بیٹھے ہوئے ہیں۔ بوا حسینی میرے گلے سے لپٹ گئیں، رونے لگیں میں بھی رونے لگی۔

بوا حسینی: "اللہ بیٹی! کیا سخت دل کر لیا۔ تمھیں کسی کی محبت ہی نہیں؟"

میں بجائے خود شرمندہ تھی جواب کیا دیتی جھوٹ موٹ رونے لگی۔

معمولی گفتگو کے بعد بوا حسینی نے اسی دن لکھنؤ چلنے کا ارادہ کر دیا۔ میں نے لاکھ لاکھ اصرار کیا کہ ٹھہر جاؤ انھوں نے نہ مانا۔ زیادہ عجلت کی وجہ یہ تھی کہ مولوی صاحب بیمار تھے بوا حسینی کو دم بھر کہیں کا ٹھہرنا شاق تھا۔ ایسی ہی میری محبت تھی جو چلی گئی آئی تھیں۔ وہ دن کا بقیہ اسباب وغیرہ کے خریدنے اور مکان کے کرایے اور نوکروں چاکروں کے حساب کرنے میں تمام ہوا۔ پوری شکرم کرایہ پر کر لی تھی۔ ضروری اسباب اس پر لاد لیا اور فضول سامان نوکروں کو دیدیا۔ دوسرے دن لکھنؤ پہنچ گئے پھر وہی آب و دانہ ہے، وہی مکان وہی کمرہ وہی آدمی۔

دشت جنوں کی سیر میں بہلا ہوا تھا دل زنداں میں لائے پھر مجھے احباب گھیر کے

دیکھیے پہنچے کہاں تک شورش دل کا اثر

صرصر وحشت کا یہ شعلہ ہے بھڑکایا ہوا

نواب ملکہ کشور کی سرکار میں سوز خوانی کا سلسلہ انتزاع سلطنت کے زمانہ تک رہا۔ اسی اثنا میں شہزادے مرزا اسکندر حشمت عرف جرنیل صاحب کی مجرائیوں میں۔ میرا بھی اسم ہو گیا تھا۔ جناب عالیہ اور جرنیل صاحب کلکتہ چلے گئے۔ وہ تعلق منقطع ہو گیا۔

جس زمانہ میں باغی فوج نے مرزا برجیس قدر کو مسند ریاست پر بٹھایا میں بلحاظ قدامت اور اس وجہ سے بھی کہ میرا نام شاہی محلات میں اکثر کی زبان پر تھا مبارکباد دینے کے لئے طلب ہوئی شہر میں ایک اندھیر اتھا کہ آج اس کا گھر لٹا۔ کل وہ گرفتار ہوا پرسوں اس کے گولی لگی۔ چاروں طرف قیامت کا سامان نظر آتا تھا۔ سید قطب الدین نامی ایک صاحب افسران فوج میں سے تھے ان کا تعین دردولت پر تھا۔ میرے حال پر بہت عنایت کرتے تھے اس لئے اکثر وہیں رہنا پڑتا تھا۔ مجرے کے لئے کبھی وقت بے وقت

طلب ہو جاتی تھی۔

اس چند روزہ حکومت کے زمانہ میں برجیس قدر کے گیارہویں سال کی سال گرہ بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ اس جلسہ میں کشمیریوں نے یہ غزل گائی تھی۔

غیرت مہتاب ہے برجیس قدر   گوہر نایاب ہے برجیس قدر

میں نے ایک غزل اس موقع کے لئے تصنیف کی تھی اس کا مطلع یہ ہے۔

دلی ہزاروں کے تری بھولی ادائیں لینگی   حسرتیں چاہنے والوں کی بلائیں لینگی

رسوا:۔ "اُمراؤ جان! تم نے مطلع تو قیامت ہی کا کہا ہے اور کوئی شعر یاد ہو تو پڑھو۔"

اُمراؤ:۔ "گیارہ شعر کہے تھے مگر آپ کے سر کی قسم سوا اس مطلع کے اور کوئی شعر یاد نہیں۔ وہ زمانہ ایسی آفت کا تھا۔ نگوڑی دن رات جان دھڑکے میں رہتی تھی۔ غزل ایک پرچہ پر لکھ لی تھی۔ جس دن تک بیگم صاحب قیصر باغ سے نکلی ہیں وہ پرچہ میرے پاندان میں تھا پھر جب وہاں سے نکلنا ہوا ہول جول میں پاندان گیا جوتیاں اور دوپٹے تک چھوٹ گئے۔"

رسوا:۔ "بھلا کچھ یاد ہے کس دن بیگم صاحب قیصر باغ سے نکلی تھیں؟"

اُمراؤ:۔ "دن تو یاد نہیں۔ ہزاری روزے کے دوسرے یا تیسرے دن۔"

رسوا:۔ "ہاں تمھیں یاد رہا۔ رجب کی انتیسویں تاریخ تھی۔ بھلا فصل کونسی تھی؟"

اُمراؤ:۔ "اخیر جاڑے تھے۔ نوروز کے چار پانچ دن باقی رہے ہوں گے۔"

رسوا:۔ "بالکل درست۔ مارچ کی سولھویں تاریخ تھی۔ اچھا تم بیگم صاحب کے ساتھ قیصر باغ سے نکلیں؟"

اُمراؤ:۔ "جی ہاں۔ بونڈی تک ہمراہ گئی۔ راستہ میں نمک حرام اور بزدل افسران فوج کے نخرے اور بیگم صاحب کی خوشامد عمر بھر نہ بھولے گی۔ ایک صاحب کہتے ہیں تو صاحب ان کے راج میں ہم پیدل چلیں۔ دوسرے صاحب فرماتے ہیں بھلا کھانے کا تو انتظام درست ہوتا۔ تیسرے صاحب افیم کو بیٹھ رہے تھے۔ چوتھے اپنی جان کو رو رہے ہیں کہ حقہ وقت پر نہیں ملتا۔ جب بہرائچ سے انگریزی فوج نے بونڈی پر حملہ کیا تو اس میں سید قطب الدین مارے گئے۔ بیگم صاحب نیپال کی طرف روانہ ہوئیں میں جان بچا کے فیض آباد چلی آئی۔"

رسوا:۔ "سنا ہے بونڈی میں چار دن کے لئے خوب چہل پہل ہو گئی تھی۔"

امراؤ: "آپ نے سُنا ہے میں نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے لکھنؤ کے بھاگے ہوئے سب وہیں جمع ہو گئے تھے۔ بونڈی کا بازار لکھنؤ کا چوک معلوم ہوتا تھا۔"

رسوا: "اچھا اس قصہ سے مجھ کو زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ یہ کہیئے کہ وہ مال جو آپ نے میاں فیضو سے لیا تھا اُس کا کیا حشر ہوا؟"

امراؤ۔ (ایک آہ سرد بھر کے) "اے ہے یہ نہ پوچھیئے۔"

رسوا: "غدر میں سب لٹ گیا؟"

امراؤ: "غدر میں لٹ جاتا تو اتنا افسوس نہ ہوتا۔"

رسوا: "پھر کیا ہوا؟"

امراؤ۔ (سارا قصہ دہرانا پڑا) جس دن شب کو میں فیضو کے ساتھ بھاگنے والی تھی میں نے کل زیور اور اشرفیاں ایک پٹاری میں بند کیں اوپر سے خوب کپڑا لپیٹ دیا۔

خانم کے مکان کے پچھواڑے ایک میر صاحب رہتے تھے۔ امام باڑے کے کوٹھے کی دیوار پر چڑھ جاؤ تو ان کے مکان کا سامنا ہو جاتا تھا۔ میں اکثر بارپائی لگا کے اس دیوار پر چڑھ جایا کرتی تھی اور میر صاحب کی بہن سے باتیں کیا کرتی تھی۔

وہ زیور کی پٹاری میں نے ان کی بہن کے پاس پھینک دی اور اُن سے ہاتھ جوڑ کے کہا اس کو حفاظت سے رکھنا۔ انھوں نے فیض آباد سے آنے کے بعد وہ پٹاری اسی طرح گودڑ میں لپٹی ہوئی میرے حوالے کر دی۔ غدر میں تمام دنیا کے گھر لٹے۔ اگر کہہ دیتیں کہ لٹ گئی تو میں انکا کیا کر لیتی۔ مگر واہ ری بیوی۔ ایک پیسہ تک نقصان نہیں ہوا۔ ایسے ہی لوگوں سے زمین و آسمان تھما ہوا ہے۔ نہیں کب کی قیامت آ جاتی۔

رسوا: "بھلا کتنے کا مال ہوگا؟"

امراؤ: "وہ البتہ کوئی دس پندرہ ہزار کا مال تھا۔

رسوا: "اور اب کیا ہوا ہا؟"

امراؤ: "کیا ہوا۔ جس راہ آیا تھا اسی راہ گیا۔"

رسوا: "مگر لوگ تو مشہور کرتے ہیں کہ تمہارا ایک حبہ بھی غدر میں نہیں لٹا۔ سب

مال تمھارے پاس ہے۔"

امراؤ: "اگر مال ہوتا تو ان حالوں میں رہتی جیسی اب رہتی ہوں۔"

رسوا: "لوگ کہتے ہیں تم نے اپنا بھگل نکالا ہے۔ اگر نہیں ہے تو خرچ کہاں سے چلتا ہے؟ اب بھی کچھ برے حالوں نہیں رہتیں۔ دو آدمی نوکر ہیں خوش خوراک اور خوش پوشاک بھی ہو۔"

امراؤ: "خدا رازق ہے۔ جو جس کا خرچ ہے وہ اس کو ضرور ملتا ہے۔ اُس مال کا تو ایک حبہ بھی نہیں رہا۔"

رسوا: "اچھا! تو پھر کیا ہوا؟"

امراؤ: "اب کیا بتاؤں ایک مہربان....."

رسوا: "میں سمجھ گیا یہ گوہر مرزا صاحب کی حرکت ہوگی۔"

امراؤ: "میں اپنے منھ سے نہیں کہتی شاید آپ کا قیاس غلط ہو۔"

رسوا: "بے شک تمھارے عالی ظرف ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ دیکھئے وہ چین رہتے ہیں اور تمھیں پوچھتے تک نہیں۔"

امراؤ: "مرزا صاحب ارنڈی سے رسم رہا رہا نہ رہا۔ اب وہ مجھے کیوں پوچھیں۔ مدت ہوئی کہ ترک ملاقات ہو گئی۔"

رسوا: "اب کبھی تشریف بھی لاتے ہیں؟"

امراؤ: "وہ کاہے کو تشریف لائیں گے۔ میں اکثر جایا کرتی ہوں۔ ان کی بیوی کو بات محبت ہو گئی ہے۔ ابھی چار دن ہوئے لڑکے کی دودھ بڑھائی کی تھی تو بلا بھیجا تھا۔"

رسوا: "جب بھی کچھ دے ہی آئی ہوگی۔"

امراؤ: "جی نہیں۔ میں کس قابل ہوں جو کسی کو کچھ دوں گی۔"

رسوا: "تو وہ مال گوہر مرزا صاحب کے کیسے لگا؟"

امراؤ: "مرزا صاحب! مال کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ہاتھوں کا میل ہے فقط بات رہ جاتی ہے۔ اب بھی اپنے پیدا کرنے والے کے قربان جاؤں کبھی تنگی بھوکی نہیں رہتی۔ آپ ایسے قدردانوں کو خدا سلامت رکھے۔ مجھے کسی بات کی تکلیف نہیں ہے۔"

رسوا: "اس میں کیا شک ہے۔ وہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔ اب بھی سونے ایکی ہزار سے اچھی واللہ یہ تمھاری نیت کا ثمرہ ہے۔ خدا نے زیادت سے بھی مشرف کیا۔"

امراؤ: ”جی ہاں مولا نے سب مرادیں پوری کیں اب یہ تمنا ہے کہ مجھے کربلا پھر بلا بھیجیں میری مٹی عزیز ہو جائے۔ مرزا صاحب! میں اس ارادے سے گئی تھی کہ پھر کے نہ آؤں گی مگر خدا جانے کیا ہوا تھا کہ لکھنؤ سر پر سوار ہو گیا مگر اب کی اگر خدا نے چاہا اور جانا ہو گیا تو پھر نہ آؤں گی۔

سن چکے حال تباہی کا مری اور سنو

اب تمہیں کچھ مری تقریر مزا دیتی ہے

لونڈی سے بیگم صاحب اور مرزا برجیس قدر نیپال کو روانہ ہوئے۔ سید قطب الدین لڑائی میں مارے جا چکے تھے۔ میں بہزار مشکل فیض آباد آئی۔ پہلے سرا میں اتری۔ پھر ترپولیے کے پاس ایک کمرہ کرایہ کو لے لیا تھا۔ میراثی رکھ لیے۔ گانا بجانا شروع کر دیا۔

فیض آباد میں رہتے ہوئے اب مجھے ۶ مہینے گزر چکے ہیں۔ وہاں کی آب و ہوا طبیعت کے بہت موافق ہے۔ دل لگا ہوا ہے۔ آٹھویں دسویں کوئی نہ کوئی مجرا آ جاتا ہے اسی پر بسر ہے۔ تمام شہر میں میرے گانے کی دھوم ہے۔ جہاں مجرا ہوتا ہے ہزاروں آدمی ٹوٹ پڑتے ہیں۔ میرے کمرے کے نیچے لوگ تعریفیں کرتے ہوئے نکلتے ہیں۔ میں دل میں خوش ہوتی ہوں۔ کبھی کبھی خواب و خیال کی طرح بچپن کی باتیں یاد آ جاتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی دل میں ایک جوش سا پیدا ہوتا ہے۔ مگر انتزاع سلطنت غدر برجیس قدر یہ سب سانحے آنکھوں کے سامنے گزر چکے ہیں۔ کلیجہ پتھر کا ہو گیا ہے۔ ماں باپ کے ساتھ تصور کے ساتھ ہی یہ خیال آتا ہے۔ خدا جانے اب کوئی زندہ بھی ہو یا نہ ہو اور اگر ہو تو ان کو مجھ سے کیا مطلب۔ وہ اور عالم میں ہوں گے میں اور عالم میں ہوں۔ خون کا جوش سہی مگر کوئی غیرت دار آدمی مجھ سے ملنا گوارا نہ کرے گا۔ اب ان سے ملنے کی کوشش کرنا ان کو رنج دینا ہے۔ گھر کا خیال آتے ہی وہ باتیں دل میں آتی تھیں۔ پھر طبیعت اور طرف متوجہ ہو جاتی تھی۔

لکھنؤ کی یاد اکثر ستاتی تھی مگر جب انقلاب کا خیال آتا تھا دل پھر جاتا تھا۔ اب وہاں کون ہے کس کے لیے جاؤں عالم جلتی ہیں تو کیا ہوا۔ ان سے اب کیونکر بنے گی وہی اگلی حکومت جنابؑ کی مجھے اب انکی قید میں رہنا کسی طرح منظور نہ تھا۔ جو مال میر صاحب کی بہن کے پاس امانت تھا وہ اب کیا ملے گا تمام لکھنؤ

لٹ گیا۔ میر صاحب کا گھر بھی لٹ گیا ہوگا۔ اس کا اب خیال ہی بے کار ہے۔ اگر نہیں لٹا تو بھی اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میرے ہاتھ گلے جو کچھ موجود ہے وہ کیا کم ہے۔

ایک دن کمرے پہ بیٹھی ہوں۔ ایک صاحب شریفانہ صورت۔ ادھیڑ سے تشریف لائے میں نے پان بنا کے دیا حقہ بھروا دیا۔ حالات دریافت کرنے پر معلوم ہوا بہو بیگم صاحبہ کے عزیزوں میں سے ہیں۔ وثیقہ پاتے ہیں۔ میں نے باتوں باتوں مقبرہ کی روشنی کی تمنید اٹھا کے پرانے ملازموں کا ذکر چھیڑا۔

میں:۔ "اگلے نوکروں میں اب کون کون رہ گیا ہے؟"

نواب صاحب:۔ "اکثر مر گئے۔ نئے نئے نوکر ہیں۔ اب وہ کارخانہ ہی نہیں رہا۔ بالکل نیا انتظام ہے۔"

میں:۔ "اگلے نوکروں میں ایک بڈھے جمعدار تھے۔"

نواب:۔ "ہاں تھے مگر تم انھیں کیا جانو۔"

میں:۔ "غدر سے پہلے میں ایک مرتبہ محرم میں فیض آباد آئی تھی۔ مقبرے پہ روشنی دیکھنے گئی تھی۔ انھوں نے میری بڑی خاطر کی تھی۔"

نواب:۔ "وہی جمعدار نا جن کی ایک لڑکی نکل گئی تھی۔"

میں:۔ "مجھے کیا معلوم (دل میں) ہائے افسانہ ابتک مشہور ہے۔"

نواب:۔ "یوں تو کئی جمعدار تھے اور اب بھی ہیں مگر روشنی وغیرہ کا انتظام غدر سے پہلے وہی کرتے تھے۔"

میں:۔ "ایک لڑکا بھی ان کا تھا۔"

نواب:۔ "تم نے لڑکے کو کہاں دیکھا؟"

میں:۔ "اس دن ان کے ساتھ ایسی ہی شکل ملتی کم دیکھی ہے بن کہے میں پہچان گئی تھی۔"

نواب:۔ "جمعدار غدر سے پہلے ہی مر گئے وہی لڑکا ان کی جگہ نوکر ہے۔"

اس کے بعد بات ٹالنے کے لیے میں نے اور کچھ حالات ادھر ادھر کے پوچھے نواب صاحب نے سوز پڑھنے کی فرمائش کی۔ میں نے دو سوز سنائے بہت محظوظ ہوئے رات کچھ زیادہ آگئی تھی گھر تشریف لے گئے۔

باپ کے مرنے کا حال سن کے مجھے بہت رنج ہوا۔ اس دن رات بھر رویا کی دوسرے دن یہ ارادہ کیا چاہا بھائی کو جا کے دیکھ آؤں وہ دن کے بعد ایک مجرا آگیا۔ اس کی

تیاری کرنے لگی۔ جہاں کا مجرا آیا تھا وہاں گئی محلہ کا نام یاد نہیں مکان کے پاس ایک بہت بڑا پرانا املی کا درخت تھا اسی کے نیچے شگیرہ تانا گیا تھا۔ گرد قناتیں تھیں بہت بڑا مجمع تھا مگر لوگ کچھ ایسے ہی دیسے تھے۔ قناتوں کے پیچھے اور سامنے کھپریلوں میں عورتیں تھیں پہلا مجرا کوئی ۹ بجے شروع ہوا بارہ بجے تک رہا۔ اس مقام کو دیکھ کے وحشت سی ہوتی تھی۔ دل امڈا چلا آتا تھا کہ یہیں میرا مکان ہے۔ یہ املی کا درخت وہی ہے جس کے نیچے میں کھیلا کرتی تھی۔ جو لوگ محفل میں شریک تھے ان میں سے بعض آدمی ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے انکو میں نے کہیں دیکھا ہے۔ شبہ مٹانے کے لئے میں قناتوں کے باہر نکلی۔ گھروں کی قطع کچھ اور ہو گئی تھی۔ اس سے خیال ہوا شاید یہ وہ جگہ نہ ہو۔ ایک مکان کے دروازے کو غور سے دیکھا کی۔ دل کو یقین ہو گیا تھا کہ یہی میرا مکان ہے جی چاہتا ہے کہ مکان میں گھسی چلی جاؤں۔ ماں کے قدموں پر گروں۔ وہ گلے لگائیں گی مگر جرائت نہ ہوتی تھی اس لئے کہ میں جانتی ہوں کہ دیہات میں رنڈیوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ دوسرے باپ بھائی کی عزت کا خیال تھا۔ نواب صاحب کی باتوں سے معلوم ہو چکا تھا کہ جمعدار کی لڑکی کا نکل جانا لوگوں کو معلوم ہے۔ پھر جی کہتا تھا ہائے کیا غضب ہے صرف ایک دیوار کی آڑ ہے۔ ادھر میری اماں بیٹھی ہوں گی اور میں یہاں ان کے لئے تڑپ رہی ہوں۔ اک نظر صورت دیکھنا بھی ممکن نہیں۔ کیا مجبوری ہے۔

اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ ایک عورت نے آ کے پوچھا "تمھیں لکھنؤ سے آئی ہو؟"

میں۔ "ہاں" اب تو میرا کلیجہ بانسوں اچھلنے لگا۔

عورت۔ "اچھا تو ادھر چلی آؤ تمھیں کوئی بلاتا ہے"

میں اچھا کہہ کے اس کے ساتھ چلی۔ ایک ایک پاؤں گویا سو سو من کا ہو گیا تھا۔ قدم رکھتی تھی کہیں اور پڑتا تھا کہیں۔

وہ عورت اس مکان کے دروازے پر مجھ کو لے گئی جسے میں اپنا مکان سمجھے ہوئے تھی۔ اس مکان کی ڈیوڑھی میں مجھ کو بٹھا دیا اندر کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا اس کے پیچھے دو تین عورتیں آ کے کھڑی ہوئیں۔

ایک "لکھنؤ سے تمھیں آئی ہو؟"

میں "جی ہاں"

دوسری "تمھارا نام کیا ہے؟"

میں: (جی میں تو آیا کہ کہہ دوں مگر دل کو تھام کے) امراؤ جان۔

بیگم: تمہارا وطن؟ میں: لکھنؤ سہی۔

میں: (اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا، آنسو نکل پڑے) اصلی وطن تو فیض آباد ہے۔ بیگم: ہائے کس محلے کی؟

بیگم: کیا تم بنگلہ کی رہنے والی ہو؟

میں: (آنکھوں سے آنسو برابر جاری تھے، مشکل سے اب میاں جی ہاں)۔

دوسری: کیا تم ذات کی چھتری ہو؟

میں: ذات کی چھتری تو نہیں ہوں، مقبرہ کے جمعدار کی بیٹی ہوں۔

بیگم: (خود رونے لگی) اچھا تو روتی کیوں ہو؟ آخر یہ تم کون ہو؟

میں: (آنسو پونچھ کے) کیا بتاؤں کون ہوں، کچھ کہتے نہیں بن پڑتا۔

اتنی باتیں میں نے بڑے دل سنبھال سنبھال کے کہیں، اب بالکل تاب ضبط نہ تھی۔ سینے میں دم گھٹنے لگا تھا۔

اتنے میں دو عورتیں پردے کے باہر نکلیں، ایک کے ہاتھ میں چراغ تھا، اس نے میرے منہ کو ہاتھ سے تھام کے کالا تل جو میرے پاس نظر سے دیکھا اور یہ کہہ کے دوسری کو دکھایا، دیکھا، ہم نہ کہتے تھے وہی ہے۔

دوسری نے ہائے میری امیرن! یہ کہہ کے لپٹ گئی۔ دونوں ماں بیٹیاں چیخیں مار مار کے رونے لگیں۔ بیگم ان سے پوچھ رہی تھیں، آخر وہ عورت ... تو ... آنکھ بھر آیا۔ اس کے بعد میں نے اپنا سارا قصہ کہہ سنایا۔ میری ماں نے سنا اور روتی رہی۔ یہاں تک رات ہم دونوں بیٹھے رہے، صبح ہو گئی، رخصت ہوئی۔ ماں نے چلتے وقت جس حسرت سے مجھے دیکھا تھا وہ نگاہ مرتے دم تک یاد رہے گی۔ مگر مجبوری۔ ... نے پایا کہ سوار ہو کر اپنے گھر پر چلی آئی۔ دوسرا ... تم کو ... مگر ... گھر ... گئے کل ... مجھ سے ملنا ... اور بیماری کا بہانہ کیا، بیچارہ ... دو ... رخصت دیا۔ اس دن ... بعد جو میرا حال ہوا خدا جانتا ہے ... کرکے دن پھر ... دیا۔

دوسرے دن شام کو کوئی آدمی ... ایک جوان سا آدمی ... رنگت کوئی بیس بائیس کا سن، پگڑی باندھے، سپاہیوں کی ایسی وردی پہنے، میرے کمرے پر آیا۔ میں نے حقہ بھروا دیا۔ پاندان میں پان نہ تھے ... کہا ... اتفاق

سے اور کوئی بھی اس وقت نہ تھا۔ کمرے میں میں ہوں اور وہ ہے۔

جوان: "کل تمھیں مجرے کو گئی تھیں؟" (یہ اس طور سے کہا کہ میں جھجک گئی)۔

میں: "ہاں"

اتنا کہہ کے اس کے چہرے کی طرف جو دیکھا یہ معلوم ہوتا تھا جیسے آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔

جوان۔ (سر نیچا کر کے) "خوب گھرانے کا نام روشن کیا"۔

میں۔ (اب سمجھی کہ یہ کون شخص ہے) "اس کو تو خدا ہی جانتا ہے"۔

جوان: "ہم تو سمجھے تھے کہ تم مر گئیں مگر تم اب تک زندہ ہو"۔

میں: "بے غیرت زندگی تھی نہ مری۔ خدا کہیں جلد موت دے"۔

جوان: "بے شک اس زندگی سے موت لاکھ درجہ بہتر تھی۔ تمھیں تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا تھا۔ کچھ کھا کے سو رہتیں"۔

میں: "خود اتنی سمجھ نہ تھی نہ آج تک کسی نے یہ نیک صلاح دی"۔

جوان: "اگر ایسی ہی غیرت دار ہوتیں تو اس شہر میں کبھی نہ آتیں اور آئی بھی تھیں تو تمھیں اس محلہ میں مجرے کو نہ آنا تھا جہاں کی رہنے والی تھیں"۔

میں: "ہاں اتنی خطا ضرور ہوئی مگر مجھے کیا معلوم تھا؟"

جوان: "اچھا اب تو معلوم ہو گیا"۔

میں: "اب کیا ہوتا ہے"۔

جوان۔ (بہت ہی غصہ ہو کے) اب کیا ہوتا ہے! اب کیا ہوتا ہے۔ اب (چھری کمر سے نکال کے مجھ پر جھپٹا دونوں ہاتھ پکڑ کے گلے پر چھری رکھ دی) یہ ہوتا ہے۔ اتنے میں ماما بازار سے پان لے کے آئی اس نے جو یہ حال دیکھا لگی چیخنے "ارے دوڑو۔ بیوی کو کوئی مارے ڈالتا ہے"۔

جوان۔ (چھری گلے سے ہٹا کے ہاتھ چھوڑ دیے) عورت کو کیا ماروں اور عورت بھی کون۔ بڑی۔ . . . . ."

اتنا کہہ کے ڈاڑھیں مار مار رونے لگا۔

میں پہلے سے رو رہی تھی، جب اس نے گلے پر چھری رکھی تھی جان کے خوف سے ایک دھچکا سا کلیجہ پر پہنچا تھا۔ اس سے دم بخود ہو گئی تھی۔ جب وہ چھوڑ کر رونے لگا میں بھی رونے لگی۔

ماما نے دو ایک چٹکیں ماری تھیں۔ جب اس نے یہ حال دیکھا کچھ چپ سی ہو رہی ادھر میں نے اشارے سے منع کیا ایک کنارے کھڑی ہو گئی۔

"جب دونوں خوب رو دھو چکے۔"

"جوان۔ (ہاتھ جوڑ کے) "اچھا تو اس شہر سے کہیں چلی جاؤ۔"

میں: "کل چلی جاؤں گی مگر ایک مرتبہ ماں کو اور دیکھ لیتی۔"

جوان: "بس۔ اب دل سے دور رکھو معاف کرو۔ کل اماں نے تمہیں گھر پر بلالیا میں نہ ہوا نہیں تو اسی وقت وارا نیارا ہو جاتا۔ محلہ بھر میں چرچے ہو رہے ہیں۔"

میں: "تم نے دیکھ لیا جان سے تو میں ڈرتی نہیں۔ مگر ہائے تمہاری جان کا خیال ہے۔ تم اپنے بچوں پر سلامت رہو۔ خیر اگر جیتے رہے تو کبھی نہ کبھی خیر و عافیت سن ہی لیا کریں گے۔"

جوان: "برائے خدا کسی سے ہمارا ذکر نہ کرنا۔"

میں: "اچھا۔"

وہ جوان تو اٹھ کے چلا گیا۔ میں اپنے غم میں مبتلا تھی۔ ماما نے اور جان کھانا شروع کی۔

"یہ کون تھے؟"

میں: "رنڈی کے مکان پر ہزار دس آدمی آتے ہیں۔ کوئی تھے۔ تمہیں کیا؟"

بہر طور ماما کو ٹال دیا۔ رات کی رات سو رہی۔ صبح کو اٹھ کے لکھنؤ کے چلنے کی تیاری کی۔ شاموں شام شکرم کرایہ کر کے روانہ ہو گئی۔

لکھنؤ میں آکر خانم کے مکان میں اتری۔ وہی چوک وہی کمرہ، وہی ہم جیسے اگلے آنے والوں میں سے کچھ لوگ کلکتہ چلے گئے تھے، کچھ اور شہروں میں نکل گئے تھے۔ شہر میں نیا انتظام نئے قانون جاری تھے۔ آصف الدولہ کے امام باڑے میں قلعہ تھا چاروں طرف دمدمے بنے ہوئے تھے، جا بجا چوڑی چوڑی سڑکیں نکل رہی تھیں۔ گلیوں میں کھڑنجے بنائے جاتے تھے، نالے نالیاں صاف کی جاتی تھیں۔ غرضکہ لکھنؤ اب اور ہی کچھ ہو گیا تھا۔

میں دو چار مہینے خانم کے مکان پر رہی اس کے بعد بہ لطائف الحیل ایک علیحدہ کمرہ کر رہنا شروع کیا۔ زمانے کے انقلاب کے ساتھ خانم کی طبیعت بھی کچھ بدل گئی تھی۔ مزاج میں ایک قسم کی بے پروائی سی ہو گئی تھی، جو رنڈیاں نکل کے علیحدہ ہو گئی تھیں انکا توڑ کر لیا۔ جو ساتھ رہتی تھیں ان کے روپے پیسے سے کوئی واسطہ غرض نہ تھی۔ میرا علیحدہ ہو جانا بھی کچھ

ان کے مزاج کے خلاف نہ گزرا۔ دوسرے تیسرے دن میں جاتی تھی سلام کر کے چلی آتی تھی
اسی زمانے میں نواب محمود علی خاں صاحب سے مجھ سے تپاک بڑھا۔ پہلے پہل دو دن تشریف لایا
کیے پھر نوکر رکھ لیا اس کے بعد مجھے پابند کرنا چاہا۔ بھلا مجھ سے کب ہو سکتا تھا کہ ایک کی ہو رہوں
اور قدیم ملنے والوں سے ملاقات ترک کر دوں۔ جب میں نے نواب صاحب کی الفت
کا یہ رنگ دیکھا ترک تعلق کرنا چاہا۔ نواب صاحب نے عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا کہ
مجھ سے نکاح ہوا ہے۔ عجیب آفت میں جان پھنسی۔ مقدمے کی پیروی میں ہزاروں روپے
صرف ہوئے۔ عدالت ابتدائی میں فیصلہ نواب صاحب کے موافق ہوا۔ اب مجھے روپوش
ہونا پڑا۔ مدتوں چھپی چھپی پھری۔ وکیل کی معرفت اپیل کی۔ اپیل میں نواب صاحب ہارے
نواب صاحب نے عدالت عالیہ میں اپیل کی یہاں بھی ہار ہے۔ اب ناجائز دھمکیاں دینا
شروع کیں۔ مار ڈالوں گا۔ ناک کاٹ لوں گا۔ اس زمانے میں مجھ کو جان کی حفاظت کے لیے
دس بارہ آدمی لٹھ بند نوکر رکھنا پڑے۔ جہاں جاتی ہوں آدمی تیغوں کے ساتھ ہیں ناک
میں دم ہو گیا۔ آخر میں نے فوجداری میں مچلکے کا دعویٰ کیا۔ گواہوں سے ثابت کرا دیا کہ
نواب صاحب جنگ کے درپے آزار ہیں۔ حاکم نے نواب صاحب سے مچلکہ لے لیا اب
جا کے جان چھوٹی۔ چھ برس تک ان مقدموں میں پھنسی رہی۔ خدا خدا کر کے نجات ہوئی۔

جس زمانے میں نواب صاحب سے مقدمہ لڑ رہا تھا ایک صاحب اکبر علی خاں نامی
مختار پیشہ تھے بڑے آفت کے پرکالے ناجائز کارروائیوں میں مشاق جعل سازی میں
استاد جھوٹے مقدمات بنانے میں دھوکہ مختصر عدالت کو دھوکہ دینے میں یکتائے زمانہ
میری طرف سے پیروکار تھے انھی کی وجہ سے عدالتی کاموں میں بہت مدد ملی۔ حق تو یہ ہے کہ
اگر وہ [illegible] نواب سے سر نہ ہوتی۔ اگرچہ سچا واقعہ یہ ہے کہ نواب صاحب سے
اور مجھ سے نکاح نہ تھا مگر عدالتوں میں اکثر سچی بات کے لیے بھی جھوٹے گواہ پیش کرنا
ہوتے ہیں۔ فریق ثانی کی طرف سے بالکل جھوٹا دعویٰ تھا لیکن مقدمہ اس سلیقہ سے
بنایا گیا تھا کہ کوئی صورت مفر کی نہ تھی۔ نکاح کے ثبوت میں دو مولوی پیش کیے گئے
تھے جن کے ماتھوں پہ گٹے پڑے بڑے بڑے عمامے سر پر عبائیں زیب دوش
ہاتھوں میں تسبیحیں۔ پاؤں میں کفشیں۔ بات بات میں قال اللہ قال الرسول ان کی صورت
دیکھ کے حاکم عدالت کیا کسی نیک نیت آدمی کو کذب و دروغ کا شبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ان
میں سے ایک بزرگ ناکح کے وکیل بنے تھے اور ایک منکوحہ کے مگر کیا حق ہے

اور ناحق ناحق۔ جرح میں بگڑ گئے۔ نواب کے دو گواہ ان سے زیادہ بگڑے اور انھیں کی گواہی کی وجہ سے نواب اپیل ہار گئے۔ فوجداری میں میری طرف سے جو گواہ پیش ہوئے تھے وہ سب اکبر علی کے بنائے تھے۔ بالکل نہ بگڑے۔

اکبر علی خاں کی آمد و رفت میرے مکان پر بہت زمانہ تک رہی۔ انھوں نے میرے ساتھ پورا حق دوستی ادا کیا۔ ایک حبہ نہیں لیا بلکہ اپنے پاس سے بہت روپیہ صرف کیا۔ واقعی ان کو میرے ساتھ ایک قسم کی محبت تھی۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ بُرے آدمی کبھی بالکل بُرے نہیں ہوتے کسی نہ کسی سے کچھ ضرور رہ جاتے ہیں۔ اگلے زمانے کے چوروں کی نسبت آپ نے سنا ہوگا کہ جب کسی سے دوستی کر لیتے تھے تو اس کا پورا نباہ کرتے تھے۔ فقیری تدبیر بدلائی کے زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔ جو شخص سب سے بُرا ہے وہ کسی کا تو ہو کے رہتا ہے۔ جب تک نواب سے مقدمہ ہوتا رہا میں کسی اجنبی شخص کو اپنے پاس نہ آنے دیتی تھی مبادا اس کا بھیجا ہوا خفیہ خبر لینے آیا ہو اور کسی طرح کا نقصان پہنچائے۔ اکبر علی خاں گھر سے کھانا کھا کے نہیں آتے تھے۔ شام کو یہیں نماز پڑھتے تھے۔ گھر سے کھانا آتا تھا۔ ہر چند میں نے اصرار کیا کہ مکان سے کھانا منگانے کی کیا ضرورت ہے مگر انھوں نے نہ مانا۔ آخر مجبور ہو کے چپ ہو رہی۔ میرے گھر کے کھانے سے انکار بھی نہ تھا۔ میں بھی انھیں کے ساتھ کھانا کھاتی تھی۔ اس زمانہ میں بھی نماز کی پابند ہو گئی تھی۔ اکبر علی خاں کو تعزیہ داری سے عشق تھا۔ رمضان اور محرم میں وہ اس قدر نیک کام کرتے تھے جس سے ان کے سال بھر کے گناہوں کی تلافی ہو جاتی تھی۔ صحیح ہو یا غلط مگر ان کا اعتقاد یہی تھا۔

رسوا: یہ معاملہ ایمان کا ہے اس میں مجھ کو اتنا کہہ دینے دیجئے کہ یہ اعتقاد صحیح نہیں ہے۔

امراؤ: میرے نزدیک بھی ایسا ہی ہے۔

رسوا: اہل مذہب نے گناہ کی دو قسمیں کی ہیں ایک وہ جن کا اثر اپنی ہی ذات تک رہتا ہے اور دوسرے وہ جن کا اثر دوسروں تک۔ پہنچتا ہے۔ میری رائے ناقص میں پہلی قسم کے گناہ صغیرہ اور دوسری قسم کے گناہ کبیرہ ہیں۔ اگر یہ اور لوگوں کی راحت کے خلاف ہوں جن گناہوں کا اثر دوسروں تک پہنچتا ہے ان کی بخشش وہی لوگ کر سکتے ہیں جن پر ان کا بُرا اثر پہنچا ہے۔ تم نے خواجہ حافظ کا وہ شعر سنا ہوگا۔

مے خور و مصحف بسوز و آتش اندر کعبہ زن
ساکن بتخانہ باش و مردم آزاری مکن

امراؤ جان! یاد رکھو۔ مردم آزاری بہت ہی بُری چیز ہے اس کی بخشش کہیں نہیں ہے اور اگر اس کی بخشش ہو تو معاذ اللہ خدا کی خدائی بیکار ہے۔"

اُمراؤ:" میرا تو بال بال میاں گنہگار ہے، مگر اس سے میں بھی کانپتی ہوں۔

رسوا:" مگر تم نے دل آزاری بہت کی ہوگی۔"

اُمراؤ۔ پھر یہ تو ہمارا پیشہ ہے اسی دل آزاری کی بدولت لاکھوں روپئے ہم نے کمائے ہزاروں اڑائے۔

رسوا:" پھر اس کی کیا سزا ہوگی؟"

امراؤ:" اس کی سزا نہ ہونی چاہئے۔ ہم نے جس قسم کی دلآزاری کی اس میں ایک طرح کی لذت ہے جو اس دلآزاری کا معاوضہ ہو جاتا ہے۔

رسوا:۔" کیا خوب!"

امراؤ۔ فرض کیجئے ایک صاحب نے ہم کو میلے تماشے میں کہیں دیکھ لیا، مرنے لگے۔ کوڑی پاس نہیں۔ ہم بے پیسے مل سکتے نہیں۔ ان کا دل دکھتا ہے۔ پھر اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ دوسرے صاحب ہم سے ملنا چاہتے ہیں، روپیہ بھی دیتے ہیں۔ ہم ایک اور شخص کے پابند ہیں یا ان سے ملنا نہیں چاہتے۔ اپنا دل۔ اُن کی جان پر بنی ہے پھر؟ ہماری بلا سے۔ بعض صاحب ہمارے پاس اس طرح کے آتے ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں چاہو۔ ہم نہیں چاہتے اجارہ ہے۔ اس سے انکو صدمہ پہنچتا ہے پھر ہماری پاپوش سے۔"

رسوا:" یہ سب گولی مارنے کے لائق ہیں مگر برائے خدا کہیں مجھے ان میں سے کسی میں شمار نہ کر لیجئے گا۔"

امراؤ:" خدا نہ کرے! آپ خوش باتوں میں ہیں۔ نہ آپ کسی کو چاہتے ہیں نہ کوئی آپ کو چاہتا ہے اور پھر آپ سب کو چاہتے ہیں اور سب آپ کو۔"

رسوا:" یہ کیا کہا؟ ایک بات ہے، نہیں بھی ہے کہیں ایسا ہو سکتا ہے؟"

امراؤ:" میں منطق تو زیادہ پڑھی نہیں مگر ہو سکتا ہے جب ایک بات کے دو پیرایے ہوں۔ ایک چاہنا عقلمندی کے ساتھ ہوتا ہے اور ایک بیوقوفی کے ساتھ۔

رسوا:" اس کی مثال؟"

امراؤ:" پہلے کی مثال جیسے آپ مجھ کو چاہتے ہیں۔ میں آپ کو۔"

رسوا:" خیر میرے چاہنے کا حال تو میرا دل ہی جانتا ہے۔ اور آپ کے چاہنے کا حال

آپ کے اقرار سے معلوم ہوگیا۔ آگے چلئے دوسری مثال۔

امراؤ: "خیر نہیں چاہتے تو برا چاہتے ہوں گے۔ دوسرے کی مثال سنئے جیسے فرہاد ‎رس آئی"۔

رسوا: "نہیں اس مثال میں آپ نے غلطی کی اور کوئی مثال دیجئے"۔

امراؤ: "اچھا جیسے قیس لیلیٰ کو چاہتا تھا"۔

رسوا: "آپ بھی کیا دقیانوسی خیال ڈھونڈھ کے لائی ہیں"۔

امراؤ: "اچھا جیسے... ... نظیر... ..."

رسوا: "(بات کاٹ کے) اس مثال سے معاف کیجئے۔ اس موقع پر مجھ کو ایک شعر یاد آیا ہے سن لیجئے اور اپنا قصہ دہرائیے"۔

کیا کہوں تجھ سے محبت وہ بلا ہے ہمدم ‏ ‏ ہم کو عبرت نہ ہوئی غیر کے مرجانے سے

امراؤ: "ہاں وہ کلکتہ والا معاملہ"۔

رسوا: "اتنی دور کہاں پہنچیں۔ کیا لکھنؤ میں ایسے نہیں رہتے؟"

امراؤ: "دنیا خالی نہیں ہے"۔

رسوا: "ہاں میں نے سنا تھا۔ آپ اکبر علی خاں کے گھر بیٹھ گئی تھیں"۔

امراؤ: "مجھ سے سن لیجئے۔ جس زمانے میں نواب عدالت ابتدائی سے جیت گئے تھے اور میں روپوش ہوئی ہوں اس زمانہ میں اکبر علی خان مجھے اپنے مکان لے گئے تھے۔ کئی برس رہنے کا اتفاق ہوا۔ اس زمانے میں تین آدمی اس دھوکے میں تھے کہ میں اکبر علی کے گھر بیٹھ گئی۔ ایک تو خود اکبر علی دوسرے ان کی بیوی تیسرے کا نام نہ بتاؤں گی"۔

رسوا: "میں بتادوں؟"

امراؤ: "گوہر مرزا؟"

رسوا: "جی نہیں"۔

امراؤ: "تو پھر اور کون؟ بتائیے"۔

رسوا: "آپ بتائیے"۔

امراؤ: "ایسے نشتر کسی اور کو دیجئے"۔

رسوا: "خیر! کیا میں بھی ایک پرچے پر لکھ کر رکھ دیتا ہوں پھر آپ بتائیے"۔

امراؤ: "بہتر"۔

رسوا: "یہ چونکے سے کہہ دیا اب کہئے۔"

امراؤ: "تیسرے سے شرما نہ ہو۔"

رسوا: "پرچے میں لکھا تھا آپ خود۔"

امراؤ: "واہ مرزا صاحب! خوب کہا!"

رسوا: "آپ کی عنایت ہے۔ ہاں تو کیا گزری؟"

امراؤ: "گزری کیا سنئے۔"

اول تو انھوں نے مجھے ایک چبوترے سے مکان میں سامنے جا کے اتارا۔ جو ان کے مکان سے ملا ہوا تھا۔ کھڑکی درمیان میں تھی۔ ہوا کیا سا مکان۔ ایک چھوٹی سی دالان آگے چھپر، ایک اور چھپر سامنے پڑا ہوا۔ اس میں دو چولھے بنے ہوئے، یہ کیا ہے باورچی خانہ اور سب خانے بھی ایسے ہی سمجھ لیجئے۔ اسی مکان میں ابھی رہوں ان میاں کے بے تکلف دوست بھی آیا جایا۔ ان میں سے ایک صاحب بشیر الدین شیخ افضل حسین تھے۔ حقے کی بھوچ کہنے لگے۔ ان کے بیٹھنے نے ناک میں دم کر دیا۔ پانوں کی فرمائش سے میں تنگ ہو گئی۔ ہر گھڑی بھری پان کھلاؤ گی!

ایک دن دو دن آخر برداشت کہاں تک۔ انتہا یہ کہ پاندان میں سے ان کے آگے سرکا دیا۔ اس دن سے میں خود دستبردار ہو گئی۔ انھوں نے قبضہ کر لیا جیسے کوئی مال موروثی پر قبضہ کرتا ہے۔ ہاں اس بدتمیزی سے کھاتے تھے کہ دیکھنے والوں کو خواہ مخواہ نفرت ہو جائے۔ کتھے چونے کی کلھیوں میں انگلیاں پڑی رہتی ہیں۔ زبان سے چاٹ رہے ہیں۔ میں نے جب یہ قرینہ دیکھا چکنی ڈلی کی ڈبیا اور الائچی ڈبے برابر کرنے لگی۔ اس میں بھی وہ ساجھا لگاتے تھے۔ ایک اور صاحب دلاور علی نامی اکثر شام کو کھانے کے وقت تشریف لاتے تھے۔ اب یاد نہیں کہ اکبر علی خاں کے یار دوست تھے۔ انکے مذاق میں فحش حد اعتدال سے زیادہ تھا۔

ان دونوں صاحبوں کے سوا اکبر علی خاں صاحب کے بے تکلف احباب بہت سے تھے جن میں سے اکثر کو مقدمہ بازی کا شوق تھا۔ تمام دن قانون چھانٹا کرتا تھا۔ مگر جب مرزا صاحب تشریف لے جاتے تو ایک ذرا امن ہو جاتی تھی۔

اس مکان میں چند روز کے بعد میری طبیعت حد سے زیادہ رک گئی۔ قریب تھا کہ میں اس رہنے کا بندوبست کروں کہ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ اکبر علی خاں کسی مقدمے میں فیض آباد گئے اور افضل علی اپنے گاؤں۔ اتفاق سے مکان میں کوئی نہیں۔ دروازے کی کنڈی بند کر لی۔

میں اکیلی بیٹھی ہوں کہ اتنے میں کھڑکی کا ہونا [illegible] مکان کی دیوار [illegible] تھی کھلی اور اکبر علی خاں کی بیوی اندر چلی آئیں۔ مجھے خواہی نخواہی سلام کرنا پڑا۔ انگنائی میں تخت [illegible] کا بچھا تھا کے پاس میرا پلنگ بچھا تھا۔ یہاں بڑی دیر تک [illegible] کی طرف رہیں۔ آخر میں نے کہا "اللہ بیٹھ جائیے۔" بارے بیٹھ گئیں۔

میں: "ہم غریبوں پر کیا عنایت تھی آج ادھر کہاں تشریف لائی ہیں؟"

بیوی: "تم کو میرا آنا ناگوار ہو تو چلی جاؤں؟"

میں: "جی نہیں، آپ کا گھر ہے۔ مجھے ایسا حکم ہو تو [illegible] بھی ہے؟"

بیوی: "اے ہے بات تو سنو، اگر میرا گھر ہے تو تمھارا کیسا گھر ہے اور سچ پوچھو تو میرا نہ تمھارا، گھر تو گھر والے کا ہے؟"

میں: "جی نہیں، [illegible] مجھے آپ کے گھر والے کو [illegible] بھی ہے اور آپ کی بھی؟"

بیوی: "تم اکیلی بیٹھی رہتی ہو۔ آخر ہم بھی آدمی ہیں۔ ادھر کیوں نہیں چلی آتیں۔ ہاں میاں کا حکم نہ ہو گا؟"

میں: "میاں کے حکم کی تو کچھ ایسی تابع نہیں ہوں۔ ہاں آپ کی اجازت کی ضرورت تھی وہ حاصل ہو گئی۔ اب حاضر ہوں گی۔"

بیوی: "اچھا تو چلو۔"

میں: "چلیے۔"

مکان میں جا کے جو دیکھتی ہوں [illegible] سب کچھ تھا [illegible] دیگ [illegible] پتیلیاں، لوٹے [illegible] پلنگ [illegible] چوکیاں، فرش [illegible] نہیں۔ انگنائی میں جا بجا کوڑا پڑا ہے [illegible] باورچی خانہ میں [illegible] بلیاں [illegible] کر رہی ہیں۔ [illegible] بیوی نے [illegible] رکھ دیا [illegible] پلنگ پر [illegible] کہ [illegible]۔

[illegible] ایک [illegible] بیوی نے [illegible] دیا [illegible] کی ایک بڑھیا آ نکلی [illegible] بیٹھ گئی۔ [illegible] سے پوچھا۔

"یہ کون ہیں؟"

بیوی: "اب تمھیں کیا بتاؤں۔"

میں چپکی رہی اور بڑھیا (اکبر علی خاں کی بیوی سے)

بڑھیا: "ادی! جیسے میں جانتی نہیں۔"

میں: "بڑی بی۔ پھر جانتی ہو تو اس کا پوچھنا کیا۔"

بڑھیا: "ادی بی۔ تم سے یہ بات نہیں کرتی۔ میں تو اپنی بہو صاحب سے پوچھتی ہوں میرا منہ تم سے بات کرنے کے لائق نہیں۔ تم بڑی آدمی ہو۔"

میں بڑھیا کا منھ دیکھ کے چپ ہو رہی۔

بیوی: "ادی بڑھیا! ذرا سی بات میں جھاڑ کا کانٹا ہو گئی۔"

بڑھیا: (بیوی سے) تم تو اس طرح بات چھپاتی ہو جیسے ہم دشمن ہیں اے ہم تو ان کی بھلائی کے لئے بات کرتے ہیں۔ یہ ہمیں سے الٹے بگڑتی ہیں۔"

بیوی: "بس اپنی خیر خواہی رہنے دو۔ بوا تم کسی کے گھر کی اجارہ دار ہو۔"

بڑھیا: "ہمارا اجارہ کیوں ہونے لگا۔ اب جو نئی نئی آتی جائیں گی ان کا اجارہ ہوتا جائے گا۔"

بڑھیا کی اس بات پر مجھے بیساختہ ہنسی آ گئی منھ پھیر کے ہنسنے لگی۔

بیوی: "کیوں نہیں۔ اے تم میری سوتن ہو (میری طرف مخاطب ہو کے) اے سن لو خاں صاحب کی بیٹی یہی ہیں۔ لو بیوی، تم اصل میں ان کی سوت ہو میں تو ان کے بعد آئی ہوں۔"

بڑھیا: "ہوں۔ اپنے ہوتے سوتوں کی مجھے یہ باتیں نہیں اچھی لگتیں۔ منھ در منھ گالیاں دیتی ہو۔ موئی کسبیوں خانگیوں کی صحبت میں اور کیا سیکھو گی یہی تو سیکھو گی۔"

تو اتنے دن مجھے آئے ہوئے بڑی بیگم صاحب (اکبر علی خاں کی والدہ) نے آدھی بات مجھے نہیں کہی۔ بہو صاحب گنوتی ہی ہیں کہ محلہ کی بڑھیوں کو گالیاں دیتی ہیں۔

بیوی: (غصہ ہو کر) میں نے تم سے کہہ دیا لڈن کی ماں تم آج سے میرے پاس نہ آنا۔ وہیں بڑی بیگم کے پاس جا کے بیٹھا کرو۔

مجھے بہت غصہ تھا مگر میں نے دیکھا کہ بے تکی عورت ہے۔ اس کے منہ کون لگے ضبط کر کے چپکی ہو رہی۔

بڑھیا: "ہماری بلا آتی ہے۔"

بیوی: "موئی کی شامتیں آئی ہیں۔ یہ ادبدا کر کیا بک رہی ہے۔"

بڑھیا: "تو کیا تمھارے دبیل ہیں۔ کچھ کسی کے لینے دینے میں گھڑی بھر نکل آتے تھے۔ تم ہم سے ہم تم سے بات کرتے تھے۔ نہ آئیں گے"

بیوی: "یہ ہرگز نہ آنا"

بڑھیا: "اس ضد پر تو ضرور آئیں گے۔ دیکھیں تو تم ہمارا کیا بناتی ہو"

بیوی: "آؤ گی تو اتنی جوتیاں لگائیں گے کہ سر میں ایک بال نہ رہے گا"

بڑھیا: "کیا تاکت کیا مجال سنہ بنواؤ۔ جوتیاں ماریں گی بچاری"

بیوی: "ہے اٹکو یہاں سے ٹلو۔ نہیں تو لیتی ہوں ہاتھ میں جوتی"

بڑھیا۔ (ایک ٹھٹھا لگا کر) آج تو ہم جوتیاں کھا کے جائیں گے۔ مارو بڑے باپ کی بیٹی ہو"

باپ کے نام پر بیوی کو غصہ آگیا۔ چہرہ سرخ ہوگیا۔ تھر تھر کانپنے لگیں۔

بیوی: "دور ہو یہاں سے کہتی ہوں"

بڑھیا: "اب تو ہم جوتیاں کھا ہی کے جائیں گے"

بیوی۔ (مجھ سے مخاطب ہو کے) دیکھو یہ مجھے ضد دلا رہی ہے۔ بے مارے موئی کو نہ چھوڑوں گی"

میں: "بیگم! جانے بھی دیجئے۔ موئی بے تکی ہے"

بڑھیا: "مجھ سے تو کچھ نہ بولنا الزادی۔ تجھے تو کچا ہی کھا جاؤں گی"

بیوی: "(جوتی پیر سے لیکر) ایک۔ دو۔ تین۔ اب راضی ہوئیں؟"

میں۔ "بیگم جانے دیجئے (ہاتھ سے جوتی چھین لی)

بیوی: "نہیں تم نہ بولو۔ موئی کا کچومر نکال ڈالوں گی"

بڑھیا: "اور مارو"

بیوی نے دوسرے پیر سے جوتی اتار کر پانچ چار اور لگائیں۔ اب تو بڑھیا نے زمین پر پاؤں پھیلا دیے اور زمین پہ دوہتڑ مارنا شروع کئے۔ ہے ہے! ہے ہے مجھے جوتیاں ماریں! اب تو دل ٹھنڈا ہوا۔ سوت کی جلن بجھر اتاری ہائے مارا۔ ہائے مارا چلا چلا کے دوہائی دینا شروع کی۔ اور چیخانے سے بوا امیرن اٹھ کے دوڑیں بڑی بیگم صاحب اپنے دالان سے چلی آئیں۔ ایک آفت برپا ہوگئی۔ بڑی بیگم صاحب کو آتے دیکھ کر اور بھی دوہتڑ مارنا شروع کئے: "اس بڑھاپے میں مجھے جوتیاں کھلوائیں"

بیگم صاحب: "اے ہے مجھے کیا معلوم کہ تم پر جوتیاں پڑ رہی ہیں نہیں تو آ کے بچا لیتی آخر بات کیا ہوئی؟"

بڑھیا: (میری طرف اشارہ کر کے) "اس ماں زادی نے مار کھلوائی۔ اے ہے اس نے مار کھلوائی۔"

میں ٹھگ ماری سی ہو گئی۔ بیگم صاحب سے مجھ سے اس وقت سامنا ہوا ہے کچھ کہتے نہیں بن پڑتا۔

بیوی: "پھر ان کا نام لیے جاتی ہے۔"

بڑھیا: "ہم تو نام لیں گے۔ تم کیا کرتی ہو۔"

بیگم صاحب: "آخر ہوا کیا تھا؟"

بڑھیا: "بجو! نگوڑ ماری نے اتنا پوچھا کہ یہ کون ہیں۔ سے بھلا کیا گناہ کیا؟"

بیوی: "تم تو کہتی تھیں میں جانتی ہوں۔ پھر پوچھنے سے کیا مطلب تھا؟"

بڑھیا: "کیا مطلب تھا۔ اچھا مطلب بتا دوں گی۔ تبھی جو اپنا عوض نہ لے لوں۔ تم نے مارا تو ہے۔"

بیگم: "چل خصم تو کیا بدلا لے گی۔ ذرا کسی بھلا سے یہ نہ بھولنا۔"

بڑھیا: "میں تم سے کچھ نہیں کہتی تم جو چاہے کہہ لو تمھارا حق ہے۔"

بیگم: "تیرے والی کی ایسی تیسی نکل یہاں سے۔"

بڑھیا: "لو یہ بھی نکالتی ہوئی آئیں۔ اچھا جاتے ہیں" یہ کہہ کے بڑھیا اٹھ کھڑی ہوئی۔ لٹھیا جھاڑ جھوڑ بڑبڑاتی ہوئی "بڑی نکالنے والی۔ جاتے ہیں جاتے ہیں دیکھیں تو کیونکر نہیں آنے دیتیں۔"

بیگم صاحب: "(بہو سے) آخر تم اس موئی چڑیل کے منہ کیوں لگیں؟"

بیوی: "اماں جان! آپ کے سر کی قسم میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔ وہ تو آپ ہی جیسے کوئی کھڑی کھاٹ پر سے منہ کے آئی تھی۔ سیکڑوں باتیں تو ان بیچاری کو سنا کے رکھ دیں۔"

بیگم صاحب میرے ذکر پر کچھ ناک بھوں چڑھا کے چپ ہو گئیں۔ مجھ کو اس بڑھیا کی بات تو ناگوار نہیں ہوئی کیونکہ میں اسے دیوانی سمجھے ہوئے تھی۔ مگر ہاں بیگم صاحب کی بے اعتنائی سے سخت صدمہ ہوا۔ وہ ابھی وہیں کھڑی تھیں کہ میں اُٹھ کے کھڑکی کے

پاس چلی آئی اور اپنے مکان میں آن بیٹھی۔

بیگم صاحب: "میرے پیٹھ آنے کے بعد ہو سے اوری بٹیا! تم نے تو اس بڑھیا گوری کو خواہ مخواہ پیٹ ڈالا۔ اور پھر موئی ایک شغل بازاری کے لیے۔ آخر تمہیں اس کی بڑ کیا ایسا کیا اندر رکھی تھی۔"

امیرن: "دیکھا! مکو جانے دیجئے۔ تمہارا اس نے بدزبانی کی تھی۔ ایسی حرام زادی بھی یہ پوچھے کہ کسی خانگیوں سے میل جول کیا اور وہ تھی تو جس سے میاں سے آشنائی ہو ابھی مرد اسکے سر پہ جوتا دیتے تو اس کو ماں ست ڈالتا اور خود ذبح کر کے باہ کے بلا لیتی۔"

بیگم: "دا امیرن سے، اس کی مجال تھی گھر میں سے آتا۔ ہم نہیں بیٹھے ہیں۔ باہر جس کا جی چاہے آئے۔ گھر میں آنے کا کیا کام ہے۔ اسے تو ان سے اکبر علی خاں کے باپ (بڑے) برسوں حسین بانو سے ملاقات رہی۔ اس نے کیسی منتیں کیں ہیں۔ اسے نہیں مانی بھری بوا امیرن! میں یہ سوچی کہ آج کو جوان جوان عورت گھر میں تیرے بیٹھی آ بیٹھی کل میاں گھر میں بٹھالیں گے۔ تو یہ بھائی بند ہوں گے کون روا رکھے گا۔ اپنی پت اپنے ہاتھ ہے۔ یہ آج کل کی رنڈیوں کو اپنے آگے اندیشے کا خیال نہیں۔"

امیرن: "سچ ہے بیگم صاحب۔ اول تو مونڈھے پر بیٹھنے والوں کا گھر برباد ہوتا ہی کیا ہے۔ اگلے لوگ کہتے تھے ایک دو بھی مرد کو گھر میں بلا لے تو پھر عورتوں کو تو بلا سمجھو۔"

بیگم: "بوا! بات یہ ہے کہ مرد اگر بلا بھی آئے گا تو کیا وہ عورتوں میں گھس کے بیٹھے گا۔ ان کی بات یہ ہے کہ کبوتر کے دنوں میں برسوں تین خان ہمارے گھر میں بیٹھے رہے۔ پھر بوا ایک گھر کا رستہ تھا۔ کیا مجال ہے کہ انھوں نے میرا آنچل تک دیکھا ہو۔ بات کیا ہے، دن رات بس چکنی میں کٹی بیٹھی رہتی تھی۔ یا ماما اصیلوں سے اشاروں میں باتیں کرتی تھی۔"

امیرن: "ایک تو یہ کہ تم نمک کی کھانے والی بیوی کی صاحبزادی۔ جب ایسوں کے پاس بیٹھوگی کہاں تک بچاؤ ہوگا۔ کہیں اس نے گجھے جوتے کی ٹھیوں میں ہاتھ ڈال دیا۔ تمہاری آنکھ بچا کے گلوری میں پانی پی لیا۔ دوسرے موئی کٹنیاں ان کا اعتبار ہی کیا۔ یہ کٹنیاں نامرادے میں بھری ہوتی ہیں۔ ان کی تو پرچھائیں سے بچنا چاہئے۔"

بیگم صاحب: "ایک بات بھی باتوں کا ہو اتنا ہونا چاہئے۔ پرچھائیں ... امیرن ..."

ٹوٹکے۔ بوا کون کہے ان کو تو سمجھ نہیں اور جو کچھ کھلا ہی دے۔ مرزا محمد علی کی بہو کو سوت نے جونک کھلا دی۔ دین و دنیا سے جاتی رہی نہ آل کی نہ اولاد کی۔"

امیرن: "جی ہاں۔ اے لو کیا میں جانتی نہیں ہوں؟"

بیگم: "بوا یہ سوتاپے کا رشتہ ایسا ہے کہ اس میں الگ تھلگ رہے اچھا۔ یوں تو الگ تھلگ رہتے پر بھی جان نہیں بچتی۔ مجھی کو دیکھو اس موئی ٹکے کی کہاری نے کیا کوئی بات اٹھا رکھی۔ دعا۔ تعویذ۔ گنڈے۔ کیسے کیسے نقش میرے سرہانے سے نکلتے تھے۔"

امیرن: "پھر اس کو اپنے گھر میں کیوں آنے دیا؟"

بیگم: "اے بوا! نوکر تھی۔ میں کیا جانتی تھی کہ اس سے میاں سے لگا لگا ہے۔ جس دن معلوم ہو گیا میں نے کھڑے کھڑے نکال دیا۔

امیرن: "مگر بیگم! ایک بات کہوں خدا لگتی۔ آپ کی خدمت بہت کی۔"

بیگم: "یہ خوب کہی میاں کو چھینا تھا۔ اب کیا اس سے بھی گئی گذری۔ اس بڑھیا کو کیا سمجھتی ہو۔ اس سے بھی کسی زمانے میں میاں سے تھی۔"

امیرن: "(قہقہہ لگا کر) نہیں بیگم صاحب۔"

بیگم: "کیا میں جھوٹ کہوں گی۔ جب ہی تو وہ دہراتی تھی کہ اپنا عوض لے لوں گی۔"

امیرن: "بہو صاحب! تو پھر آپ کو نہیں چاہیے تھا سسرے کی حرم کو اتنی جوتیاں...."

بیگم: "بوا! ان لوگوں کو یہ لحاظ کہاں۔ سچ کہوں مجھے بھی یہ بات ناگوار ہوئی ان کے منہ پر کہہ دوں۔ آج کو موئی نکاحی کے جیتے سسرے کی حرم کے جوتیاں ماریں کل اس کو ماریں گی۔"

امیرن: "نہیں خدا نہ کرے مگر ہاں بات کہنے ہی میں آتی ہے۔ ان دونوں بڑھیوں نے بہو صاحب بیچاری کو ایسے کوسنے دیے کہ آخر کو بیچاری چیخیں مار مار کے رونے لگی۔ میرا یہ حال تھا کہ انگاروں پر لوٹ رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ دونوں بڑھیوں کا منہ نوچ لوں۔"

رسوا: "ہائیں ہائیں! یہ غصہ!"

رہ گئے گا ذرا طبیعت کو   کہیں ایسا نہ ہو کہ خفت ہو   نیت

امراؤ: "مرزا صاحب! غصے کی بات ہی تھی۔ ایک انسان کو اتنا ذلیل سمجھنا انتہا

سے بعید ہے۔"

رسوا: "میرے نزدیک تو کوئی بات نہ تھی جس پر آپ کو اتنا غصہ آیا۔ وہ دونوں بڑھیاں ٹھیک کہتی تھیں اور لڈن کی ماں بھی بیچاری ناحق پٹی۔ حق تو یوں ہے کہ اب آپ چاہے بُرا مانیں یا چاہے بھلا۔"

امراؤ: "واہ مرزا صاحب آپ خوب انصاف کرتے ہیں۔"

رسوا: "جی ہاں میرے نزدیک انصاف یہی ہے۔ اس معاملے میں آپ بھی ایک حد تک بے قصور تھیں۔ سارا قصور اکبر علی کی بیوی کا تھا۔"

امراؤ: "ان بیچاری کا کیا قصور تھا؟"

رسوا: "کیا قصور تھا؟ اگر میری بیوی ایسا کرتی تو فوراً ڈولی منگوا کے میکے بھجوا دیتا اور چھ مہینے تک صورت نہ دیکھتا۔ اچھا ایک بات پوچھتے ہیں۔ اکبر علی خاں نے جب یہ واردات سنی تو کیا کہا؟"

امراؤ: "لڈن کی ماں پر خوب چیخے، خوب چلائے۔ کہہ دیا خبردار! یہ ڈائن ہمارے گھر میں نہ آنے پائے۔ کئی مہینے تک اس کا آنا جانا موقوف رہا۔ جب بڑے خان صاحب آئے تو وہ پھر آنے لگی۔ یہ قصہ ان کے آگے چھیڑا گیا تھا۔ وہ الٹے اکبر علی خاں کی بیوی پر خفا ہوئے۔"

رسوا: "بڈھے کی عقل صحیح تھی؟"

امراؤ: "صحیح تھی یا سٹھیا گئے تھے، ذرا لڈن کی ماں پاؤں دبایا کرتی تھی اسی سے اسی کی پر یک لیتے تھے۔ کیوں نہ پر جک لیتے۔ لڈن کی ماں ان کی پرانی آشنا تھی۔"

رسوا: "پھر آپ ہی قائل ہو جیئے یہ عین وضعداری تھی۔ اچھا اب ایک بات اور بتا دیجئے۔ لڈن کی ماں جوانی میں کوئی رنڈی تھی، یا گرہست، اور بوا امیرن کون تھیں؟"

امراؤ: "لڈن کی ماں موئی دھنیانی تھی۔ جوانی میں خراب ہو گئی تھی۔ بوا امیرن ایک دیہاتی عورت تھی، انکا مکان سنڈیلہ کے ضلع میں تھا۔ ایک جوان بیٹا تھا وہ بھی بڑے خاں صاحب کے پاس نوکر تھا۔ ایک لڑکی تھی وہ کہیں باہر بیاہی ہوئی تھی۔"

رسوا: "بوا امیرن سے اور بڑے خاں صاحب سے تو کوئی تعلق نہ تھا؟"

امراؤ: "نہ نہ، خدا کو جواب دینا ہے۔ امیرن بڑی نیک عورت تھی۔ سارا محلہ کہتا

تھا کہ وہ نوابی میں رانڈ ہو کر میرے یہاں نوکری کو آئی تھی۔ اس دن سے کسی نے اس کو برا نہیں دیکھا۔"

رسوا: "بہرحال یہ واقعات آپ کے بیان سے مجھ کو معلوم ہو گئے۔ اب پوچھئے آپ کیا پوچھتی ہیں؟"

امراؤ: "یہ تو کیا کوئی مقدمہ آپ فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں؟"

رسوا: "بہت بڑا مقدمہ ہے۔"

بات یہ ہے کہ عورتیں تین قسم کی ہوتی ہیں (۱) نیک بختیں (۲) خرابیں (۳) بازاریاں اور دوسرے قسم کی عورتیں بھی دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ جو چوری چھپے عیب کرتی ہیں۔ دوسری وہ جو کھلم کھلا بدکاری پر تیار ہو جاتی ہیں۔ نیک بختوں کے ساتھ معرفت وہی عورتیں لی گئی ہیں جو بدنام نہ ہو گئی ہوں۔ کیا تمہیں اتنی سمجھ نہیں ہے کہ وہ بیچاریاں جو تمام عمر چار دیواریوں میں قید رہتی ہیں ہزاروں قسم کی مصیبتیں اٹھاتی ہیں اچھے وقت کے تو سب ساتھی ہوتے ہیں مگر برے وقت میں بیچاریاں ساتھ دیتی ہیں۔

جس زمانے میں ان کے شوہر جوان ہوتے ہیں، دولت پاس ہوتی ہے تو اکثر باہر والیاں مزے اڑاتی ہیں مگر ضعیفی اور بڑھاپے کے زمانے میں کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ ان وقتوں میں وہی طرح طرح کی تکلیفیں اٹھاتی ہیں اور بڈھوں کی جان کو صبر کرتی ہیں۔ پھر کیا انھیں اس کا کوئی فخر نہ ہوگا۔ یہی فخر اس کا باعث ہوتا ہے کہ وہ خراب عورتوں کو بہت ہی بری نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ انتہا کا ذلیل سمجھتی ہیں۔ توبہ استغفار سے خدا گناہ معاف کر دیتا ہے مگر یہ عورتیں کبھی نہیں معاف کرتیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ کوئی عورت کیسی ہی خوب صورت، خوب سیرت اور خوش سلیقہ کیوں نہ ہو، بیوقوف مرد بازاریوں پر جو ان سے صورت اور دوسری صفتوں میں بدرجہا بدتر ہیں فریفتہ ہو کر انھیں عارضی طور سے یا مدت العمر کے لئے ترک کر دیتے ہیں۔ اس سے ان کو گمان کیا بلکہ یقین ہے کہ یہ کسی نہ کسی قسم کا جادو ٹونا ایسا کر دیتی ہیں جس سے مرد کی عقل میں فتور آ جاتا ہے۔ یہ بھی ان کی ایک قسم کی نیکی ہے اس لئے کہ وہ اس حال میں اپنے مردوں کو الزام نہیں دیتیں بلکہ بدکار عورتوں ہی کو مجرم ٹھہراتی ہیں۔ اس سے زیادہ ان کی محبت کا اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔

امراؤ: "یہ تو سب صحیح ہے مگر مرد کیوں ایسے بیوقوف بن جاتے ہیں۔"

رسوا: "اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے مزاج میں جدّت پسندی ہے۔ ایک حالت میں زندگی بسر کرنے سے خواہ وہ کیسی ہی عمدہ کیوں نہ ہو طبیعت اکتا جاتی ہے وہ چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح کا تغیر اس کی موجودہ زندگی میں پیدا ہو۔ شاہدان بازاری کے ساتھ معاشرت کرنے میں اسے ایک قسم کی نئی لذت ملتی ہے، جو کبھی اس کے خیال میں نہ تھی۔ یہاں بھی ایک ہی کے تعارف پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ جدت کی تلاش میں روز نئے گھروں پر پہنچتا ہے اور نئے گھر دیکھتا پھرتا ہے۔"

امراؤ: "مگر سب مرد ایسے نہیں ہیں۔"

رسوا۔ ہاں! اس کی وجہ یہ ہے کہ حسن معاشرت کے قانون نے اس مرد کو معیوب قرار دیا ہے۔ جو شخص ایسا کرتا ہے اس کے عزیز و اقارب، دوست احباب ملامت کرتے ہیں۔ اس خوف سے اکثر جرأت نہیں ہوتی مگر جب اخوان الشیاطین کی صحبت میں بیٹھنے کا اتفاق ہوتا ہے وہ طرح طرح کی لذتوں کا ذکر کر کے ایک عجیب قسم کا شوق ان کی طبیعت میں پیدا کر دیتے ہیں۔ اس لئے وہ خوف ان کے دل سے نکل جاتا ہے۔ آپ کو اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہوا ہو گا کہ جو لوگ پہلے پہل رنڈی کے مکان پر جاتے ہیں ان کو اخفائے راز کا کس قدر خیال ہوتا ہے۔ کوئی دیکھتا نہ ہو، کوئی سن نہ لے۔ دو آدمیوں کے سامنے تو بولنے کا کیا ذکر تخلیہ میں بھی منھ سے بات نہیں نکلتی مگر رفتہ رفتہ یہ حالت تو بالکل زائل ہو جاتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ چند ہی روز میں پورے بے غیرت ہو جایا کرتے ہیں پھر کیا ہے۔ دن دہاڑے سر چوک رنڈیوں کے کمروں پر کھٹ کھٹ کر کے چڑھ جاتے ہیں۔ گاڑی میں کھڑکیاں کھول کر ساتھ بیٹھ کر سیر کرنا۔ ہاتھ میں ہاتھ دے کے میلے تماشوں میں لئے پھرنا ان سب باتوں کو فخر سمجھنے لگتے ہیں۔"

امراؤ۔ یہ تو صحیح ہے مگر شہروں میں ان باتوں کو چنداں معیوب نہیں سمجھتے۔

رسوا: "خصوصاً دہلی اور لکھنؤ میں یہی ان شہروں کی تباہی اور بربادی کا باعث ہوا دیہات اور قصبات میں ایسے شریر لوگوں کی صحبت کم ملتی ہے جو نوجوانوں کو ان بدکاریوں پر آمادہ کریں۔ دوسرے وہاں کی رنڈیوں کو اس قدر اقتدار حاصل نہیں ہے اس لئے کہ وہ رؤسا اور زمینداروں کی مطیع فرمان ہوتی ہیں اور بہت ڈرتی ہیں کیونکہ ان کا آذوقہ بلکہ زندگی ان کے دست قدرت میں ہے اس لئے انکی اولاد سے

بہت چوری چھپے ملتی ہیں اور شہروں میں تو آزادی ہے کون کس کا دباؤ مانتا ہے اسی کا یہ نتیجہ ہے۔"

امراؤ:"مگر دیہاتی جب بگڑتے ہیں تو حد سے زیادہ بگڑ جاتے ہیں۔ مثلاً میاں ارشاد علی خاں کا واقعہ آپ سن چکے ہیں۔

رسوا:"اس کا یہ سبب ہے کہ وہ ان لذتوں سے بالکل نابلد ہوتے ہیں۔ جب ان کو اس کا چسکا پڑتا ہے تو وہ اس کی حد سے زیادہ قدر کرتے ہیں اور اہل شہر کچھ نہ کچھ آگاہ ہوتے ہیں اور اس لئے انکو زیادہ شغف اور انہماک نہیں ہوتا۔

رسوا:"ہاں! وہ آپکی نوچی کیا ہوئی؟ اے ہے بھلا سا نام ہے۔"

امراؤ:"آبادی"

رسوا:"آبادی کی صورت تو اچھی تھی۔ میں نے اس وقت دیکھا تھا جب اُس کا سن دس بارہ برس کا تھا۔ جوانی میں تو اور نکھر گئی ہوگی۔"

امراؤ:"مرزا صاحب! آپ کو خوب یاد ہے۔

رسوا:"یاد کو کیا چاہئے واقع میں بہت قطع دار عورت ہوگی۔ ہم بھی اسی نظر سے دیکھتے تھے کہ کبھی تو جوان ہوگی۔

امراؤ:"تو یہ کہئیے آپ بھی بی آبادی کے اُمیدواروں میں تھے۔"

رسوا:"سنو امراؤ جان، میری ایک بات یاد رکھنا۔ جہاں کوئی حسین عورت نظر پڑے مجھے ضرور یاد کرلینا۔ اگر ممکن ہو تو اُمیدواروں میں نام لکھوا دینا اور جو خدانخواستہ میں مرجاؤں تو میرے نام پر فاتحہ دیدینا۔"

امراؤ۔"اور اگر کوئی مرد حسین نظر آوے۔؟"

رسوا:"اپنا نام امیدواروں میں اور میرا نام اس کی بہن کے امیدواروں میں لکھوا دینا بشرطیکہ شرعاً ممنوع نہ ہو۔"

امراؤ:"کیا خوب! شرع کو کہاں دخل دیا ہے۔"

رسوا:"شرع کا دخل کہاں نہیں ہے خصوصاً ہماری شرع جس میں کوئی فروگذاشت نہیں کی گئی ہے۔"

امراؤ:"سیدھی سی ایک بات کیوں نہیں کہہ دیتے۔ ع

شرعاً تو جانتے ہیں عرفاً درست ہے

رسوا: "یہ اور موقعوں پر کہا جاتا ہے امراؤ جان میری زندگی کا ایک اصول ہے۔ نیک بخت عورت کو میں اپنی ماں بہن کے برابر سمجھتا ہوں خواہ وہ کسی قوم وملت کی کیوں نہ ہوں اور ایسی حرکتوں سے مجھے سخت صدمہ پہنچتا ہے جو اس کی پارسائی میں خلل انداز ہوں۔ جو لوگ اس کو ورغلانے یا بدکار بنانے کی کوشش کرتے ہیں میری رائے میں قابل گولی مار دینے کے ہیں۔ مگر فیاض عورتوں کے فیض سے مستفید ہونا میرے نزدیک کوئی گناہ نہیں۔"

امراؤ: "سبحان اللہ!"

رسوا: "خیر اب اس فضول بات کو رہنے دیجئے آبادی جان کا حال کہیے۔"

امراؤ: "مرزا صاحب! اگر آپ اس کو جوانی کے عالم میں دیکھتے تو یہ شعر ضرور آپ کی زبان پر ہوتا ۔

جواں ہوتے ہی وہ تو اور ہی کچھ ہو گئے ایدل کہاں کی پاکبازی ہم بھی اب نیت بدلتے ہیں

جوان ہو کے اس نے وہ صورت شکل نکالی تھی کہ سو پچاس رنڈیوں میں ایک تھی۔

رسوا: "اب کیا ہوئی خدا کے لئے جلدی کہیے۔ مر تو نہیں گئی۔ آخر آفت کیا ہوئی جو آپ ایسی مایوسی کے کلمات کہتی ہیں۔"

امراؤ: "ہم سے گئی جہاں سے گئی۔"

رسوا: "آخر ہے اب کہاں؟"

امراؤ: "اسپتال میں ہے اور کہاں ہے۔"

رسوا: "یہ کہیے گل جوانی شگفت۔"

امراؤ: "جی ماشاء اللہ سے خوب پھولیں پھلیں۔ صورت بگڑ گئی رنگت اُلٹا توا ہو گئی نخ خشکہ سے کریم ہو گئے۔ اب جان کے لالے پڑے ہیں۔"

رسوا: "یہ ہوا کیا تھا؟"

امراؤ: "اسے ہوا کیا تھا، موئی لونڈے گھری سفلی پھوری۔ میں نے بہت چاہا کہ آدمی بنے مگر نہ بنی۔ میں نے کیا نہیں کیا۔ استاد جی کو نوکر رکھا۔ تعلیم دینا شروع کیا مگر اس کا دل ایسی باتوں میں کب لگتا تھا۔ جب سے جوان ہوئی میں نے گویا علیحدہ کر دیا تھا۔ شہر کے چند ذات شریف آ کے بیٹھنے لگے۔ دن رات کا لم گلوچ۔ دھینگا مشتی جوتم جاتا۔ ایک آفت برپا رہتی تھی۔ ناک میں دم ہو گیا تھا۔ کسی پر بند نہیں جو آیا وارد۔ میں نے مارا پیٹا سمجھایا مگر وہ کب سنتی تھی۔ بچپنے ہی سے

اس کی نگاہ بدبختی اس زمانے میں بوا حسینی کا نواسہ جمن آیا کرتا تھا۔ اس سے کھیلا کرتی تھی۔ میں نے یہ خیال کیا۔ بچہ ہے کھیلنے دو۔ آخر کچھ ایسی باتیں آنکھ سے دیکھیں کہ جمن کی آمد و رفت موقوف ہوئی۔ ایک صاحب میرے پاس تشریف لایا کرتے تھے۔ ذرا خوش گلو تھے۔ میں گوایا کرتی تھی۔ ان سے چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ وہ شریف خاندان تو تھے مگر طبیعت پاجی تھی۔ نہ میرا لحاظ کیا نہ اپنی حیثیت دیکھی ایک دن سرِ شام کیا دیکھتی ہوں۔ ڈیوڑھی میں بی آبادی سے باتیں ہو رہی ہیں۔"

چھٹن صاحب: "اری میں تو تیری صورت کا عاشق ہوں۔ ہائے آبادی کیا کروں، امراؤ جان سے ڈرتا ہوں۔"

آبادی۔ "ٹھو ایسی باتیں مجھ سے نہ کیا کرو۔ ڈر کاہے کا۔"

چھٹن نے آبادی کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا۔ ظالم کیا پیاری پیاری صورت ہے۔"

آبادی: "پھر تمھیں کیا؟"

چھٹن صاحب: "(ایک بوسہ لیکے) ہمیں کیا۔ جان جاتی ہے۔ مرتے ہیں۔"

آبادی: "موئے چار آنے تو دے نہیں جاتے مرتے ہیں۔ میاں مرتے سب کو دیکھا جنازہ کسی کا کبھی نہیں دیکھا۔"

چھٹن: "چار آنے! جان حاضر ہے۔

آبادی: "نگوڑی جان کو میں لے کے کیا کروں گی۔"

چھٹن: "تو ہماری جان کسی کام ہی کی نہیں۔"

آبادی: "لے اب باتیں نہ بناؤ۔ چونی جیب میں پڑی ہو تو دیتے جاؤ۔"

چھٹن: "واللہ! اماں کی تنخواہ نہیں بٹی۔ پرسوں ضرور ضرور لیتا آؤنگا۔"

آبادی: "اچھا تو اب جان چھوڑو جاؤ۔"

چھٹن۔ "اچھا تو ایک بوسہ تو اور دیدو۔"

آبادی کو چھٹن نے گلے لگایا۔ آبادی نے انکی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ کہیں اتفاق سے تین پیسے جیب میں پڑے ہوئے تھے، نکال لئے۔

چھٹن: "تمھیں ہمارے سر کی قسم یہ پیسے نہ لینا باجی نے رنگ کی پڑیاں اور مسی منگائی ہے۔"

آبادی: "تمھارے سر کی قسم۔ میں تو نہ دوں گی۔"

چھٹن۔ آخر کیا کروگی پرسوں چونی لے لینا۔"

آبادی: "واہ! خاگینہ لیں گے۔"

چھٹن: "تین پیسے کا فاگینہ۔ اچھا ایک پیسہ لیلو"

آبادی: "تین پیسے کا فاگینہ کچھ بہت ہوا۔ تنگوڑا بہت دن سے جی چاہتا ہے۔ بوی لینے نہیں دیتیں کہتی ہیں پیٹ میں درد ہوگا۔ میں تو ایک دن چھپا کے ایک آنے کا فاگینہ کھا گئی کچھ بھی نہیں ہوا۔"

میں نے دل میں کہا کیوں نہ ہو موئی کال کی ماری بلانوش۔ ہم تو ذرا سا بھی کھالیں تو بدہضمی ہو جائے۔

رسوا: "کیا اسے کال میں لیا تھا؟"

امراؤ: جی ہاں! ایک روپیہ کو ماں بیچ گئی تھی۔ تین دن کے فاقے سے تھی میں نے روٹی کھلائی اور ایک روپیہ دیا۔ مرزا صاحب مجھے بڑا ترس معلوم ہوا۔ میں نے تو کہا تھا۔ میرے پاس رہ مگر نہ رہی۔

رسوا: "کمبخت کبھی پھر بھی آئی تھی؟"

امراؤ۔ جی! کئی دفعہ آئی۔ لڑکی کو دیکھ کے بہت خوش ہوئی۔ مجھ کو دعائیں دیتی تھی سال میں دو ایک مرتبہ آجایا کرتی تھی۔ مجھ سے بھی جو کچھ ہوسکتا تھا سلوک کرتی تھی۔ اب کئی برس سے نہیں آئی۔ خدا جانے مرگئی یا جیتی ہے۔

رسوا: "ذات کیا تھی؟"

امراؤ: "پاسن"

رسوا: "اچھا تو وہ قصہ تو رہ گیا چھٹن نے چونی دی یا نہیں دی"

امراؤ: "میری جانے بلا چھٹن کے جانے کے بعد میں نے موئی کو خوب کھلا۔ پیسے چھین کر چوک میں اچھال دیے"

میرے کمرے کے برابر ایک اور چھوٹا سا کمرہ تھا کوئی دو روپئے مہینہ کرائے کا اس میں ایک رنڈی آکے رہی تھی حسنا ابھی جوان تھی اس کی اور آبادی کی برگت خوب ملی۔ دن بھر بیٹھا رہا کرتی تھی۔ ساری خصلتیں حسنا کی اس نے اختیار کرلیں۔

جیسی وہ رنڈی تھی ویسے ہی اس کے آشنا۔ ایک آیا یا تو کبھی پوریاں تیل کی لئے چلا آتا ہے۔ دوسرا پچاس آم دو آنے سیکڑہ کے لیتا آیا کسی سے دو گز ٹینوں کی فرمائش ہے۔ کسی سے مخملی بوٹ کا چونگا ہے۔ میلے تماشے میں دو چار گرگے ساتھ ہیں۔ بڑے بڑے صافے باندھے ہوئے۔ کفت دار کرتے یا انگرکھے پاس جست کوئی دھوتی باندھے ہے کوئی جست کھٹنا ڈانٹے ہے۔ ہاتھ میں لٹھ ہے گلے میں ہار پڑے ہوئے۔ بی حسنا ٹھمک ٹھمک انکے ساتھ چل رہی ہیں۔ ہرن والی سرا میں ایک بوتل ٹھرے کی اڑی۔ وہاں سے چلے تو جھومتے جھامتے لڑکھڑاتے، ناچتے گاتے۔

بی حنا کبھی اس کی بغل میں تھیں ابھی اس کے گلے میں ہاتھ۔ سر راہ گالم گلوچ نوچم گھسوٹ جوتم جاتا ہو رہا ہے۔ اس حالت میں دو ایک تو رستے ہی میں گر پڑے۔ تین چار میلے تک پہنچے، وہاں چرس پر دم پڑے۔ ان میں سے جو کوئی ہوشیار رہا اس نے بی حنا کو گانٹھ لیا اور یاروں کو دھتا بتائی، اپنے گھر لے گیا۔ انھیں کے کمرے پر آ کے ٹھہرا اور یار جب میلے سے پلٹ کے آئے۔ کمرے کے نیچے کھڑے چیخ رہے ہیں اور گالیاں دے رہے ہیں اور ڈھیلے مار رہے ہیں۔ بی حنا اول تو کمرے میں نہیں اور ہیں بھی تو بولیں کیوں۔ اتنے میں کوئی برقنداز چلا آیا۔ اس نے مجمع خلاف کو برہم کیا۔ سب اپنے اپنے گھر کو چلے گئے۔

بس یہی انداز آبادی کبھی جاتی تھی۔ بھلا میں اس کی کب روادار ہوتی آخر حسین علی (میرے پاس ایک نواب صاحب آیا کرتے تھے ان کے خدمتگار کا نام تھا) کے ساتھ نکل گئی۔ اس کے گھر جا کر بیٹھ رہی۔ وہاں اس کی جورو نے قیامت برپا کی گھر سے نکل گئی۔ میاں حسین علی ان پر لٹو تھے۔ بیوی کے نکل جانے کی انھیں کوئی پرواہ نہ ہوئی۔ مگر مشکل یہ درپیش ہوئی کہ اب کھانا کون پکا دے۔ بی آبادی کو چولھا پھونکنا پڑا۔ یہ اس کی کب عادی تھیں۔ بہر طور چند روز یوں گذر رہے میں ایک بچہ جنیں۔ خدا جانے حسین علی کا تھا یا کسی اور کا دو مہینہ کا ہو کے وہ بچہ جاتا رہا ادھر حسین علی کی جورو نے روٹی کپڑے کا دعویٰ کیا۔ ڈیڑھ روپیہ مہینہ کی ڈگری ہوئی۔ تین روپیہ نواب دیتے تھے ڈیڑھ روپیہ میں کیا ہوتا۔ اوپر کی آمدنی پر بسر تھی۔ اس میں بھی کچھ نہ چلی۔ بی آبادی کسی قدر چٹوری بھی تھیں۔ آخر میاں حسین علی کے گھر سے نکل کے محلہ کے ایک لڑکے کے ساتھ بھاگیں۔ اس کی ماں پٹھانی کٹنی بڑے شہوروں میں تھی۔ جہاں دو چار لفندریاں اور رہتی تھیں وہیں انکا بھی ٹھکانا ہو گیا۔ بی پٹھانی کی روزی میں کسی قدر اور وسعت ہوئی ننھے برائے نام رہ گئے۔ میاں ننھے کے ایک پیر بھائی میاں سعادت پٹھانی کو چل دیکے لے اڑے۔ یہ اپنی ماں کے پاس لے گئے۔ انکی والدہ کو مرغیوں سے شوق تھا۔ مکان کے پاس ایک تکیہ تھا وہاں مرغیاں چرا کرتی تھیں۔ بی آبادی ان کی حفاظت پر متعین ہوئیں۔ میاں سعادت کسی کارخانے میں کام کرتے تھے۔ دن بھر وہاں چلے جاتے تھے۔ یہ مرغیاں ہنکایا کرتی تھیں۔ وہاں انھوں نے محمد بخش۔ کلو کنجڑن کے لڑکے سے راہ و رسم پیدا کی بلکہ سعادت کی ماں نے یہ معاملہ دیکھ بھی لیا۔ بیٹے سے کہا اس نے خوب جوتے مارے میاں محمد بخش کے ایک اور یار تھے۔ میاں امیر نواب امیر مرزا کے خدمتگاروں میں نوکر تھے۔ یہ فن تماش بینی میں طاق تھے۔ وہ اڑا لے گئے۔ انھوں نے ایک مکان میں بچا کے

رکھا۔ یہاں اور یاروں کا مجمع بھی رہتا تھا۔ بی آبادی سب کی دلجوئی میں مصروف رہتی تھیں، اس زمانے میں نہیں معلوم کس کی برکت سے خوب پھلیں پھولیں۔ اب میاں امیر کے کس کام کی تھیں اس نے اُٹھا کے اسپتال میں بھجوا دیا۔ بالفعل وہیں تشریف رکھتی ہیں اگر آپ فرمائیے تو بلوا دی جائیں۔

رسوا: "مجھے تو معاف ہی کیجئے۔"

ہاتھ آئی مراد مُنھ مانگی

دل نے پائی مراد مُنھ مانگی

رجب کی نوچندی تھی۔ کچھ بیٹھے بیٹھے میرے دل میں آئی چلو درگاہ چلیں، زیارت ہی کریں سرِ شام سوار ہو کے پہنچے۔ بڑا مجمع تھا۔ پہلے تو میں مردانی درگاہ کے صحن میں اِدھر اُدھر ٹہلا کی۔ پھر جا کے شمعیں جلائیں۔ حاضری چڑھائی۔ ایک صاحب مرثیہ پڑھ رہے تھے، انھیں سنا پھر ایک مولوی صاحب آئے انھوں نے حدیث پڑھی اس کے بعد ماتم ہوا اب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلنے لگے۔ میں نے بھی زیارت رخصتی پڑھ کے واپسی کا ارادہ کیا۔ دروازے تک پہنچ کے جی میں آیا زنانی درگاہ میں بھی ہوتی چلوں۔ نوحہ خوانی کی شہرت اور نواب ملکہ کشور کی سرکار سے توسل کی وجہ سے اکثر عورتیں مجھ کو جانتی تھیں۔ میں نے خیال کیا کہ دو چار مل ہی جائیں گی اسی بہانے سے ملاقاتیں ہو جائیں گی۔ سوار ہو کے جو پہلے پر پردہ ڈال کے زنانی درگاہ کے دروازے پر پہنچی۔ کہلدار نے آکر سواری اتروائی۔ اندر گئی میرا خیال غلط نہ تھا۔ اکثر عورتوں سے سامنا ہوا۔ شکوے شکایتیں۔ غدر کے حالات۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوا کیں۔ بڑی دیر ہو گئی۔ میں واپس آنے ہی کو تھی کہ اتنے میں دیکھتی کیا ہوں دہنی طرف کی صحنچی سے کانپور والی بیگم صاحب نکلی چلی آتی ہیں۔ بڑے ٹھاٹھ ہیں تولواں جوڑا پہنے ہوئے چار پانچ مہریاں ساتھ ہیں۔ ایک پاندان سنبھالے ہوئے ہے ایک کے ہاتھ میں پنکھا ہے۔ ایک لوٹیا خاصدان لئے ہے۔ ایک کے پاس سینی میں تبرکات ہیں۔ مجھے دور سے دیکھتے ہی دوڑیں۔ کندھے پر ہاتھ رکھ دیے۔

بیگم: "اللہ امراؤ! تم تو بڑی بے مروت ہو۔ کانپور سے جو غائب ہوئیں تو آج ملی ہو، وہ بھی اتفاق سے۔"

میں: "کیا کہوں جس دن آپ کے باغ میں رات کو رہی تھی اسی دن صبح کو لکھنؤ سے لوگ

آکے مجھے پکڑ کے لکھنؤ لے گئے۔ پھر کیا گڑ بڑ ہوئی۔ خدا جانے کہاں کہاں ماری ماری پھری نہ مجھے آپکا پتہ تھا نہ آپ کو میرا حال معلوم تھا۔

بیگم:۔ "خیر اب تو ہم تم دونوں لکھنؤ میں ہیں"۔

میں:۔ لکھنؤ کیا اس وقت تو ایک ہی مقام پر ہیں۔

بیگم:۔ "اس کی سند نہیں۔ تمھیں تو میرے مکان پر آنا ہوگا"۔

میں:۔ "سر آنکھوں سے۔ مگر آپ رہتی کہاں ہیں؟"

بیگم:۔ چوبتیوں پر نواب صاحب کو کون نہیں جانتا۔

میں پوچھنے ہی کو تھی کہ کون نواب صاحب۔ اتنے میں ایک مہری بول اٹھی نواب محمد تقی خاں کا مکان کون نہیں جانتا۔

میں۔ آنے کو تو آؤں مگر نواب صاحب کے خلاف نہ ہو"۔

بیگم:۔ نہیں وہ اس طبیعت کے آدمی نہیں ہیں اور پھر تمہارے واسطے میں نے اس سات کا حال رتی رتی ان سے کہا تھا۔ انھوں نے تو خود کا نپور میں کئی مرتبہ ڈھونڈوا یا اکثر پوچھتے رہتے ہیں۔

میں:۔ "اچھا تو ضرور آؤں گی"۔

بیگم:۔ "کب آؤ گی وعدہ کرو"۔

میں:۔ "اب کی جمعرات کو حاضر ہونگی"۔

بیگم:۔ "اوہی۔ یہ جمعرات کی ارواح تم کب سے ہوگئیں ابھی تو پورے آٹھ دن ہیں۔ ادھر ہی کیوں نہیں آتیں"۔

میں:۔ "اچھا تو اگلی پیر کو آؤں گی"۔

بیگم:۔ اتوار کو آؤ۔ نواب بھی گھر میں ہوں گے پیر کے دن شاید کسی انگریز سے ملنے جائیں۔

میں:۔ مناسب ہے۔ اتوار کو سہی"۔

بیگم:۔ "کس وقت آؤ گی؟"

میں:۔ جس وقت کہئے۔ مجھے گھر پر کوئی کام نہیں۔ ہر وقت برابر ہے۔

بیگم:۔ "تم کہاں رہتی ہو؟"

میں:۔ "چوک میں سید حسن خاں کے پھاٹک کے پاس"۔

بیگم:۔ "اچھا تو میں مہری کو بھیج دوں گی اسی کے ساتھ چلی آنا"۔

میں: "بہت اچھا"

بیگم: "اچھا تو خدا حافظ"

میں: "خدا حافظ۔ اچھا ہاں یہ تو کہئے صاحبزادہ کیسا ہے؟"

بیگم: "بنن۔ ماشاء اللہ اچھا ہے۔ لو اب تم نے یاد کیا۔"

میں: "کیا کہوں باتوں میں کیسی بھولی۔ اور بھولی کیا جب چاہتی تھی پوچھوں ایک نہ ایک بات نکل آتی تھی۔"

بیگم: "اب تو سلامتی سے ذرا ہوش سنبھالا ہے۔ اچھا اس دن اسے بھی دیکھ لینا"

بیگم: "رات کی نیند حرام ہے۔ اب کچھ نہ کہئے۔ خدا حافظ"

میں: "خدا حافظ۔ دیکھو ضرور آنا۔

"ایسی بات ہے"

اتنے میں مہری نے دیکھا کہ باتوں کا پھر سلسلہ چلا کہنے لگی بیگم صاحب چلئے دیر سے کہار غل مچا رہے ہیں۔ سواری لگی ہے۔

ہر چند بہت غور کیا ہم نے شب و روز
دنیا کا طلسمات سمجھ میں نہیں آتا

میں خانم سے علیحدہ ہو گئی تھی مگر جب تک وہ جیتی رہیں اپنا سرپرست سمجھا کی اور سچ یہ ہے کہ انھیں بھی مجھ سے محبت تھی، ان کے پاس اس قدر دولت تھی کہ طبیعت غنی ہو گئی تھی۔ سن جو زیادہ ہو گیا تھا تو دنیا کی طرف سے ان کی طبیعت پھر گئی تھی اب انکو کیکی کمائی سے کچھ مطلب نہ تھا مگر نجابت اسی طرح کرتی تھیں۔ وہ اپنے جیتے جی کسی نوچی کو اپنے سے جدا نہ کرتی تھیں۔ مجھ سے تو انکو خاص محبت تھی۔ بسم اللہ نے انکو بہت آزار دیے اس لئے انھیں نفرت سی اس سے ہو گئی تھی لیکن پھر اولاد تھی۔ خورشید جان بھی غدر کے بعد آ گئی تھیں۔ وہ خانم کے پاس رہتی تھیں امیر جان نے علیحدہ کمرہ لے لیا تھا مگر وہ بھی آتی جاتی رہتی تھیں۔

جو کمرہ خانم نے مجھے دیا تھا وہ ان کی زندگی بھر مجھ سے خالی نہیں کرایا گیا میرا اسباب اسی میں بند رہتا تھا۔ میرا قفل لگا تھا۔ جب جی چاہتا تھا وہیں جا کے رہتی تھی رسالہ بھر کہیں رہوں مگر محرم میں تعزیہ داری وہیں کرتی تھی۔ میرے نام کا تعزیہ خانم مرتے دم تک رکھا کیں۔

جمعرات کو بیگم سے ملاقات ہوئی تھی جمعہ کو آدمی آیا کہ خانم صاحب کی طبیعت کچھ علیل ہے

انھیں یاد کرتی ہیں۔ میں فوراً سوار ہو کے گئی۔ انھیں دیکھ کر گھر پر واپس آنے کا ارادہ کیا کہ جی میں آیا کہ ایک بھاری جوڑا نکالتی چلوں۔ کمرہ کھلوا دیکھا کمرے میں چاروں طرف جالے لگے ہیں۔ پلنگ پر منوں گرد پڑی ہے فرش فروش الٹا پڑا ہے۔ ادھر ادھر کوڑا پڑا ہے۔ یہ حال دیکھ کے مجھے اپنے اگلے دن یاد آئے۔ اللہ ایک دن وہ تھا کہ یہ کمرہ ہر وقت کیا سجا سجایا رہتا تھا۔ دن میں چار مرتبہ جھاڑو ہوتی تھی، بچھونے جھاڑے جاتے تھے۔ گرد کا نام نہ تھا۔ تنکا تک کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔ یا اب یہ حال ہے کہ دم بھر بیٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ وہی پلنگ جس پر میں سوتی تھی اب اس پر قدم رکھتے ہوئے کراہت معلوم ہوتی تھی۔ آدمی ساتھ تھا میں نے اس سے کہا ذرا جھاڑو تو دے دے۔ وہ ایک سینٹھا کہیں سے ڈھونڈھ کے اٹھا لایا جالے لینے لگا اتنی دیر میں میں نے اپنے ہاتھ سے دری الٹی۔ آدمی نے اور میں نے مل کے دری بچھائی۔ چاندنی کو ٹھیک کیا جب فرش درست ہو گیا تو میں نے پلنگ کے بچھونے اٹھوا کے جھڑوا دیے کوٹھری میں سے سنگاردان، پاندان، اگالدان اٹھا لائی، سب چیزیں اپنے اپنے قرینے سے لگا دیں جس طرح کسی زمانے میں لگی رہتی تھیں۔ خود پلنگ سے تکیہ لگا کے بیٹھی آدمی کے پاس خاصدان تھا پان لے کے کھایا۔ آئینہ سامنے لگا کے منہ دیکھنے لگی۔ اگلا زمانہ یاد آ گیا۔ شباب کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی اس زمانے کے قدردانوں کا تصور بندھ گیا۔ گوہر مرزا کی شرارت۔ راشد علی کی حماقت۔ فیضو کی محبت۔ سلطان صاحب کی صورت غرضکہ جو جو صاحب اس کمرے میں آئے تھے مع اپنے اپنے خصوصیات کے میرے پیش نظر تھے وہ کمرہ اس وقت فانوس خیال بن گیا تھا۔ ایک تصویر آنکھ کے سامنے آتی تھی اور غائب ہو جاتی تھی پھر دوسری سامنے آتی تھی۔ جب کل صورتیں نظر سے گذر گئیں تو یہ دورہ از سر نو پھر شروع ہوا۔ پھر وہی صورتیں، ایک دوسرے کے بعد پیش آئیں۔ پہلے تو ایسے دورے جلد جلد ہوئے اب، ذرا توقف ہونے لگا۔ اب مجھ کو ہر تصویر پر زیادہ تردد و فکر کرنے کا موقع ملا۔ جو واقعات جس شخص کے متعلق تھے ان پر تفصیلی نظر پڑنے لگی۔ پہلے جب دماغ کو فکر ہوا تھا تو صرف چند ہی تصویریں نظر آتی تھیں اب ہر تصویر سے بہت سی نکلیں اور فانوس خیال کی وسعت بڑھنے لگی۔ تمام زندگی میں جو کچھ دیکھا سب نگاہ کے سامنے تھا۔ اس اثنا میں ایک مرتبہ سلطان صاحب کا پھر خیال آیا تو اس کے ساتھ ہی پہلے مجرے کا تمام جلسہ جس میں سلطان صاحب کو دیکھا اور دوسرے دن ان کے خدمتگار کا آنا پھر ان کا خود تشریف لانا۔ مزے مزے کی باتیں شعر و سخن کا چرچا۔ خاں صاحب کا مخل صحبت

ہونا۔ بدزبانی کرنا سلطان کا تپنچہ مارنا۔ خان صاحب کا گر پڑنا۔ تمیشر خاں کی جاں نثاری۔ کوتوال کا آنا خانصاحب کا گھر بھجوانا۔ اور سلطان صاحب کا رُکنا۔ محفل میں۔ انکو دیکھنا۔ لڑکے کے ہاتھ رقعہ بھیجنا۔ پھر از سر نو رسم ہونا۔ نواز گنج کے جلسے۔ یہ سب واقعات اس طرح سے معلوم ہوتے تھے جیسے کل ہوئے ہیں۔ یہ دور سے برابر چل رہے تھے مگر جب پہلے مجرے کے بعد سلطان صاحب کے آدمی کا پیام لے کے آنا یاد آتا تھا۔ طبیعت کچھ رک سی جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس موقع پر کچھ چھوٹ جاتا ہے۔ اتنے میں آدمی نے زور سے ایک چیخ ماری۔

آدمی: "بیوی! دیکھئے وہ کنکھجورا آپ کے دوپٹہ پر چڑھا جاتا ہے"

میں: "(آدمی کہہ کے) اٹھ جلدی سے دوپٹہ اتار کے پھینک دیا۔ الگ جا کھڑی ہوئی آدمی نے دوپٹہ اتار کر جھاڑا کنکھجورا پٹ سے گرا اور رینگ کے پلنگ کے سرہانے پائے کے نیچے گھس گیا۔ آدمی نے پلنگ کا پایا اٹھایا۔ اب جو دیکھتے ہیں تو پائے کے نیچے پانچ اشرفیاں برابر بچھی ہوئی ہیں۔

آدمی: "(بہت ہی متعجب ہو کے) ہائیں۔ اسے لیجئے یہ کیا ہے؟

میں: "(دل میں) اہاہ۔ یہ وہ اشرفیاں ہیں (آدمی سے) اشرفیاں ہیں"

آدمی: "واہ اشرفیاں یہاں کہاں سے آئیں۔ ؟"

میں۔ (ہنس کے) وہ کنکھجورا اشرفیاں بن گیا۔ اچھا اٹھا لو۔

آدمی پہلے تو ذرا جھجکا پھر پانچوں اشرفیاں مجھے اٹھا کے حوالہ کیں۔

رسوا: "تو کیا خانم کا مکان غدر میں نہیں لٹا؟"

امراؤ: "لٹا کیوں نہیں مگر فرض کر لیجئے کہ میرے پلنگ کا پایا کسی نے اٹھا کے نہیں دیکھا"

رسوا: "ممکن ہے"

کسی طرح سے ہو تسکین شوق کیا رشک

ملیں گے آج ہم ان سے رقیب سے مل کے

اتوار کے دن ۸ بجے صبح کو بیگم صاحب کی مہری خیفنس اور کہار لے کے سر پر ہو گئی۔ میں ابھی سو کے اٹھی تھی۔ اچھی طرح حقہ بھی نہ پینے پائی تھی کہ اس نے جلدی مچانا شروع کر دی۔ میں بھی بھی کھانا دانا کھا کے جانا ہوگا۔ مہری نے کہا بیگم صاحب نے اپنے سر کی قسم دی ہے کہ کھانا ہمیں آ کے کھانا۔ میں نے پوچھا نواب صاحب گھر پر ہیں اس نے کہا

نہیں۔ صبح سے اٹھ کے گاؤں کو سدھارے ہیں۔ میں نے پوچھا کب تک آئیں گے مہری نے کہا اب آئیں تو شام کو آئیں۔ مجھے بیگم سے بہت سی باتیں کرنا تھیں اس لئے فوراً اٹھ بیٹھی۔ ہاتھ منہ دھو کے کنگھی چوٹی کر کپڑے بدل ایک ماما کو ساتھ لے کے روانہ ہو گئی۔

جا کے جو دیکھا بیگم صاحب منتظر بیٹھی ہیں میرے جانے کے ساتھ ہی دسترخوان بچھا میں نے اور بیگم صاحبہ نے ساتھ بیٹھ کے کھانا کھایا۔ بہت تکلف کا کھانا تھا۔ پراٹھے قورمہ کئی طرح کا سالن۔ بالائی۔ مہین چاولوں کا خشکہ۔ نورتن چٹنی۔ سیب کا مربہ حلوا سوہن۔ کھانا کھا کے چپکے سے میرے کان میں

بیگم: "کیوں وہ کریم کے گھر کی ارہر کی دال اور جوار کی روٹیاں کبھی یاد ہیں؟"

میں: "چپ بھی رہو کوئی سُن نہ لے۔"

بیگم: "سن لے گا تو کیا ہو گا کیا کوئی جانتا نہیں۔ نواب کی ماں (خدا جنت نصیب کرے) نے مجھے نواب کے لئے مول لیا تھا۔"

میں: "برائے خدا چپ رہو کہیں علٰحدہ چلو تو باتیں ہوں گی۔"

کھانا کھا کے ہاتھ منہ دھویا۔ پان کھایا مہری نے حقہ لا کے لگایا۔ بیگم نے سب کو بہانے سے ٹال دیا۔

میں: "بارے تم نے مجھے پہچان لیا۔"

بیگم: "جب تمھیں پہلے پہل کانپور میں دیکھا تھا۔ اسی دن پہچان لیا تھا پہلے تو بڑی دیر تک اُلجھن سی ہی تھی۔ دل میں کہتی تھی میں نے تمھیں کہیں دیکھا ہے مگر کہاں دیکھا ہے یہ کچھ یاد نہیں آتا تھا۔ چاروں طرف خیال دوڑاتی تھی، کچھ سمجھ ہی میں نہ آتا تھا۔ اتنے میں کریمن مہری پر نظر پڑی۔ کریمن کے نام پر موئے کالے کریم کا نام آ گیا۔ دل نے کہا کہ اوہو ہو تمھیں کریم کے مکان پر دیکھا تھا۔"

میں: "میرا بھی یہی خیال تھا۔ بڑی دیر تک غور کیا کی۔ میری ساتھ والیوں میں ایک خورشید ہے اسکی صورت تم سے بہت ملتی ہے۔ جب میں خورشید کو دیکھتی تھی تم یاد آ جاتی تھیں۔"

"اب میرا حال سنو۔"

میں جب تم سے جدا ہو کے نواب صاحب کی ماں نواب عمدۃ النسا بیگم صاحبہ کے ہاتھ بکی ہوں۔ تمھیں یاد ہو گا میرا سن کوئی بارہ برس کا ہو گا۔ نواب کو سولھواں برس تھا، نواب کے ابا جان کانپور میں رہتے تھے۔ بیگم صاحب سے اُن سے نااتفاقی رہتی تھی۔ نواب صاحب کے ابا جان نے نواب کی شادی اپنی بہن کی لڑکی کے ساتھ ٹھہرائی تھی۔ ان کا مکان دہلی میں تھا بیگم صاحب

کو وہاں شادی کرنا منظور نہ تھا۔ وہ یہ چاہتی تھیں کہ نواب کی شادی ان کے بھائی کی بیٹی کے ساتھ ہو۔ میاں بیوی میں پہلے ہی سے نااتفاقی تھی۔ اس بات سے اور ضدیں بڑھیں۔ ابھی یہ جھگڑا طے نہ ہوا تھا کہ نواب کے دشمنوں کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ حکیموں نے تجویز کیا کہ بہت جلد شادی کر دینا چاہیے، ورنہ جنون ہو جائے گا۔ شادی ہو جانا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اتنے میں میں پہنچ گئی۔ بیگم صاحب نے مجھے خرید لیا۔

نواب صاحب مجھ پر مائل ہو گئے اور ایسے مائل ہوئے کہ دونوں جگہ کی شادی سے کھلم کھلا انکار کر دیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد خدا کا کرنا ایسا ہوتا ہے کہ بیگم صاحب نے انتقال کیا اور اس کے چند ہی سال بعد بڑے نواب بھی مر گئے۔ ماں باپ دونوں صاحب جائداد تھے۔ یہی ایک اکلوتے لڑکے تھے۔ کل دولت انھیں کو ملی۔

نواب صاحب کو خدا سلامت رکھے جن کی بدولت بیگم صاحب بنی ہوئی ہوں اور چین کرتی ہوں نواب مجھے اسی طرح چاہتے ہیں جیسے کوئی اپنے سہرے جلوے کی بیوی کو چاہتا ہو۔ میری ظاہر میں تو کسی طرف نگاہ اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔ یوں باہر اپنے دوست آشناؤں میں جو کچھ چاہتے ہوں کرتے ہوں۔ آخر مرد ذات ہیں کچھ میں ان کے پیچھے تو پھرتی نہیں۔

خدا نے سب آرزوئیں میری پوری کیں۔ اولاد کی ہوس تھی۔ خدا کے صدقے سے اولاد بھی ہے۔ اب اگر آرزو ہے تو یہ ہے کہ خدا بچن کو پروان چڑھائے بہو بیاہ کے لاؤں اور ایک پوتا کھلاؤں۔ پھر چاہے مر جاؤں۔ نواب کے ہاتھوں مٹی عزیز ہو جائے۔ اب تم اپنا حال کہو۔

جب رام دئی یہ باتیں کر رہی تھی مجھے اپنی قسمت پر افسوس آ رہا تھا اور دل ہی دل میں کہتی تھی تقدیر ہو تو ایسی ہو۔ ایک میری پھوٹی تقدیر کہ بکی بھی تو کہاں، رنڈی کے گھر میں۔

اس کے بعد میں نے اپنا مختصر حال کہہ سنایا جس سے آپ بخوبی واقف ہیں میں دن بھر وہیں رہی۔ جب تخلیہ کی باتیں ہو چکیں تو نوکروں کو آواز دی طبلہ کی جوڑیاں ستار طنبورہ یہ سب سامان منگایا۔ گانے بجانے کا جلسہ ہوا۔

جب ہم دونوں اکیلے تھے تو وہ رام دئی تھیں اور میں امیرن سب لوگوں کے سامنے پھر وہ بیگم صاحب ہو گئیں اور میں امراؤ جان۔ تین چار گھنٹے تک گانا بجانا ہوتا رہا۔ بیگم بھی کسی قدر ستار بجا لیتی تھیں۔ جب میں گا چکتی تھی تو ستار کی وہ کوئی گت چھیڑ دیتی تھیں۔ ایک مغلانی کا گلا بہت اچھا تھا اس کو گوا دیا۔ سر شام تک بڑے لطف کی صحبت رہی۔

ہاں اے نگاہِ شوق مناسب ہے احتیاط

ایسا نہ ہو کہ بزم میں چرچا کرے کوئی

قریب شام محل میں نواب صاحب کی آمد آمد کا غل ہوا۔ وہ بے تکلفی کی صحبت برہم ہو گئی جلسے کی جوڑی، ستار طنبورہ، سب چیزیں ہٹا دی گئیں۔ چھینے والیاں اٹھ اٹھ کے پردے میں جانے لگیں اور سب لوگ اپنے قرینے سے ہو گئے۔ میں خنجی بیگم سے الگ ہٹ کے بقطع بن کے بیٹھ گئی۔ جس دالان میں ہم لوگ بیٹھے تھے وہاں سے دروازہ کا سامنا تھا۔ پردا پڑا ہوا تھا نواب کے انتظار میں اُس پردے کی طرف نگاہیں لگی ہوئی تھیں۔ میں بھی اسی طرف دیکھ رہی تھی اتنے میں کسی خدمتگار نے چلا کے کہا، نواب صاحب آتے ہیں۔ چند لمحہ کے بعد مہری نے پردہ اٹھا کے کہا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، نواب اندر داخل ہوئے۔

میں (صورت دیکھتے ہی دل میں) وہی تو ہیں (سلطان صاحب) ہے ہے کس موقع پر سامنا ہوا ہے۔ نواب کی نگاہ مجھ پر پڑی، پہلے تو کچھ جھجکے، پھر بغور میری طرف دیکھتے ہوئے آگے بڑھے میں بھی انھیں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

میں دیکھتا ہوں جو اُن کی طرف تو حیرت ہے مری نگاہ کا وہ اضطراب دیکھتے ہیں،

اب نواب دالان کے قریب پہنچ گئے اور میری ہی طرف دیکھتے جاتے تھے کہ۔

"ارے بی نواب دیکھتے کیا ہو۔ وہی ہیں امراؤ جان جو کا نپور ـــ"

(انجان بن کے) ہاں میں نے تم سے انھیں کا تذکرہ کیا تھا۔

اب فرش کے قریب پہنچ گئے۔ سب تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ نواب مسند پر بیگم کے پہلو میں ایک ذرا سرک کے بیٹھ گئے۔

اب شام ہو گئی تھی۔ مہری نے دو کنول سفید روشن کر کے سامنے رکھے بیگم پان بنانے لگیں، اس عرصہ میں نواب نے آنکھ بچا کے میری طرف دیکھا میں نے کنکھیوں سے انھیں دیکھا اب نہ وہ کچھ کہہ سکتے ہیں نہ میں بول سکتی ہوں۔ منھ سے بولنے کا موقع نہ تھا مگر اس وقت آنکھیں زبان کا کام دیرہی تھیں۔ شکوے شکایت رمز و کنایہ سب اشاروں میں ہوا کیا۔

نواب۔ (کسی قدر اجنبیت سے) امراؤ جان صاحب! واقعی ہم تو آپ کے بہت ہی ممنون ہیں واقعی کا نپور میں اُس شب کو تمھاری وجہ سے ہمارا گھر لٹنے سے بچ گیا"۔

میں: "یہ آپ کیوں مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں۔ ایک اتفاقی امر تھا۔"

نواب: "خیر جو کچھ ہو وجہ تمہاری تھی۔ خیر اسباب تو وہاں کچھ نہ تھا مگر ایک بڑی خیریت تمام ضروری کاغذات کوٹھی میں موجود تھے۔"

میں: "حضور ان دونوں جنگل میں عورتوں کو چھوڑ کے کہاں گئے تھے۔"

نواب: "کیا کہوں ایسی ہی مجبوری تھی۔ لکھنؤ کی جائداد بادشاہ نے ضبط کر لی تھی لاٹ صاحب کے پاس کلکتہ جانا ضرور تھا۔ ایسی عجلت میں گیا تھا کہ نہ کچھ سامان کیا نہ لیا نہ دیا۔ صرف تمیز خان اور ایک آدمی اور ساتھ لیکے چلا گیا۔

"وہ کوٹھی ایسے جنگلے میں ہے کہ جو واردات نہ ہو تعجب ہے۔"

"سوائے اس واقعہ کے اور کوئی واردات کبھی نہیں ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ غدر ہونے کو تھا بدمعاشوں نے سر اٹھایا تھا۔ ملک میں اندھیر مچا تھا۔"

اس کے بعد اور ادھر ادھر کی باتیں ہوا کیں۔ پھر دسترخوان بچھا۔ سب نے مل کے ساتھ کھانا کھایا۔ جب حقہ پان سے فراغت ہو چکی تو نواب نے گانے کی فرمائش کی میں نے یہ غزل شروع کی۔

مرتے مرتے نہ قضا یاد آئی — اسی کافر کی ادا یاد آئی
تم کو الفت نہ ادا یاد آئی — یاد آئی تو جفا یاد آئی
ہجر کی رات گزر ہی جاتی — کیوں تری زلف رسا یاد آئی
تم جدائی میں بہت یاد آئے — موت تم سے بھی سوا یاد آئی
لذت معصیت عشق نہ پوچھ — خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی
چارہ گر زہر منگا دے تھوڑا — لے مجھے اپنی دوا یاد آئی

اور شعر یاد نہیں مقطع یہ ہے۔

کیا غزل گوئی کہے ہے . . . . . . — آج کیوں باد صبا یاد آئی

برسات کے دن ہیں پانی جھما جھم برس رہا ہے۔ آموں کی فصل ہے۔ میرے کمرے میں مجمع ہے۔ بسم اللہ جان۔ امیر جان۔ بیگا جان۔ خورشید جان رنڈیوں میں نواب ببن صاحب نواب چھبن صاحب، گوہر مرزا، عاشق حسین، تفضل حسین، امجد علی، اکبر علی خاں مردوں میں۔ یہ سب صاحب موجود ہیں گانا ہو رہا ہے۔ اتنے میں

بسم اللہ: "بھئی ہوگا۔ گانا تو روز ہوا کرتا ہے۔ اس وقت تو کڑھائی چڑھا دو کچھ

پکوان پکوائو۔ دیکھو کیسا مینھ برس رہا ہے۔"

میں یہ اونھ۔ بازار سے۔ جو جی چاہے منگوا لو۔"

خورشید: "بازار سے منگوالو یہ خوب کہی۔ اپنے ہاتھ سے پکانے میں مزا ہی اور ہے۔"

امیر: "بہن! تمھیں ہنڈیا ٹھونکنے کا مزہ ہے ہمنے نہ تو کبھی پکایا ہے نہ پکانے کی قدر جانتے ہیں۔"

بیگا: "تو پھر وہی بازار کی ٹھہری۔"

میں: "اے ہے باجی کیا بھوکی ہو؟"

بیگا: "میں تو بھوکی نہیں ہوں بسم اللہ سے پوچھو۔ انھوں نے صلاح دی تھی۔"

بسم اللہ: "بھئی کچھ نہ کچھ تو آج ہونا چاہئیے۔

میں: "بتاؤں! چلو بخشی کے تالاب چلیں۔"

بسم اللہ: "ہاں بھئی کیا بات کہی ہے۔"

خورشید: "خوب سیر ہوگی۔"

بیگا: "ہم بھی چلیں گے۔"

میں: "اچھا تو سامان کرو۔"

بات کرتے ہیں تین گاڑیاں کرایہ پر آگئیں۔ کھانے پکانے کا سامان گاڑیوں پر لدوایا گیا دو چھولداریاں نواب بنن صاحب کے گھر سے آگئیں۔ سب گاڑیوں پر سوار ہوکے روانہ ہوگئے۔

گومتی پار پہنچ کے گانا شروع ہوا۔ اس دن بیگا جان کا گانا۔

جھولا کن ڈارو رے امریاں

کیا کیا تانیں لی ہیں کہ دل لیا جاتا تھا۔

شہر سے نکل کے جنگل کا سماں قابل دید تھا۔ جدھر نگاہ جاتی ہے سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ بادل چاروں طرف گھرے ہوئے ہیں۔ مینھ برس رہا ہے۔ درختوں کے پتوں سے پانی ٹپک رہا ہے۔ نالے ندیاں بھری ہوئی ہیں۔ مور ناچ رہے ہیں کوئل کوک رہی ہے۔ بات کہتے ہیں تالاب پر پہونچ گئے۔ بارہ دری میں فرش کیا گیا چولھے بن گئے۔ کڑاہیاں چڑھ گئیں، پوریاں تلی جانے لگیں۔ نواب چھٹن صاحب برساتی پہن کے شکار کو نکل گئے۔ گوہر مرزا آموں کی کھانچیاں جھکا لائے۔ اتنی دیر میں نوکروں نے سڑک کے کنارے باغ میں چھولداریاں گاڑ دیں۔ گاؤں سے چارپائیاں آگئیں۔ یہاں اور ہی لطف تھا۔ آم ٹپک رہے ہیں

ایک ایک آم پر چار آدمی ٹوٹے پڑتے ہیں پانی میں چھپکے لگا رہے ہیں

کوئی ادھر دوڑا جا رہا ہے۔ آپس میں دھینگا مشتی ہو رہی ہے۔ اب اس میں اگر کوئی گر پڑا تو کیچڑ میں لت پت۔ کتنے جام دیر پانی [illegible] کے کھڑے ہو گئے۔ پھر جیسے ہی [illegible] بن گئے۔ مزاج میں کسی قدر احتیاط تھی جیسے باجی بیگا بان وہ پھولداری تک بیٹھی ہیں۔

بسم اللہ نے پیچھے سے جا کے منھ پر آم کا رس مل دیا۔ پھر لڑکی کی چیخیں اور سب کا قہقہہ لگانا دیکھنے کا تماشہ تھا۔

نہیں معلوم کہاں سے بستی کی ہماتی تین مٹنیاں آ گئیں۔ انھوں نے گانا شروع کیا۔ انکے ساتھ کا ڈھولکی والا غضب کی ڈھولکی بجاتا تھا بھلا انکا ناچ گانا ہم لوگوں کو کیا اچھا معلوم ہوتا مگر اس موسم میں اور دیسی جگہ کچھ ایسا نامناسب نہ تھا دو گھڑی دن رہے ہماری قسمت سے آسمان کھل گیا۔ دھوپ نکل آئی ہم لوگ احتیاطاً ایک ایک جوڑا گھر سے لیتے آئے تھے سب نے کپڑے بدلے جنگل کی سیر کو نکلے۔

میں کبھی اکیلی ایک طرف کو روانہ ہوئی۔ سامنے گنجان درخت تھے، سورج انھیں گنجان درختوں کی آڑ میں ڈوب رہا تھا۔ سبزے پر سنہری کرنوں کے پڑنے سے عجیب کیفیت تھی۔ جا بجا جنگلی پھول کھلے تھے۔ چڑیاں سبزے کی تلاش میں ادھر ادھر اڑ رہی تھیں۔ سامنے جھیل کے پانی پر آفتاب کی شعاع سے وہ عالم نظر آتا تھا جیسے پگھلا ہوا سونا چھلک رہا ہے۔ درختوں کے بیچ کی آڑ میں سورج کی کرنیں اور ہی عالم دکھا رہی ہیں۔ آسمان پر سرخ شفق پھیلی ہوئی تھی اس وقت کا سماں ایسا تھا کہ ایک خفقانی مزاج کی عورت جیسی کہ میں ہوں۔ بے اختیاری سے پھولداری میں چلی آتی۔ یہ تماشہ دیکھتی ہوئی خدا جانے کتنی دور نکل گئی، آگے جا کر ایک پکی سڑک ملی۔ اس پر تھوڑی دور راستہ چل رہے تھے اس کے کنارے پل تھا کوئی بیلوں کو ہانکتا ہوا چلا آتا تھا۔ ایک چھوٹی سی لڑکی گائے بھینس لئے جاتی تھی۔ ایک لڑکا بہت سی بھیڑوں اور بکریوں کے پیچھے تھا۔ یہ سب آنکھوں کے سامنے آئے اور پھر نظروں سے غائب ہو گئے میں پھر اکیلی رہ گئی۔ نہیں معلوم کس دھن میں تھی۔ مگر اب میں سڑک پر چلنے لگی۔ اپنے نزدیک میں اب گویا تالاب کی طرف چل رہی ہوں۔ اب اندھیرا ہوتا جاتا ہے۔ سورج ڈوبنے کو ہے۔ اب میرا قدم جلد جلد اٹھ رہا ہے۔ آگے چل کر ایک فقیر کا تکیہ ملا۔ یہاں کچھ لوگ بیٹھے حقہ پی رہے تھے یہاں میں نے تالاب کا راستہ پوچھا معلوم ہوا کہ میں پختہ سڑک پر بڑھ آئی ہوں تالاب دہنے کو چھوٹ گیا ہے۔ یہاں سڑک چھوڑنا پڑی۔ ایک پیڑ میں سے ہو کے راستہ تھا۔ تھوڑی دور جا کر ایک نالہ ملا۔ نالے کے اس پار تھوڑے فاصلہ پر دو تین درخت

میں نے دیکھا کہ ان درختوں کی جڑ سے ایک ذرا ہٹ کے کوئی شخص میلی سی دھوتی باندھے مرزئی پہنے ایک میلا سا چادرہ کمر سے لپٹا ہوا کھرپی ہاتھ میں لئے کچھ کھود رہا ہے۔ میرے اس شخص کے چار آنکھیں ہوئیں۔ پہلے تو کچھ شبہ سا ہوا پھر ایک مرتبہ غور سے دیکھا اب قریب یقین کے ہوگیا کہ وہی ہے۔ چاہتی تھی کہ نظر پھیر لوں مگر نگاہ کمبخت اسی طرف لڑی رہی اب تو بالکل یقین ہوگیا۔ قریب تھا کہ غش کھا کے گر پڑوں اور ضرور ہی گر پڑتی۔ اتنے میں دور سے اکبر علی خاں کے نوکر سلار بخش کی آواز کان میں آئی۔ مجھے ڈھونڈھنے نکلا تھا۔ مجھے آتے دیکھ کر دلاور خاں نے کھرپی ہاتھ سے رکھ دی تھی جس طرح میں اسے دیکھ رہی تھی، وہ بھی مجھ کو دیکھ رہا تھا۔ مگر یقیناً مجھے اس نے نہ پہچانا ہو۔ میں نے اس کو اچھی طرح پہچان لیا تھا۔

سلار بخش کی آواز سن کر وہ نالے کی طرف بھاگا۔ اتنے میں سلار بخش میرے پاس پہنچ گیا۔ میں مارے خوف کے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ آواز منہ سے نہیں نکلتی تھی، گھگھی بندھی ہوئی تھی۔ سلار بخش نے میرا یہ حال دیکھ کے کہا "ہائیں ڈر گئیں؟" میں نے درخت کی طرف اشارہ کیا۔ سلار بخش اس طرف دیکھنے لگا۔

سلار بخش۔ وہاں کیا دھرا ہوا ہے۔ ایک کھرپی پڑی ہوئی ہے۔ واہ! اس سے ڈر گئیں۔ آپ سمجھیں کوئی قبر کھود رہا ہے۔ اور وہ گیا کہاں جو کھود رہا تھا۔

میں۔ منہ سے تو بولا نہ گیا ہاتھ سے نالے کی طرف اشارہ کیا۔

سلار بخش: "چلو بھاگ گیا ہوگا تکیہ پر۔ اچھا تو چلئے نواب چھبن صاحب بہت سی مرغیاں شکار کرکے لائے ہیں آپ کا کہیں پتہ نہیں، میاں ادھر ڈھونڈنے گئے ہیں۔ میں ادھر آیا کہئے آپ مل گئیں نہیں تو آپ کو راستہ نہ ملتا۔"

میں نے ہاں نا کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ آخر سلار بخش بھی چپ ہو رہا تھوڑی دیر میں کھیتوں میں سے ہو کے تالاب پر پہنچ گئی۔

رات کو جہاں رہنے کی کوٹھری تھی جب کھانے دانے سے فراغت ہوگئی میں نے اکبر علی خاں سے کل واقعہ بیان کیا۔

اکبر علیخاں: "تم نے اچھی طرح سے دیکھا یہ وہی دلاور خاں تھا؟ فیض آباد کا رہنے والا۔ اس کا تو حلیہ جاری ہے۔ افسوس تم نے پہلے سے نہ کہا۔ بدمعاش کو جیل کے گرفتار کرتے۔ بڑا انعام ہوتا سرکار سے انعام ملتا۔ ایک ہزار کا اشتہار ہے اور یہ کھودتا کیا تھا؟"

میں: "کیا معلوم۔ شاید اپنی قبر کھودتا ہوگا۔"

اکبر علیخاں: "آپ کے نام سے تمہارے منہ پر ہوائیاں چھوٹنے لگتی ہیں۔ اب وہ تمہارا کیا کر سکتا ہے۔"

میں: "(دل کو ذرا اطمینان کر کے) ضرور اس نے غدر کے زمانے میں وہاں کچھ گاڑ دیا ہوگا اسے کھودنے آیا ہے۔"

اکبر علیخاں: "چلو دیکھیں۔"

میں: "میں تو نہ جاؤں گی۔"

اکبر علیخاں: "میں تو جاتا ہوں۔ سلار بخش کو لئے جاتا ہوں۔"

میں: "کہاں جاؤ گے۔ اب وہاں دھرا ہوگا وہ کھود کے لے بھی گیا ہوگا۔"

اکبر علیخاں: "میں تو ضرور جاؤں گا۔"

یہ ذرا زور سے کہا۔ پاس نواب چھبن صاحب کی پھولداری تھی، وہ اور بسم اللہ دونوں جاگ رہے تھے۔

نواب: "خاں صاحب! کہاں جائیے گا؟"

اکبر علیخاں: "نواب صاحب! ابھی آپ نے آرام نہیں کیا؟"

نواب: "جی نہیں۔"

اکبر علیخاں: "میں حاضر ہوں۔"

نواب: "آئیے۔"

اکبر علی خاں اور میں دونوں نواب کی پھولداری میں گئے۔ کل واقعہ بیان کیا۔

نواب: "(مجھ سے) اور تم اس بدمعاش کو کیا جانو۔"

میں: "(اپنی سرگزشت تو ان سے کیا کہتی۔) میں جانتی ہوں اور اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں بھی فیض آباد کی رہنے والی ہوں۔"

نواب: "اخاہ! آپ بھی فیض آباد کی رہنے والی ہیں؟"

اکبر علیخاں: "مگر اس مردود کا کوئی بندوبست کرنا چاہئے۔ ایسے میں ہمیں کہیں بے عجب نہیں گرفتار ہو جائے۔"

یہ کہہ کے سلار بخش کو آواز دی۔ قلمدان منگوایا۔ تھانہ قریب تھا۔ تھانے دار کو رقعہ لکھا تھوڑی دیر میں تھانہ دار صاحب مع دس بارہ سپاہیوں کے آموجود ہوئے۔ میں نے جو دیکھا تھا ان سے کہہ دیا۔ گاؤں سے پاسی بلوائے گئے۔ پہلے اس موقع پر جا کے ڈھونڈھا تکیہ پر تھوڑے سے فاصلے پر ایک باغ اور ملا ایک سپاہی کو ایک اشرفی شاہی زمانے کی ملی وہ تھانہ دار صاحب کے پاس لے آیا۔

تھانہ دار: "خدا چاہے تو مع مال گرفتار ہوگا۔"

تھانے دار صاحب نے واقعی اچھا بندوبست کیا۔ سپاہیوں نے بھی خوب ہی تگ و دو کی۔ آخر تین بجے رات کو سکا گنج میں گرفتار ہوا۔ صبح ہوتے ہوتے تالاب پہنچ گیا۔ تلاشی میں ۲۴ار اشرفیاں برآمد ہوئیں۔ میں شناخت کے لئے بلائی گئی۔ میری شناخت کے علاوہ دو سپاہیوں نے بھی پہچانا۔ دس بجے چالان لکھنؤ کو روانہ ہو گیا۔

"اچھا تو پھر اس کا حشر کیا ہوا۔ اس قصّے کو جلد ہی ختم کیجئے۔"

"ہوا کیا۔ کوئی دو مہینے کے بعد معلوم ہوا پھانسی ہو گئی۔ واصل جہنم ہوا۔"

نہ پوچھ نامۂ اعمال کی دل آویزی

تمام عمر کا قصہ لکھا ہوا پایا

مرزا رسوا صاحب! جب آپ نے میری سوانح عمری کا مسودہ مجھے نظر ثانی کرنے کے لئے دیا تھا مجھے ایسا غصہ آیا کہ جی چاہتا تھا۔ پرزے پرزے کر کے پھینک دوں۔ بار بار خیال آتا تھا کہ زندگی میں کیا کم روسیاہی ہوئی کہ اس کا افسانہ بعد مرنے کے بھی باقی رہے کہ لوگ اس کو پڑھیں اور مجھ کو لعنت ملامت کریں مگر مزاج کی تساہلی اور آپ کی محنت کے لحاظ نے ہاتھ روک لیا۔

اتفاقاً کل شب کو بارہ بجے کے قریب سوتے سوتے آنکھ کھل گئی۔ میں حسب معمول کمرے میں تنہا تھی۔ مامائیں خدمت گار سب نیچے مکان میں سو رہے تھے۔ میرے سرہانے لیمپ روشن تھا پہلے تو دیر تک کروٹیں بدلا کی۔ یا ہتی تھی سو جاؤں کسی طرح نیند نہ آئی۔ آخر اٹھی، پان لگا کر ماما کو پکارا حقہ بھروایا پھر پلنگ پر جا لیٹی حقہ پینے لگی جی میں آیا کوئی کتاب دیکھوں۔ بہت سے قصے کہانی کی کتابیں سرہانے الماری میں رکھی تھیں۔ ایک ایک کو اٹھا کے ورق الٹے پلٹے مگر وہ سب کئی مرتبہ کی دیکھی ہوئی تھیں۔ جی نہ لگا بند کر کے رکھ دیں۔ آخر اسی مسودے پر ہاتھ پڑا خفقان کی شدت تھی۔ پچ پچ میں نے اس کے چاک کرنے کا مصمم قصد کر لیا چاک ہی کیا چاہتی تھی کہ یہ معلوم ہوا جیسے کان میں کوئی کہہ رہا ہے۔

"اچھا امراؤ بالفرض اسے تم نے پھاڑ کے پھینک دیا جلا دیا تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ تمام عمر کے واقعات جو خدائے عادل و توانا کے حکم سے فرشتوں نے مفصل اور بشرح لکھے ہیں انھیں کون مٹا سکتا ہے۔"

اس غیبی آواز سے میرے ہاتھ پاؤں لرزنے لگے قریب تھا کہ مسودہ ہاتھ سے گر پڑے

مگر میں نے اپنے تئیں سنبھالا۔ چاک کرنے کا خیال تو بالکل دل سے محو ہو گیا۔ جی چاہا جہاں سے اٹھایا تھا وہیں رکھ دوں۔ پھر اکبارگی یوں ہی بلاقصد پڑھنا شروع کیا۔ پہلا صفحہ جب تمام ہو گیا، ورق الٹا۔ دو چار سطریں اور پڑھیں۔ اس وقت مجھے اپنی سرگزشت سے کچھ ایسی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ جس قدر پڑھتی جاتی تھی جی چاہتا تھا اور پڑھوں۔ اور قصوں کے پڑھنے میں مجھے ایسا لطف کبھی نہ آیا تھا کیونکہ ان کو پڑھتے وقت یہ خیال پیش نظر رہتا تھا کہ یہ سب بنائی ہوئی باتیں ہیں، درحقیقت کوئی اصل نہیں۔ یہی خیال قصے کو بے مزہ کر دیتا ہے۔ میری سوانح عمری میں جو امور آپ نے قلمبند کیے ہیں، وہ سب مجھ پر گذرے ہیں۔ اس وقت، وہ سب گویا میری آنکھوں کے سامنے تھے۔ ہر واقعہ اصلی حالت میں نظر آتا تھا اور اس سے طرح طرح کے اثر میرے دل و دماغ پر طاری تھے جن کا بیان بہت ہی دشوار ہے۔ اگر کوئی مجھے اس حالت میں دیکھتا تو اس کو میری دیوانگی میں کوئی شک نہ رہتا۔ کبھی تو میں بے اختیار ہنس پڑتی تھی۔ کبھی ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے تھے۔ بڑی عجیب کیفیت تھی۔ آپ نے فرمایا تھا "جا بجا بناتی جانا" یہاں اس کا ہوش کسے تھا۔ پڑھتے پڑھتے صبح ہو گئی۔ اب میں نے وضو کیا۔ نماز پڑھی۔ پھر تھوڑی دیر سو رہی۔ صبح کو کوئی آٹھ بجے آنکھ کھلی۔ ہاتھ منہ دھو کے پڑھنے لگی۔ بارے سر شام سارا مسودہ پڑھ چکی۔

تمام قصہ میں وہ تقریر آپ کی مجھے بہت ہی دلچسپ معلوم ہوئی، جہاں آپ نے نیک بختوں اور خراب عورتوں کا مقابلہ کر کے ان کا فرق بتایا ہے۔ نیک بخت عورتوں کو جس قدر فخر ہو زیبا ہے اور ہم ایسی بازاریوں کو ان کے اس فخر پر بہت ہی رشک کرنا چاہیے۔ مگر اس کے ساتھ یہ خیال آیا کہ اس باب میں بخت و اتفاق کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔ میری خرابی کا سبب، وہی دلاور خاں کی شرارت تھی نہ وہ مجھے اٹھا لاتا اور نہ اتفاق سے خانم کے ہاتھ فروخت ہوتی۔ نہ میرا یہ حال پورا ہوتا۔ جن امور کی برائی میں، اب مجھے کوئی شبہ نہیں رہا اور اسی لئے ایک مدت ہوئی کہ میں ان سے بیزار اور تائب ہوں، اس زمانے میں ان کی حقیقت، مجھے کسی طرح نہیں معلوم ہو سکتی تھی نہ ایسا کوئی قانون مجھے بتایا گیا تھا کہ میں ان سے اجتناب کرتی اور ایسا نہ کرتی تو مجھے سزا دی جاتی۔ میں خانم کو اپنا مالک اور حاکم تصور کرتی تھی جو ان کی مرضی کے خلاف ہو اگر کرتی بھی تو بہت چھپا کے تاکہ ان کی مار اور جھڑکیوں سے بچ سکوں۔ اگرچہ خانم نے مجھے زندگی بھر پھول کی چھڑی بھی نہیں چھوائی مگر خوف غالب تھا۔

جن لوگوں میں میں نے پرورش پائی تھی جو ان کا طریقہ تھا وہی میرا بھی تھا۔ میں نے اس زمانے میں کبھی کسی مذہبی عقیدے پر غور نہیں کیا اور میرا خیال ہے کہ کوئی ایسی حالت میں غور کرتا۔

ارضی و سماوی حادثے جن کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے مگر جب واقع ہوتے ہیں تو دلوں میں ایک خاص قسم کی دہشت سما جاتی ہے مثلاً زور سے بادل کا گرجنا، بجلی کا چمکنا، آندھیوں کا آنا، اولوں کا گرنا یا زلزلے کا آنا، سورج گرہن یا چاند گہن، قحط سالی، وبا وغیرہ ایسے امور اکثر خدائی غضب کی علامتیں تھیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ لوگوں کے بعض اعمالوں کی وجہ سے وہ رفع دفع ہوگئیں مگر یہ بھی دیکھا کہ بہت سی آفتیں دعا تعویذ، ٹوٹکے ٹونکے کی بات سے نہ ٹلیں۔ ایسے امور کو لوگ خدا کی مرضی تقدیر آسمانی کی طرف منسوب کردیا کرتے ہیں۔ مذہبی احکام مجھ کو مفصل نہ پہنچے تھے اور نہ ثواب عذاب کا مسئلہ اچھی طرح سمجھایا گیا تھا۔ اس لئے اِن باتوں کا اثر میرے دل پر نہ تھا بیشک اس زمانہ میں میرا کوئی مذہب نہ تھا صرف جو اور لوگوں کو کرتے دیکھتی تھی وہی آپ بھی کرنے لگتی تھی اس وقت میں میرا کوئی مذہب ہی نہ تھا۔ تقدیر پر میں بہت ہی شاکر تھی۔ جو کام میں کاہلی سے نہ کرسکتی تھی یا میری بیوقوفی سے بگڑ جاتا تھا اس کو تقدیر کے حوالے کر دیتی فارسی کتابوں کے پڑھنے سے آسمان کی شکایت کرنے کا مضمون میرے ہاتھ آگیا تھا اور جب میرا کوئی مطلب فوت ہوجاتا تھا یا کسی اور وجہ سے مجھے ملال پہنچتا تھا تو جا و بے جا فلک کی شکایتیں کیا کرتی تھی۔

ہم بھی ہیں مختار لیکن اس قدر ہے اختیار　　جب ہوئے مجبور قسمت کو بُرا کہنے لگے

مولوی صاحب، بوا حسینی اور بڈھے بڑھیاں جب اگلے زمانے کی باتیں کرتے تھے تو اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس زمانہ کی غائبانہ تعریف اور زمانۂ موجودہ کی بلا وجہ مذمت کیا کرتی تھیں میں کمبخت اس بات کو نہ سمجھی کہ بڈھے بڑھیاں جو اگلے وقتوں کی تعریف کرتے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ اپنی اپنی جوانی کے دن سب کو بھلے معلوم ہوتے ہیں اس لئے دنیا بھلی معلوم ہوتی ہے۔ خود زندہ جہاں زندہ خود مردہ جہاں مردہ سن رسیدہ لوگوں کی دیکھا دیکھی جوانوں نے بھی انھیں کا طریقہ اختیار کرلیا ہے اور چونکہ یہ غلط فہمی مدت سے چلی آتی ہے اس لئے اب عموماً سب کو اس کی عادت ہوگئی ہے۔

جوان ہونے کے بعد میں عیش و آرام میں پڑ گئی تھی۔ اس زمانے میں گا بجا کے مردوں کو رجھانا میرا خاص پیشہ تھا اس میں بمقابلہ اور ساتھ والیوں کے جس قدر کامیابی یا ناکامیابی مجھ کو ہوتی تھی وہی میری خوشی اور رنج کا اندازہ تھا۔ میری صورت بہ نسبت اوروں کے کچھ اچھی نہ تھی مگر فن موسیقی کی مہارت اور شعر و سخن کی قابلیت کی وجہ سے میں سب سے بڑھی چڑھی رہتی۔ اپنی ہم عمروں میں مجھے ایک خاص قسم کا امتیاز حاصل تھا مگر اس سے کچھ نقصان بھی ہوا وہ یہ کہ جس قدر میری عزت زیادہ ہوتی گئی اتنا ہی میرا خودداری کا خیال دل میں پیدا ہوتا گیا جہاں

اور رنڈیاں بے باکیوں سے ... اپنا مطلب نکال لیتی تھیں۔ میں منہ دیکھتی رہ جاتی تھی مثلاً ان کا یہ عام قاعدہ تھا کہ ہر کس و ناکس سے کسی نہ کسی قسم کی فرمائش ضرور کر دینی چاہیئے۔ مجھے اس سے شرم آتی تھی۔ یہ خیال آتا تھا کہ ایسا نہ ہو انکار کر دے تو خفت ہوگی اور نہ ہر شخص سے میں بہت جلد بے تکلف ہو جاتی تھی میری اور ساتھ والیوں کے پاس جب کوئی آ کے بیٹھتا تو ان کو سب سے زیادہ فکر اس کی ہوتی کہ کہاں تک دے سکتا ہے اور ہم کہاں تک اس سے لے سکتے ہیں۔ میرا بہت سا وقت اس شخص کی ذاتی لیاقت، حسن اخلاق کے اندازہ کرنے میں صرف ہو جاتا تھا۔ مانگنے کی عادت کو میں معیوب سمجھنے لگی تھی اسکے علاوہ اور باتیں بھی مجھ میں رنڈی پیشہ کی نہ تھیں اپنی میری ساتھ والیوں میں سے کوئی مجھے ناک چوٹی میں گرفتار کوئی خفقانی کوئی دیوانی سمجھتی تھی مگر میں نے اپنی کی پروا کی نہ تھی۔

پھر وہ زمانہ آیا کہ میں رنڈی کے ذلیل پیشے کو معیوب سمجھنے لگی اور اس سے دستبردار ہو گئی۔ ہر کس و ناکس سے ملنا چھوڑ دیا۔ صرف ناچ مجرے پر اوقات بسر ہونے لگی۔ کسی رئیس نے نوکر رکھا تو نوکری کر لی رفتہ رفتہ یہ بھی ترک کر دیا۔

جب میں ان افعال سے تائب ہو گئی جن کو میں نے اپنے نزدیک برا سمجھ لیا تھا تو اکثر میرے جی میں آیا کہ کسی مرد آدمی کے گھر بیٹھ جاؤں لیکن پھر یہ خیال آیا کہ لوگ کہیں گے آخر رنڈی تھی نا کفن کا بونگا کیا۔

مرزا صاحب شاید اس محاورے کو آپ نہ سمجھیں۔ مطلب اسکا یہ ہے کہ کوئی رنڈی سن سے اتر کر کسی کے گھر بیٹھ جاتی ہے تو تجربہ کار تماشبین اس کی نسبت کہا کرتے ہیں کہ اس رنڈی نے کفن کا بونگا کیا۔ یا مرتے مرتے کفن لے مری۔ یعنی اپنے دام بنا لئے اور از راہ فریب تماشبین پر اپنی تجہیز و تکفین کا بار ڈالا۔ اس مثل سے رنڈیوں کی بیحد خود غرضی، لالچ اور فریب کا ثبوت ملتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہم لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ میں سچ مچ تائب ہو گئی اور اب انتہا کی نیک ہوں مگر اس کو سوائے خدا کے اور کون جانتا ہے۔ کسی شخص کو میری نیکی کا یقین نہیں ہو سکتا، بھلا اگر اس حالت میں کسی سے محبت کروں اور اس محبت کی بنا اسی خلوص اور نیک نیتی پر ہو اس پر بھی خاص وہ شخص اور اس کے سوا اور جو لوگ دیکھیں یا سنیں گے کبھی یقین نہ لائیں گے پھر میرا محبت کرنا بھی بے سود ہوگا۔ لوگ مشہور کرتے ہیں کہ میرے پاس بڑی دولت ہے۔ اس لئے اکثر لوگ اس سن میں بھی میری خواہش کرتے ہیں اور طرح طرح کے فریب مجھ کو دینا چاہتے ہیں۔ کوئی صاحب میرے حسن و جمال کی تعریف کرتے ہیں، اگرچہ ان کا تعلق میں ایسی رنڈیوں سے ہو چکا ہو جو بدرجہا مجھ سے بہتر ہیں۔ کوئی صاحب میرے کمال موسیقی پر غش ہیں، حالانکہ ان کے کان تال سم سے آشنا نہیں۔ کوئی میری شاعری کے مداح ہیں جنھوں نے عمر بھر ایک مصرع موزوں کہنا تو کیا پڑھا بھی نہ ہوگا

ایک صاحب میری قابلیت کے قائل ہیں۔ خود بھی پڑھے لکھے ہیں مگر مجھ کو معاذ اللہ بالفضل اپنا سمجھتے ہیں معمولی مسئلے روزہ نماز کے بھی مجھی سے پوچھا کرتے ہیں گویا کہ آپ میرے مرید یا معتقد ہیں۔ ایک میرے عاشق زار میری دولت و کمال سے کوئی واسطہ نہیں صرف میری تندرستی کے خواہاں ہیں۔ ہر بات پہ اللہ آمین۔ مجھے چھینک آئی اور انکے درد سر ہونے لگا۔ مجھے درد سر ہوا اور اُن کے دشمنوں کا دم نکلنے لگا۔ ایک بزرگ ناصح مشفق بنے ہیں۔ دنیا کے نشیب و فراز سمجھایا کرتے ہیں۔ مجھ کو بہت ہی بھولا سمجھتے ہیں۔ اس طرح کی باتیں کرتے جیسے کوئی دس گیارہ برس کی لڑکی سے باتیں کرتا ہو۔

میں ایک گھاگ عورت ہوں۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پئے ہوئے۔ جو جس طرح بناتا ہے بن جاتی ہوں اور درحقیقت انکو بناتی ہوں۔ ان میں کے ساتھ کبھی ملنے والے دو ایک صاحب ہیں بے غرض ملتے ہیں۔ ان کا مقصود صرف ایک مذاق خاص ہے مثلاً شعر و سخن یا گانا بجانا یا صرف لطف گفتگو۔ نہ ان کی کوئی غرض مجھ سے ہے نہ مجھے کوئی غرض ان سے ہے۔ ایسے لوگوں کو میں دل سے چاہتی ہوں اور بے غرضی۔ رفتہ رفتہ ایک غرض ہو گئی ہے کہ نہ مجھے بغیر ان کے چین آتا ہے اور نہ انہیں بغیر میرے مگر ان لوگوں میں سے کوئی میرے گھر میں بٹھانے کا امیدوار نہیں ہے کاش کہ ایسا ہوتا! مگر یہ تمنا ایسی ہے جیسے کوئی کہے کاش کہ جوانی پھر آتی! اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت کی زندگی جوانی تک ہے۔ اگر جوانی کے ساتھ ہی زندگی بھی ختم ہو جایا کرتی تو کیا خوب ہوتا مگر ایسا نہیں ہوتا۔ یوں تو بڑھاپا ہر ایک کے لئے برا ہے خصوصاً عورت کے لئے خصوصاً رنڈی کے لئے بڑھاپا دوزخ کا نمونہ ہے۔ بڑھیا فقیرنیاں جو لکھنؤ کے گلی کوچوں میں پڑی پھرتی ہیں اگر غور کیجئے گا تو ان میں اکثر رنڈیاں بھی کون سی جو کبھی زمین پر پیر نہ رکھتی تھیں۔ قیامت برپا کر رکھی تھی۔ ہزاروں بھرے پُرے گھر تباہ کر دیئے سیکڑوں جوانوں کو بیگناہ قتل کیا۔ جہاں جاتی تھیں لوگ آنکھیں بچھاتے تھے۔ اب کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا۔ پہلے جہاں بیٹھ جاتی تھیں لوگ باغ باغ ہو جاتے تھے۔ اب کوئی کھڑے ہونے کا بھی روادار نہیں۔ پہلے بن مانگے موتی ملتے تھے اب مانگے بھیک نہیں ملتی۔

ان میں سے اکثر اپنے ہاتھوں اپنی تباہی کا باعث ہوئیں۔ ایک بڑی بی میرے مکان پر کبھی کبھی آیا کرتی تھیں، کسی زمانے میں بڑی مشہور رنڈیوں میں تھیں جوانی میں ہزاروں روپے کمائے۔ ذرا سے زیادہ خرچ تھا۔ جب سن سے اتریں وہی کمائی بیٹھ کے کھانا شروع کی۔ بڑھاپے میں ایک نوجوان کے گلے پڑ گئیں۔ ایک تو وہ خوبصورت کمسن، بھلا وہ ان پر کیوں رجھتا۔ پہلے تو بیوی ذرا اکڑیں مگر جب میاں نے اصل مطلب سمجھا دیا خاموش ہو رہیں۔ اُن کی خاطریں ہونے لگیں۔ جب تک مال رہا خوب مارا۔ بیوی دونوں نے پھسلا کے کھایا۔ آخر کنگال ہو گئیں

... کون پوچھتا ہے نکال باہر کیا۔ گلیوں کی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہیں۔

بعض بیوقوف رنڈیوں نے کسی کی لڑکی کو لے کے پالا۔ اس سے دل لگ گیا (اس حماقت میں بھی گرفتار ہو چکی ہوں) مگر جب وہ جوان ہونے کے قریب آئی کسی کے ساتھ نکل گئی یا اگر رہی تو کل مال رفتہ رفتہ اپنے قبضہ میں کیا۔ ان کو گھر کا انتظام [illegible] کر کے [illegible]۔

آبادی نے بھی جل دیا ہوتا مگر وہ تو کہو اس کے کرتوت چھپے نہ رہ سکے نہیں تو کچھ ہو ہی رہے جاتی۔ مرد کیا اور عورت کیا، رنڈیوں کی قوم میں [illegible] ایسا بہت کم ہوا ہے کہ ایک دوسرے میں محبت نہیں ہوتی [illegible] ہے کیونکہ سب جانتے ہیں کہ رنڈی کسی کی نہیں ہوتی [illegible] نوجوان اپنے دل میں یہ سمجھتے ہیں کہ کما کے ہم ہی [illegible] کیوں دیں۔

اگلے قدردان مرد زوال حسن کے بعد کنارہ کرتے تھے، یہ اگلی عادتیں ہوتی ہیں کہ لوگ خوشامد کریں۔ بھلا اب کوئی خوشامد کیوں کرے۔ [illegible] مردان سے کنارہ کش [illegible] سے خالی رہتی ہیں۔

پہلے بھی میں کبھی اور رنڈیوں کی زبانی مردوں کی بےوفائی کا دکھڑا اُن کے وقت روایت کرتی تھی اور بے سمجھے ان کی ہاں میں ہاں ملاتی تھی مگر باوجود اس کے کہ گوہر مرزا نے میرے ساتھ بہت سلوک کیا وہ سب آپ کو معلوم ہے اور نواب صاحب جنھوں نے بھیر نکاح کا ارادہ کیا تھا اُن کو بھی آپ سن چکے۔ پھر بھی مردوں کو بے وفا نہیں کہہ سکتی [illegible] ان سے کسی طرح کم نہیں۔ محبت کے باب میں مرد (انصاف کیجئے گا) اکثر [illegible] ہی پالاک ہوتی ہیں۔ اکثر مرد سچے دل سے اظہار عشق کرتے ہیں اور اکثر عورتیں جھوٹی بنت جتاتی ہیں۔ اس لیے کہ مرد جس حالت میں اظہار تعشق کرتے ہیں وہ حالت انسانی اختیاری ہوتی ہے اور عورتیں بہت جلد متاثر نہیں ہوتیں کیونکہ مرد بہت ہی جلد عورتوں کے ظاہری پر فریفتہ ہو کر ان پر شیدا ہو جاتا ہے اور عورتیں اس باب میں زیادہ احتیاط کرتی ہیں۔ اسی لیے مردوں کی محبت کسی قدر سریع الزوال اور عورتوں کی محبت [illegible] ہیں گر جانین کے حسن معاشرت سے ان امور میں ایک خاص قسم کا [illegible] ہے بشرطیکہ دونوں یا کم از کم ایک کو عقل ہو۔

واقعی مرد اس باب میں سریع الاعتقاد ہوتے ہیں اور [illegible] عورت کا جادو بہت جلد چل جاتا ہے مگر عورت پر جب کا عمل [illegible]

میرے نزدیک یہ نقص فطرت کی طرف سے ہے اس لیئے کہ عورتیں ضعیف القویٰ ہیں انکو بعض وصف ایسے دیے گئے ہیں جس سے یہ کمی پوری ہو جائے۔ منجملہ ان اوصاف کے ایک وصف یہ بھی ہے بلکہ میں کہہ سکتی ہوں شاید یہی ایک وصف ہے اس کے مثال جانوروں میں بھی مل سکتی ہے۔ اکثر ضعیف جانوروں میں بھی یہ حیلہ گری کا مادہ ہے۔

اکثر مرد یہ کہیں گے کہ عورتیں حسین ہوتی ہیں۔ میں اس کی قائل نہیں۔ درحقیقت نہ مرد ہی بجائے خود حسین ہے نہ عورت۔ بلکہ ہر ایک کو ایسا حسن عنایت ہوا ہے جو دوسرے کو اچھا معلوم ہو۔ یوں تو مرد عورت جس کا ناک نقشہ اچھا ہوتا ہے سب اسے پسند کرتے ہیں مگر اصل قدرداں مرد کے حسن کی عورت اور عورت کے حسن کا مرد ہے۔ ایک خوبصورت عورت دوسری خوبصورت عورت کے سامنے اس خوشرنگ پھول سے زیادہ نہیں ہے جس میں خوشبو نہ ہو اور ایک بدصورت مرد بھی خوبصورت عورت کی رائے میں خوبصورت پھول کی طرح دل پسند ہے اگرچہ اس کی شکل اور رنگت میں کوئی ندرت نہ ہو۔ محبت کے باب میں غلطی صرف ایک ہی سے نہیں ہوتی بلکہ دونوں اس باریکی کو نہیں سمجھتے۔ ان دونوں محبتوں کی اصلیت میں فرق ہے۔ جس نگاہ سے مرد عورتوں کو دیکھتے ہیں اس نگاہ سے عورت مرد کو دیکھتی ہی نہیں۔ عورتوں کی محبت کرنے کا اندازہ اُن مردوں میں ایک حد تک پایا جاتا ہے۔ جو کسی مالدار عورت کے دامن دولت سے وابستہ ہے یا جس کا سن بہت کم ہے مگر کوئی سن رسیدہ عورت ان کو کیوں چاہنے لگی۔

اس میں شک نہیں کہ عورتیں جوان مرد سے بہ نسبت بڈھوں کے زیادہ محبت رکھتی ہیں مگر اس کی وجہ بھی محض حسن و جمال نہیں ہے بلکہ وجہ یہ ہے کہ عورت ضعیف القویٰ ہے اس لئے وہ ہر حالت میں اپنے حمایتی کو بہت دوست رکھتی ہے تاکہ وقت ضرورت اس کو خطرہ سے بچا سکے۔ پس جوان سے بہ نسبت بڈھے کے زیادہ توقع ہے اور حسن و جمال اس خوبی کے ساتھ مل کر اس کے وصف کو رونق دیتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مرد کی محبت میں صرف لذت حاصل کرنا مقصود ہے اور عورت کی محبت میں الم سے محفوظ رہنا اور لذت دونوں غرضیں شامل ہیں۔

چونکہ یہ مشہور ہے کہ محبت بے غرض ہونا چاہیئے اور عورت کی محبت میں اس کا زیادہ لگاؤ ہے لہٰذا وہ اس کے چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ شاید یہ کوئی کہے کہ جو امور میں نے اس موقع پر بیان کیئے ہیں اس میں اکثر باتوں کا امتیاز نہ مردوں کو ہوتا ہے نہ عورتوں کو تو میں

اسے تسلیم کر لوں گی اور یہ کہوں گی کہ یہ باتیں اصل فطرت سے مرد عورت کے خمیر میں داخل ہیں۔ کچھ ضرورت نہیں ہے کہ انھیں اس کا شعور بھی ہو۔

میں نے عمر بھر کے تجربہ کے بعد یہ امور دریافت کیے ہیں اور میرے ساتھ جو شخص اس پر غور کرے گا وہ اسے سمجھ سکتا ہے۔

میں دیکھتی ہوں کہ اکثر عورتیں اور ناخواندہ مرد بھی ایسی باتوں پر غور نہیں کرتے اس لیے ان کو اپنے زمانۂ زندگی میں بہت سی بک بک جھک جھک کرنا پڑتی ہے۔

میرے خیال میں مرد و عورت دونوں اپنے اپنے رتبے اور اغراض کو سمجھ لیں تو ان میں ہرگز ملال نہ ہو۔ بہت سی آفتیں ٹل جائیں اور بہت سی دور ہو جائیں۔

مگر ایک مشکل ہے کہ جب کسی کو کسی بات کی فہمائش کی جائے تو اکثر یہی جواب ملتا ہے۔

اجی جی! جو تقدیر میں ہوگا ہو کے رہے گا۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ ہم جو چاہیں کریں ہمیں نہ روکو۔ ہمارے کیے کچھ نہیں ہوتا یعنی ہماری بدکاریوں کا کوئی نتیجہ نہیں ہے جو کچھ ہوگا تقدیر سے ہوگا۔ جو نتیجہ نکلے گا وہ معاذ اللہ خدا کی طرف سے ہوگا۔ یہ لغو گفتگو اگلے زمانے میں کسی قدر بامعنی بھی تھی۔ کیونکہ اس زمانے میں اتفاق سے گھڑی بھر میں کچھ ہو جایا کرتا تھا۔ اس پر مجھے شاہی زمانے کی ایک نقل یاد آئی ہے۔

زمانۂ شاہی میں انقلاب کا ثبوت اکثر ملتا رہتا تھا۔ لوگوں کی حالتوں میں دفعتاً تغیر ہو جایا کرتا تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے ایک سپاہی نہایت ہی شکستہ حال موتی محل کے پھاٹک کے پاس چبوترے پر پڑا سو رہا تھا۔ قضائے کار نماز صبح کے بعد ٹہلتے ہوئے بادشاہ اُدھر آ نکلے اتفاقاً اس وقت کوئی ساتھ نہ تھا معلوم نہیں کیا جی میں آیا آپ نے اُسے جگا دیا۔ وہ سپاہی یونہی نیند سے آنکھیں ملتا ہوا اُٹھا۔ جہاں پناہ پر نگاہ پڑی پہلے تو گھبرا گیا پھر ایک ہی مرتبہ سنبھل کے اپنی حالت کو دیکھا فوراً تلوار نذر کی۔ بادشاہ نے نذر قبول کر لی۔ زنگ آلودہ تلوار تھی میان سے بدقت نکلی۔ پھر دیکھ بھال کر اس تلوار کی تعریف کی اور میان میں کر کے اپنی کمر میں لگالی۔ خود جو ولایتی باندھے ہوئے تھے جس کا طلائی قبضہ تھا مع کمر مرصع اس کو حوالے کی اسی موقع پر حضور عالم (خطاب علی نقی خاں وزیر اودھ) آ گئے۔ جہاں پناہ نے اس جوان اور اس کی تلوار کی تعریف کی۔

بادشاہ: "دیکھا بھی کیا سجیلا جوان ہے اور تلوار بھی اُس کے پاس کیا ہی عمدہ تھی (کر کے تلوار نکال کر) یہ دیکھو۔"

وزیر: "قبلۂ عالم۔ سبحان اللہ اگر حضور سا جوہر شناس اور قدردان بھی تو ہو جب ایسے لوگ اور ایسی چیزیں دستیاب ہوتی ہیں۔

بادشاہ: "مگر دیکھنا بھئی! میری تلوار بھی کچھ ایسی بدزیب نہیں ہے۔"

وزیر: "ظلِ سبحانی کی تلوار اور بدزیب۔"

بادشاہ: "مگر لباس اس کے مناسب نہیں ہے۔"

اس اثناء میں مصاحب، ملازم، شاہی چوبدار خاص بردار آ گئے۔ اچھا خاصہ مجمع ہو گیا۔

وزیر: "درست ارشاد ہوا۔"

بادشاہ: "اچھا ہمارے کپڑے تو اسے پہنا کر دیکھے جائیں۔"

اس اشارے کے پاتے ہی لوگ دوڑے، لباس کی کشتیاں ہاتھوں ہاتھ آ گئیں بادشاہ نے ملبوس خاص جو اس وقت پہنے ہوئے تھے مع مالائے مروارید اور جوڑے نورتن مرصع کار استے عنایت کی آپ اور کپڑے زیب تن کئے۔

جب وہ کپڑے پہن چکا۔

بادشاہ: "ہاں اب دیکھو۔"

وزیر: "واقعی صورت ہی اور ہو گئی۔"

مصاحبین اور حضار بھی تعریفیں کرنے لگے۔

بادشاہ تھوڑی دیر یہاں ٹھہرے۔ اب سواری آ گئی تھی، سوار ہو کے ہوا کھانے چلے گئے تھے۔

سپاہی خوشی خوشی گھر آیا۔ جوہری مہاجن۔ دلال گویا ساتھ ہی لگے ہوئے تھے۔ اسباب آنکا گیا سب پچاس ساٹھ ہزار روپئے کی مالیت تھی۔

سپاہی کا حال سنئے کہیں بخیبوں کی پلٹن میں تین روپیہ کا اسم تھا رات کو گھر میں کھانے پر بیوی سے تکرار ہوئی۔ آپ خفا ہو کے گھر سے نکل گئے۔ رات بھر خدا جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرے۔ صبح ہوتے موتی محل کے پاس تھک کے بیٹھ گئے نیند آ گئی صبح کو طالع بیدار نے جگایا تو یہ کرشمہ نظر آیا۔ دم بھر میں محتاج سے غنی کر دیا۔

اس طرح کے واقعے شاہی میں اکثر ہوا کرتے تھے اور ایسے ہی زمانے میں ان کا ہونا ممکن

ہے جبکہ عنان حکومت ایک شخص کے ہاتھ میں ہو اور وہ کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہ ہو۔ ملک کو اپنی ملک اور خزانے کو اپنا مال سمجھے۔

انگریزی عملداری میں ان فضول خرچیوں کی گنجائش نہیں ہے یہ ایک طرح کی بے انصافی سمجھی جاتی ہے کہ کسی شخص کو بلا وجہ بلا استحقاق ایک رقم کثیر دیدی جائے ایسی سلطنت جس میں بادشاہ سے لیکر ایک فقیر تک قانون کے پابند ہیں۔ اگر استحقاق کا لحاظ نہ رکھا جائے تو ہرگز کام نہ چلے۔ اس زمانے میں تقدیر کا زور نہیں چلتا جو کچھ ہوتا ہے تدبیر سے ہوتا ہے۔

نواب چھٹن صاحب کا حال سنیے (اثنائے سوانحعمری میں ان کا بقیہ ذکر فروگذاشت ہو گیا تھا) درحقیقت آپ دریا ڈوبنے گئے تھے اس ارادے سے غوطہ لگایا کہ اب نہ ابھریں گے مگر جان بہت پیاری چیز ہوتی ہے۔ جب دیر تک پانی کے نیچے رہے دم گھبرانے لگا۔ جی میں آیا ابکی ابھر کر پھر سانس لے لیں۔ ابھرے۔ پانی کی سطح پر آکر بلا قصد ہاتھ پاؤں چلنے لگے۔ پھر مرنے کو جی چاہا۔ پھر غوطہ مارا پھر وہی حال ہوا اسی طرح کئی غوطے لگائے مگر ڈوبتے نہ بنا۔ آخر اسی کوشش میں بہتے بہاتے چھتر منزل تک پہنچ گئے۔ اتفاقاً اس وقت مرزا ولی عہد بہادر مرحوم مع اپنے چند مصاحبوں کے بجرے پر سوار ہو کر سیر کو نکلے تھے۔ ان کی نظر جو پڑی سمجھے کوئی شخص ڈوب رہا ہے۔ ملاحوں کو حکم دیا جلدی نکالو۔ انھوں نے چھڑانے کی بہت کوشش کی۔ وہ لوگ سمجھے تھے گھبرا گئے آخر زبردستی کنارے پر لائے۔ مرزا ولی عہد نے اپنے سامنے طلب کیا۔ احوال پرسی کے بعد معلوم ہوا کہ رئیس زادے ہیں کپڑے مرحمت ہوئے۔ ہمراہ کوٹھی میں لئے چلے گئے۔

چھٹن صاحب ایک تو خوش رو جوان دوسرے ادب قاعدے سے واقف علم مجلس سے آگاہ کسی قدر خواندہ بھی تھے۔ طبیعت میں مذاق بھی تھا۔ غرضکہ ہر طرح شاہزادے کی صحبت کے لائق تھے، فوراً مصاحبوں میں اسم ہو گیا ان کا بیش قرار مشاہرہ ہوا۔ اخراجات ضروری کے لئے کچھ پیشگی میں مل گیا۔ نوکر چاکر سواری سب سرکار سے مرحمت ہوا بیٹھے بٹھائے کیا تھا پہلے سے زیادہ ٹھاٹھ ہو گئے۔

اب جو چوک میں نکلے تو جلوس ہی اور تھا۔ ہاتھی پر سوار ہیں۔ چپراسی خواص برابر ہیں آگے آگے دو سوار چلے جاتے ہیں۔

بسم اللہ نے اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا پہلے تو یقین نہ آیا۔ کہیں میاں مخدوم بخش بھی پیچھے پیچھے چلے آتے تھے ان کو اشارے سے بلا لیا۔ مفصل حال معلوم ہوا۔

اس کے بعد چچا نے بھی میل کر لیا۔ شادی بھی ہو گئی۔ شادی میں ہم لوگ بھی بلائے گئے تھے خانم کو بہت عمدہ دو شالہ، رومال دیا مگر اس دن سے نہ کبھی ہمارے مکان پر آئے نہ بسم اللہ سے رسم رکھا۔ خانم اور چال چلی تھیں بن نہ پڑی الٹی ہو گئی۔

خلاصہ یہ کہ شاہی میں اس قسم کے کرشمے نظر آجاتے تھے، بھلا انگریزی حکومت میں یہ کہاں، وہ دن گئے خلیل خاں فاختہ اڑا گئے۔ سنتے چلے آتے ہیں کہ دولت اندھی ہے مگر اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی حکمت سے اس کی آنکھیں کھول دی گئی ہیں۔ اب اسے لائق اور نالائق کا خیال ہو گیا۔

شاہی عملداری میں جاہل ناخواندہ جو الف کے نام لٹھا نہیں جانتے تھے بڑے بڑے عہدوں پر نوکر تھے۔ میں کہتی ہوں ان سے کام کیونکر چلتا ہوگا اور تو اور موئے خواجہ سراؤں کے پاس پلٹنیں اور رسالے تھے بھلا انصاف کیجئے ہنسنے کی بات ہے یا نہیں۔

غرضکہ تقدیر کا دور دورہ گیا اور تدبیر کا عہد حکومت آیا۔ اب جوہر ذاتی پوچھا جاتا ہے اور جوہر ذاتی کی دلالہ شہرت ہے۔ آپ لکھے پڑھے لائق فائق ہوں۔ مگر جب آپ کو کوئی جانتا ہی نہیں۔

تقدیر اور تدبیر کے مسئلے میں میں بہت دن چکر میں رہی۔ آخر معلوم ہوا کہ جن معنوں میں لوگ اس لفظ کو استعمال کر رہے ہیں وہ بالکل دھوکا ہے اگر اس سے یہ مراد ہے کہ خدا کو ہماری سب باتوں کا علم ازل سے ہے تو اس میں کچھ شک نہیں وہ کافر ہے جس کو اس کا اعتقاد نہ ہو مگر لوگ تو معاذ اللہ اپنے تمام افعال ناشائستہ کے برے نتائج کو تقدیر کی طرف نسبت دیا کرتے ہیں۔ اس سے خدا کی قدرت پر الزام آتا ہے۔ یہ بالکل کفر ہے۔

افسوس جن باتوں کو میں اب سمجھی اگر پہلے ہی سے سمجھ گئی ہوتی تو بہت اچھا ہوتا۔ مگر نہ کوئی سمجھانے والا تھا اور نہ خود اتنا تجربہ تھا کہ آپ ہی سمجھ لیتی۔

مولوی صاحب نے جو دو حرف پڑھا دیئے تھے وہ میرے بہت کام آئے (خدا ان کے درجات عالی کرے) اس زمانہ میں مجھے اس کی قدر نہ تھی۔ تن آسانی اور آرام طلبی کے سوا کوئی کام نہ تھا علاوہ اس کے قدردان اس قدر تھے کہ کسی وقت فرصت ہی نہیں ملتی تھی جب وہ دن آئے کہ قدردان ایک ایک کر کے کھسکنے لگے تو ذرا مجھے مہلت ملی تو اس زمانہ میں کتب بینی کا شوق بڑھا کیونکہ سوائے اس کے اب کوئی شغل نہ رہا تھا۔

میں سچ کہتی ہوں کہ اگر یہ شوق نہ ہوتا تو اب تک میں زندہ نہ رہتی۔ جوانی کے ماتم اور اگلے

قدردانوں کے غم میں کب کا خاتمہ ہو گیا ہوتا۔ کچھ دنوں تو میں قصے کہانی کی کتابوں سے دل بہلایا کی۔ ایک دن پرانی کتابیں دھوپ دینے کے لئے نکالیں۔ ان میں وہ گلستاں بھی نکلی جو مولوی صاحب سے پڑھی تھی۔ ادھر اُدھر سے ورق اُلٹ پلٹ کے پڑھنے لگی پہلے تو مجھے نفرت سی ہو گئی تھی۔ ایک تو اس لئے کہ تعلیم کا ابتدائی زمانہ تھا۔ عبارت مشکل معلوم ہوتی تھی۔ دوسرے تجربہ نہ تھا اس لئے کچھ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اب جو پڑھا تو وہ دقتیں دور ہو چکی تھیں خوب ہی دل لگا کے میں نے شروع سے آخر تک کئی مرتبہ پڑھا۔ فقرہ فقرہ دل میں اترا جاتا تھا اس کے بعد ایک صاحب سے اخلاق ناصری کی تعریف سن کے اس کے پڑھنے کا شوق ہوا۔ انھیں سے ایک نسخہ منگا کے پڑھنا شروع کیا۔ اس کتاب کے مطالب بھی مشکل ہیں اور عربی لفظیں کثرت سے ہیں اس لئے اس کے سمجھنے میں بہت دقت ہوئی مگر تھوڑا تھوڑا پڑھ کے بہت دنوں میں کتاب کو ختم کیا پھر دانش نامہ غیاث منصور نولکشور کے مطبع میں چھپا ہے پڑھا پھر ایک مرتبہ صغریٰ و کبریٰ کی بجائے خود مطالعہ کیا اور جو نہ سمجھ میں آیا اُسے پوچھ لیا۔ ان کتابوں کے پڑھنے سے مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے دنیا کے بھید مجھ پر کھلتے جاتے ہیں۔ ہر بات کی سمجھ آ گئی اس کے بعد میں نے بہت سی کتابیں اس قسم کی اردو فارسی کی بجائے خود پڑھیں اس سے طبیعت کو جلا ہو گئی۔ قصائد انوری و خاقانی جستہ جستہ پڑھے مگر جھوٹی خوشامد کی باتوں میں اب میرا دل نہ لگتا تھا اس لئے ان کو بند کر کے الماری میں رکھ دیا۔ فی الحال کئی اخبار بھی میرے پاس آتے ہیں انھیں دیکھا کرتی ہوں ان سے دنیا بھر کا حال معلوم ہوتا رہتا ہے۔ کفایت شعاری کی وجہ سے میرے پاس اب بھی اس قدر اندوختہ ہے کہ اپنی زندگی بسر کرے جاؤں گی۔ وہاں کا اللہ مالک ہے۔ میں بہت دن ہوئے سچے دل سے توبہ کر چکی ہوں اور حتی الوسع روزہ نماز کی بھی پابند ہوں۔ رہتی رنڈی کی طرح ہوں۔ خدا جانتا ہے ہارے چاہے بلا لے مجھ سے پردہ میں نشست کے تو نہ بیٹھا جائے گا مگر پردہ والیوں کے لئے دل سے دعا گو ہوں۔ خدا اُن کا راج سہاگ قائم رکھے اور رہتی دنیا تک ان کا پردہ رہے۔

اس موقع پر میں اپنی ہم پیشہ عورتوں کی طرف مخاطب ہو کے ایک نصیحت کرتی ہوں چاہیئے کہ وہ اپنے دل پر نقش کر لیں۔

اے بے وقوف رنڈی کبھی اس بھلاوے میں نہ آنا کہ کوئی تجھ کو سچے دل سے چاہے گا تیرا آشنا جو تجھ پر جان دیتا ہے چار دن کے بعد چلتا پھرتا نظر آئے گا نہ تجھ سے ہرگز نباہ نہیں کر سکتا اور نہ تو اس لائق ہے۔ سچی چاہت کا مزہ اسی نیک بخت کا حق ہے جو ایک کا منہ دیکھ کے دوسرے کا منہ کبھی نہیں دیکھتی۔ تجھ جیسی بازاری شفتل کو یہ نعمت خدا نہیں دے سکتا۔ خیر یہی تو

[illegible] اتنی زندگی تو گزر گئی۔ اب میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں۔ جو دن دنیا کی ہوا کھانا ہے کھا رہی ہوں۔ میں نے اپنے دل کو ہر طور سمجھا لیا ہے اور میری کل آرزوئیں پوری ہو چکیں اب کسی بات کی تمنا نہیں رہی۔ مگر یہ آرزو کمبخت وہ بلا ہے کہ مرنے دم تک دل سے نہیں نکلتی۔ مجھے امید ہے کہ میری سوانح عمری سے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوگا۔ اب میں اپنی تقریر کو اس شعر پر ختم کرتی ہوں اور سب سے امیدوار دعا ہوں۔

مرنے کے دن قریب ہیں شاید کہ اے حیات
تجھ سے طبیعت اپنی بہت سیر ہو گئی

تمام شد

نٹ ہیمسن — نوبل پرائز یافتہ مصنف

کا

شاہکار ناول

بھوک

جو ایک بھوکی روح کی جانگداز چیخ ہے۔

جو انسان کے کردار، اخلاق اور زندگی پر بھوک کے مذموم اثر کی داستان ہے

جو ایک بھوکے کو انقلاب کا جنگجو سپاہی بناتا ہے۔

جو بھوک کی بیخ کنی پر انسان کو کمر بستہ کرتا ہے

مترجمہ:۔ مخمور جالندھری

قیمت: تین روپیہ آٹھ آنے

مکتبہ شاہراہ • دہلی